تذکارِ آزاد

نشریات

تذکارِ آزاد

جامعہ بیت العتیق (رجسٹرڈ)
کتاب نمبر ______

عبدالرشید عراقی

نشریات
۴۰ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۰۳۲۱۔۴۵۸۹۴۱۹

۹۵۴۰۳۵ عراقی، عبدالرشید
ع ر ا ـ ت تذکارِ آزاد
لاہور: نشریات
۲۰۰۸ء ص ۴۲۴
سوانح، تذکرہ
ISBN 978-969-8983-37-6

نام کتاب : تذکارِ آزاد

تالیف : عبدالرشید عراقی

اہتمام : نشریات، لاہور

مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور
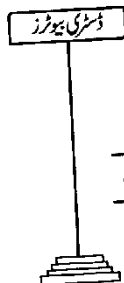
انتساب

آغا شورش کاشمیری

کے نام

آغا شورش کاشمیری نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ محبت وعقیدت کا حق کچھ اس طرح ادا کیا ہے کہ، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اُنھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے سوانح وافکار پر ایک جامع کتاب مرتب کی جو بقول اُن کے ان کی تصانیف میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ مولانا کی شخصیت پر جب کسی گوشے سے کوئی ناواجب بات کہی گئی تو اس کی تردید اور مولانا کے دفاع کے لیے سب سے پہلے آغا شورش مرحوم ہی سامنے آتے تھے اور صحیح صورتِ حال کی وضاحت کرتے تھے۔ آغا صاحب کا شمار مولانا ابوالکلام آزاد کے ممدوحین میں ہوتا ہے۔ اس لیے میں اپنی اس کتاب کا انتساب انہی کے نام کرتا ہوں:

اس ایک دور کی شمشیر بے نیام کے ساتھ
رہی ہے تجھ کو عقیدت ابوالکلام کے ساتھ

عبدالرشید عراقی

ترتیب

باب ۳ مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت

باب ۴ مولانا ابوالکلام آزاد کی مکتوب نگاری

باب ۵ مولانا ابوالکلام آزاد کی قرآنی بصیرت

باب ۱۰ مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح نگاری

باب ۱۱ مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف

باب ۱۲ مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی بصیرت

باب ۱۳ مولانا ابوالکلام آزاد کے ایام اسیری

باب ۱۴ مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے معاصرین

تاثرات

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال ''اور''البلاغ '' نے پیدا کیا۔اور جس اسلوب بلاغت ،کمال انشاء پردازی اور زورتحریر کے ساتھ انھوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی آیتوں کو پیش کیا۔اس نے ان کے لیے ایمان ویقین کے نئے نئے دروازے کھول دیے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی ومطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کردیا۔

سید سلیمان ندوی

....

مولانا ابوالکلام آزاد عقیدۃً اہل حدیث تھے۔غیر مقلد تھے۔تقلید وجمود کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔آپ نے اپنی اکثر تصانیف میں تقلید کی مذمت کی ہے۔اور عالمانہ اور محققانہ انداز میں اس کی تردید کی ہے۔جماعت اہل حدیث سے گہرا تعلق اور پوری راہ ورسم رکھتے تھے۔اہل حدیث کے اکثر اجلاسوں کی صدارت فرمایا کرتے تھے۔آپ طبعاً انگریز کے دشمن تھے۔انگریزی حکومت کو تباہ وبرباد کرکے اپنے ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔اس لیے عمر بھر ساری توجہ ادھر ہی مبذول رہی۔اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی طرح نہ مسائل میں الجھے اور نہ ہی بحث ومباحثہ میں پڑے۔اور کَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا کا نعرہ بلند کرتے رہے،اور ہمہ تن اپنے مشن میں لگے رہے۔

عبدالمجید سوہدروی

....

مولانا ابوالکلام اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبیّ و بدیع الزماں ہوتے۔ اگر وہ محض دینی و مذہبی اصلاح اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہؒ ہوتے۔ اگر محض علوم حکمیہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے تو ابن رشد اور اور ابن طفیل سے کم درجہ کے متکلم وفیلسوف نہ ہوتے۔ اگر وہ فارسی شعروادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عُرفی ونظیری کی صف میں انھیں جگہ ملتی۔ اگر وہ تصوف واصلاح اخلاق کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے۔ اور اگر وہ مسلک اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔

نیاز فتح پوری

....

مولانا آزاد ایک نادر روزگار شخصیت کے مالک تھے اور ایسے گونا گوں اوصاف ومحاسن کسی ایک وجود میں بہت ہی کم جمع ہوتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا جن کا حصر مشکل ہے۔ اور ان میں سے کسی ایک دائرے میں ویسی بلندی حاصل کر لینا بڑے سے بڑے انسان کے لیے دائمی فخر کا سامان ہوسکتا ہے۔ علم وفضل، حقائق دین، فلسفہ وحکمت، شعروادب، تصنیف وتالیف، تقریر وخطابت، اخبار نویسی، وصحیفہ نگاری، سیاست وملک داری، غرض کون سا دائرہ اور کون سا حلقہ ہے، جس میں ان کی یگانگی ابتداء ہی سے سب کے نزدیک ثابت ومسلم نہ تھی۔ اور آج تک اس کی تصدیق وتوثیق نہ ہوتی رہی۔

غلام رسول مہر

....

مولانا ابوالکلام آزاد اعلیٰ درجہ کے ادیب تھے۔ وہ پاک وہند کے ان مصنفوں میں سے ہیں جن کی نگارشات ان دونوں ممالک میں بے حد مقبول ہیں۔

خدائے بزرگ وبرتر نے اپنے خزانۂ غیب سے انھیں خطابت کی جو قوت عطا کی تھی وہ بے مثل تھی۔ ہندوپاک کا کوئی اور خطیب ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ انہیں اردو خطابت میں وہی درجہ حاصل ہے جو انگریزی میں مسز سروجنی نائیڈو، سر آرڈنلی نارٹن، اور مسز بینٹ کو حاصل تھا۔

ضیاء الدین احمد برنی

مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔ اور یہ ان کا موقف تھا۔ وہ ملک کی تقسیم کو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ لیکن جب ملک تقسیم ہوگیا اور پاکستان معرض وجود میں آ گیا تو مولانا نے مخالفت ترک کردی۔ اوران کا یہ موقف ہوگیا کہ اب پاکستان بن گیا ہے اور اس کو مضبوط ہونا چاہیے۔ اس کے مضبوط ہونے سے ہندوستان میں جو مسلمان رہ گئے ہیں ان کا مستقبل روشن ہوجائے گا۔ اگر پاکستان مضبوط نہ ہوا تو ہندوستان میں مقیم مسلمان محفوظ نہیں رہیں گے۔

میں ضلع بلند شہر کے ایک قصبہ میں میڈیکل آفیسر تھا، میں نے ارادہ کیا کہ مجھے پاکستان نہیں جانا چاہیے۔ اور ہندوستان میں رہ کر مسلمانوں کی خدمت کرنی چاہیے۔ میرے اہل وعیال اپنے آبائی گاؤں سوہدرہ ضلع گوجرانوالہ میں قیام پذیر تھے۔ میں جولائی ۱۹۴۷ء کے آخری عشرے میں دہلی میں مولانا سے ملا اور اپنا موقف ظاہر کیا۔ مولانا نے فرمایا: ''میرے بھائی ہوش کی بات کرو۔ بیوی پاکستان میں اور میاں ہندوستان میں۔ پاکستان قائم رہا تو ہندوستان کے مقیم مسلمانوں کا مستقبل روشن ہوگا۔'' چنانچہ خاکسار اگست کے پہلے ہفتہ میں اپنے آبائی گاؤں سوہدرہ (ضلع گوجرانوالہ) آ گیا۔

عنایت اللہ نسیم سوہدروی

....

مولانا ابوالکلام آزاد کو قدرت نے فکر ونظر کی بے شمار دولتوں، علم وفضل کی بے مثال نعمتوں اور بہت سے اخلاقی کمالات سے نوازا تھا۔ وہ سب علوم وفنون، حکمت وفلسفہ، ادب وانشاء، شاعری، غرض کوئی وادی ایسی نہیں جس کی بالکل نئی راہیں مبداء فیاض نے ان کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں۔ اور ہر آن وہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامن کسب فیض مالا مال نہ ہوا ہو۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار ایسی شخصیتوں میں ہوتا ہے جو ہر حیثیت سے عظیم ہوتی ہیں۔ اور اپنی زندگی کے ہر پہلو میں ایک انفرادیت رکھتی ہیں۔

ابوسلمان شاہ جہان پوری

....

مولانا کی حیثیت ہرگز ایک مقامی اور اقلیتی قائد کی نہیں بلکہ ان کا شمار مشرق کے ان مایہ ناز حضرات میں ہوتا ہے جن کے علم وادب اور ثقافت واخلاق پر پوری دنیائے اسلام ناز کرسکتی ہے۔ یہی وہ گراں قدر شخصیت ہیں جن کے شورِ قلم سے متحدہ ہندوستان میں پہلے پہل بیداری پیدا ہوئی۔ جن کے ''الہلال'' اور ''تذکرہ'' سے اسلامی ذہن اُبھرا۔ جن کے ''ترجمان القرآن'' سے لوگوں کے دلوں میں اسلامیات سے حقیقی دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور جن کی قربانیوں اور ایثار سے آزادی کی دولت نے ہندوستان اور پاکستان کو مالا مال کیا۔ مولانا کا ذہن اس وقت بیدار ہوا۔ اور ان کے قلب سلیم نے انگریز کی غلامی سے اس وقت توحش محسوس کیا جب متحدہ ہندوستان کی اکثریت نے انگریز کی تقلید واطاعت شعاری کے ''طوق زریں'' کو زیب گلو کر رکھا تھا۔

مولانا کا تدبر، مولانا کا استقلال، اور اونچا کریکٹر ہر شخص سے خراج تحسین وصول کرے گا۔ اور جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا، ان کے افکار نکھرتے جائیں گے۔ اور ان کے محاسن سے لوگوں کو آگاہی حاصل ہوتی جائے گی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھیں پاکستان سے نظری اختلاف اس وقت تک تھا جب تک کہ پاکستان نے حقیقت محسوسہ کی شکل اختیار نہیں کی۔ جونہی بٹوارے کا اعلان ہوا اور پاکستان معرض ظہور میں آیا۔ مولانا نے اپنا انداز بدل لیا۔

محمد اسحاق بھٹی

نقشِ آغاز

میرا پختہ یقین ہے کہ برصغیر (پاک وہند) میں مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسی شخصیت ہیں جن پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔مولانا ایک نادر روزگار شخصیت تھے۔اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ذات میں ایسے اوصاف ومحاسن جمع کر دیے تھے کہ انھوں نے زندگی کے ہر دائرہ میں بلند مقام حاصل کیا۔مولانا علم وفضل کے اعتبار سے ایک جامع اور ہمہ گیر شخصیت تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، تاریخ واسماء الرجال، لغت وادب، فلسفہ وحکمت، شعروسخن، طب ومنطق، تصنیف وتالیف، خطابت وتقریر، صحافت واخبار نویسی، سیاست اور ملک داری غرض کون سا ایسا ادارہ اور کون سا ایسا حلقہ ہے جس میں ان کی یگانگی اور تبحر علمی ابتداء ہی سے سب کے نزدیک مسلم نہ تھا۔اللہ تعالیٰ نے ان کو حافظہ کی غیر معمولی نعمت سے نوازا تھا۔ جو کتاب ایک دفعہ نظر سے گزر گئی، ان کے سینے میں محفوظ ہوگئی۔اور پھر اس کو زندگی میں دوبارہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔مولانا عربی وفارسی کے بلند پایہ ادیب تھے اور ان دونوں زبانوں کے ہزاروں اشعار نوک زبان تھے۔عرفی، نظیری اور غالب کے کلام کے گویا حافظ تھے۔مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کو علم ونظر میں تاجداری وسلطانی کا مرتبہ مل جاتا ہے وہ عمل اور عزیمت کے میدان میں کم تر کوئی ممتاز درجہ حاصل کرتے ہیں۔کتابوں کے مطالعے اور غور وفکر میں انہماک عموماً قوت عمل پر ناخوش گوار اثر ڈالتا ہے۔مولانا علم وعمل دونوں کے تاجدار تھے۔انھیں دونوں دائروں میں سلطانی کا تاج نصیب ہوا۔اور آج فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ علم میں بڑے تھے یا عمل میں۔انھوں نے مدت العمر قوم کو عزیمت کی دعوت دی۔اور یہ دعوت خوش نما الفاظ اور دل نشیں تحریرات یا پرتاثیر خطابت تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ایسے قلب کی گہرائیوں سے اٹھی ہوئی دعوت تھی جس

کے متحرک خون کا ہر قطرہ عزیمت کی حرارت سے معمور تھا۔انہوں نے جو اونچی سے اونچی بات کہی اس پر اونچے سے اونچے عمل کا نمونہ پیش کیا۔ایسے یگانہ افراد ہر فضا میں تربیت نہیں پاتے۔اور ایسے گراں مایہ گوہر ہر خاک سے نہیں اٹھتے۔"

میں نے مولانا پر اس سے پہلے تین کتابیں لکھی ہیں۔۱۔مولانا ابوالکلام آزاد (شخصیت وخدمات)۲۔مولانا ابوالکلام آزاد (صحافی ومفسر)۳۔مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفی خدمات۔

لیکن یہ تینوں کتابیں مختصر ہیں۔میں عرصہ سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ مولانا پر ایک جامع کتاب احاطۂ تحریر میں لاؤں۔جس میں ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر کچھ تفصیل سے اظہارِ خیال کروں۔میں نے اپنی اس کتاب میں مولانا کے سوانح کے علاوہ ان کی صحافت، خطابت، مکتوب نگاری، قرآنی بصیرت، تصور حدیث، مذہبی فکر، انشاء پردازی، شاعری، سوانح نگاری، تصانیف، سیاسی بصیرت، ایام اسیری اور ان کے معاصرین کا تذکرہ کیا ہے۔

اس کتاب کا آخری باب معاصرین سے متعلق ہے جس میں ان کے معاصرین نے مولانا کے علم وفضل اور ان کے جامع الکمالات ہونے کا اعتراف کیا ہے۔اس کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکے گا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ہمہ پہلو، بڑی جامع اور ہمہ گیر تھی۔

میں محترم پروفیسر حکیم راحت نسیم صاحب کا بھی شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اپنے تعارف میں کتاب کے ہر باب سے متعلق مختصراً گفتگو کی ہے۔ان کے تعارف میں متانت اور علمی گہرائی ہے۔مجھے امید ہے کہ صرف مولانا ابوالکلام آزاد سے عقیدت رکھنے والوں ہی کے نزدیک نہیں بلکہ ان اصحاب کے نزدیک بھی یہ کتاب پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی جو مولانا کی شخصیت اور ان کے علم وفضل اور خدمات جلیلہ کے بارے میں اپنی رائے قائم کرنا چاہتے ہیں۔

عبدالرشید عراقی

سوہدرہ۔ضلع گوجرانوالہ

۱۴راگست ۲۰۰۸ء

تعارف

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ایک عظیم شخصیت تھے۔ جنہوں نے ملک اور بیرون ملک اپنی ذہنی صلاحیتوں کا سکہ منوایا۔ وہ بیک وقت ایک بہت بڑے مفسر قرآن بھی تھے اور محدث بھی، مجتہد بھی تھے اور فقیہ بھی، مؤرخ بھی تھے اور محقق بھی، نقاد بھی تھے اور مبصر بھی، ادیب بھی تھے اور انشاء پرداز بھی، نثر نگار بھی تھے اور شاعر بھی، متکلم بھی تھے اور معلم بھی، سوانح نگار بھی تھے اور سیرت نگار بھی، خطیب بھی تھے اور مقرر بھی، مد... بھی تھے اور صاحب فکر ونظر بھی تھے، صحافی بھی تھے اور مصنف بھی، اور ان سب کے ساتھ ایک بہت بڑے سیاستدان بھی تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد علوم اسلامیہ کے متبحر عالم تھے۔ تمام علوم پر ان کو یکساں قدرت حاصل تھی۔ عربی، فارسی پر ان کو مکمل عبور حاصل تھا۔ اور انگریزی زبان پر بھی ان کو خاصی دسترس تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی حافظہ کی نعمت سے نوازا تھا۔ جو کتاب ایک دفعہ نظر سے گزرگئی ان کے سینہ میں محفوظ ہوگئی۔

مولانا آزاد نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۵ سال کی عمر میں کیا۔ اس وقت آپ نے ''لسان الصدق'' کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ جس کی مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نے بہت تعریف کی تھی اور اسی دور میں مولانا نے مولانا شبلی سے خط وکتابت شروع کردی تھی۔ اور یہ واقعہ ۱۹۰۴ء کا ہے۔ اور ۱۹۰۴ء ہی میں مولانا کی ملاقات مولانا شبلی سے بمبئی میں ہوئی تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی زندگی اگرچہ بعد میں شروع ہوئی۔ تاہم اس کا سلسلہ ۱۹۱۲ء سے شروع ہوتا ہے جب آپ نے کلکتہ سے ہفت روزہ ''الہلال'' جاری کیا۔ الہلال ہندوستان میں اپنی طرز کا واحد ہفت روزہ اخبار تھا جو اپنی ترتیب اور مواد کے لحاظ سے اپنی

مثال آپ تھا۔ ''الہلال'' ایک مستقل تحریک تھا۔ جس نے ایک طرف عالم اسلام کے مسلمانوں کو بیدار کیا اور دوسری طرف برصغیر کے مسلمانوں میں بیداری کی روح پیدا کی۔ الہلال محض ایک اخبار نہیں دراصل ایک صُورِ قیامت تھا۔ جس نے مردہ دلوں میں ایک نئی جان ڈال دی۔ جو دل تاریک تھے ان کو روشن کر دیا۔ جو شعلہ قیامت سرد ہو رہا تھا، اس کو بھڑکا دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' ذریعے کلمہ حق کو بلند کیا۔ اور جرأت، حق گوئی اور راست بازی کی وہ مثال قائم کی جو ہماری صحافت کی تاریخ میں بالکل نئی ہے۔

مولانا نے برصغیر کے مسلمانوں میں بیداری کی روح پیدا کرنے میں قرآن مجید کی معرفت اور تفسیری ترجمہ سے اسلام کی سچی تعلیم کے احیاء کی کوشش کی۔ اور اس کے لیے مولانا نے تخیل اور انداز بیان دونوں میں ترقی اور جدت کا ثبوت دیا۔ اور پامال اور فرسودہ راہوں سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کی۔ مولانا سید سلیمان ندوی یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' نے پیدا کیا۔ اور جس اسلوب بلاغت، کمال انشاء پردازی اور زورِ تحریر کے ساتھ انھوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا اس نے ان کے لیے ایمان ویقین کے نئے نئے دروازے کھول دیے۔ اوران کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی اور مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔''

نتیجہ یہ ہوا کہ الہلال کے ہوش رُبا مقالوں کی پورے ملک میں دھوم مچ گئی۔ اور بڑے بڑے ارباب جبہ ودستار اور کہنہ مشق سیاستدانوں کے مذہبی وسیاسی افکار میں زبردست تبدیلی واقع ہوئی۔ روشن خیال طبقہ کے علاوہ جید علماء کرام بھی ''الہلال'' میں مولانا کے مقالات پڑھ کر متاثر ہوئے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا نے ''الہلال'' کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا:

''ہم سب اصلی کام بھولے ہوئے تھے ''الہلال'' نے یاد دلایا۔''

مولانا محمد علی نے فرمایا کہ:

''میں نے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی۔''

اور مولانا شوکت علی نے کہا کہ:

''ابوالکلام نے ہم کو ایمان کا راستہ بتایا۔''

اکبرالہ آبادی نے الہلال کے مضامین سے متاثر ہو کر فرمایا تھا:

''فروغ حق کو نہ ہوگا زوال دنیا میں
ہمیشہ بدر رہے گا ہلال دنیا میں''

''الہلال'' نے جو عمل بالاسلام والقرآن کی دعوت کا غلغلہ بلند کیا تو اس سے برصغیر کے مسلمانوں میں احساس بیداری پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس کا اعتراف جواہر لعل نہرو نے بھی کیا ہے، وہ اپنی کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں لکھتے ہیں کہ:

''مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار ''الہلال'' میں مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا۔ یہ ایک ایسا انداز تخاطب تھا جس سے ہندوستان کے لوگ آشنا نہ تھے۔ وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجہ سے واقف تھے۔ اور سرسید، محسن الملک، نذیر احمد اور حالی کے انداز بیان کے علاوہ ہوا کا کوئی اور جھونکا ان تک پہنچا ہی نہ تھا۔ ''الہلال'' مسلمانوں کے کسی مکتب خیال سے متفق نہ تھا۔ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نثر نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ مولانا حسرت موہانی نے ان کی نثر کے بارے میں فرمایا تھا:

''جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا''

مولانا بلند پایہ خطیب بھی تھے، ان جیسا خطیب ومقرر پورے برصغیر میں پیدا نہیں ہوا۔ حسرت ان کی خطابت کے متعلق فرماتے ہیں:

سب ہو گئے خاموش ایک حسرت
گویا ہیں ابو الکلام آزاد

علومِ اسلامیہ پر اُن کے تبحر علمی اور مجتہدانہ بصیرت کو دیکھ کر مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا تھا:

جہان اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہوگئی
ہے تجھ کو اس میں جستجو تو پوچھ ابوالکلام سے

سیاسی اعتبار سے مولانا آزاد آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سربرآوردہ رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے ۔اور زندگی کے آخری ایام تک آپ کانگریس سے وابستہ رہے ۔۱۵فروری ۱۹۴۰ء کو کانگریس کی صدارت کا الیکشن ہوا۔آپ کے حریف مسٹر ایم ۔این رائے کو ۱۸۶۴ کے مقابلہ میں ۱۸۳ووٹ ملے ۔اور ۲۰/۲۱ مارچ ۱۹۴۰ء کو رام گڑھ میں مولانا نے کانگریس کی صدارت کا چارج لیا تھا۔آپ کا دورِ صدارت کانگریس کی تاریخ میں انتہائی نازک اور سب سے زیادہ طویل رہا۔اور آپ کے دورِ صدارت اور آپ کی قیادت میں کانگریس نے آزادئ وطن کے لیے فیصلہ کن جنگ لڑی تھی ۔اور مسلم لیگ نے بھی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کی قرارداد منظور کی تھی ۔یہ قرارداد ''قرار داد پاکستان'' کے نام سے معروف ہے۔

مولانا آزاد متحدہ قومیت کے حامی تھے ۔اور مولانا میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ آپ نے جس بات کو اختیار کیا، خواہ وہ سیاسی ہو یا غیر سیاسی ۔اپنے موقف سے نہیں ہٹے ۔اور اپنے موقف کی تائید میں ان کے پاس ٹھوس دلائل ہوتے تھے ۔انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس رام گڑھ منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء میں اپنے خطبہ صدارت میں واشگاف الفاظ میں فرمایا:

''میں مسلمان ہوں ۔اور فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں ۔اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں ۔میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں ۔اسلام کی تعلیم ، اسلام کی تاریخ ، اسلام کے علوم وفنون ، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے ۔اور میرا فرض ہے کہ میں اس کی حفاظت کروں ۔بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں ۔اور میں برداشت

نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ
میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے
۔اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی
ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان
کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، میں اس متحدہ قومیت کا
ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں
اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (FACTOR) ہوں، میں اپنے
اس دعویٰ سے کبھی دستبردار نہیں ہوسکتا۔''

(خطبات آزاد ص ۲۹۷)

مولانا آزاد کے اس خطبہ سے واضح الفاظ میں مترشح ہوتا ہے کہ مولانا پاکستان کے
حامی نہیں تھے۔ اور آپ کسی بھی لحاظ سے ملک کی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔لیکن جب پاکستان
معرض وجود میں آگیا اور ملک کی تقسیم ہوگئی تو مولانا نے پاکستان کی مخالفت ترک کردی۔
اور اس کوشش میں رہے کہ اب پاکستان کو قائم رہنا چاہیے۔ اور اس کو مضبوط بنانا چاہیے۔
پاکستان مضبوط ہوگیا تو اس سے ہندوستان میں رہ جانے والوں کا مستقبل درخشندہ رہے گا۔
ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری لکھتے ہیں کہ:

''قیام پاکستان کے بارے میں ان کی رائے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ وہ اس کے قیام
کے مخالف تھے۔ وہ پاکستان کی اسکیم کو ہندوستان کے نوکروڑ مسلمانوں کے مسئلے
کا صحیح حل نہیں سمجھتے تھے۔لیکن جب ملکی اور کل قومی سطح پر اس پر سب کا اتفاق
ہوگیا اور قرار پاگیا کہ ملک کی تقسیم ہوگی تو پھر انھوں نے اپنی مخالفت ترک
کردی۔ پھر اگر کبھی تذکرہ آیا بھی تو تاریخ کے واقعے اور اس سے اپنے عدم
اتفاق اور اپنی رائے کی صحت پر بعد کے واقعات سے استدلال کا آیا۔ انھوں
نے کبھی پاکستان کے ختم ہوجانے کی خواہش نہیں کی بلکہ اس کے استحکام، اس
میں جمہوریت کے فروغ، اس کے مختلف طبقوں اور فرقوں میں مفاہمت اور

ہندوستان سے اس کے خوشگوار تعلقات کے نہ صرف آرزومند رہے بلکہ اس کے لیے انھوں نے بہترین کوششیں بھی کیں۔‘‘

(آثار ونقوش ص ۲۹)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے بھی اپنے ایک مضمون مطبوعہ ماہنامہ ’’حکمت قرآن‘‘ لاہور (اگست ۱۹۸۴ء) میں اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ مولانا ابوالکلام کو تحریک پاکستان سے اختلاف تھا لیکن جب ملک تقسیم ہوگیا اور پاکستان معرض وجود میں آگیا تو پھر انہوں نے پاکستان کی مخالفت ترک کردی۔ اور ایک مجلس میں فرمایا کہ (جس میں سربرآوردہ مسلمان رہنما شریک تھے):

’’پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارا نظریۂ پاکستان سے اختلاف تھا۔ وہ اپنی جگہ پر تھا۔ اس کے لیے ہمارے پاس ٹھوس وجوہ اور قوی دلائل تھے۔ لیکن اب جب تقسیم ہوگیا ہے اور پاکستان وجود میں آگیا ہے تو ہم کو پاکستان کے کسی لیڈر یا کسی شخص کے تعلق سے اپنے دل میں کوئی رنجش اور کدورت نہیں رکھنی چاہیے۔ میرے بھائی وقت ایک سیاست تھی جس سیاست کو کامیاب ہونا تھا وہ ہوگئی۔‘‘

اس کے بعد فرمایا:

دوسری بات یہ کہ اب پاکستان کے لیے کسی طرح کی بدخواہی کرنا اور اس کے لیے کسی طرح کی بداندیشی کرنا نہ صرف ہمارے ملک ہندوستان کے لیے مضر ہے بلکہ خاص طور پر ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے بھی انتہائی مضر، مہلک اور خطرناک ہے۔ اس واسطے اگر پاکستان ختم بھی ہوگیا یا پاکستان پر کوئی زوال آیا تو پھر ہندوستان کے مسلمان منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ برصغیر میں مسلمانوں کا مستقبل انتہائی تاریک ہوجائے گا۔ ان کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ مولانا نے صاف لفظوں میں کہا کہ اب پاکستان کے ساتھ ہمارا بالکل دوسرا رویہ ہونا چاہیے۔ اور ہم سب کو دعا کرنی چاہیے اور تمنا کرنی چاہیے کہ پاکستان پھلے

پھولے اور مستحکم ہو۔''

میرے والد مرحوم پروفیسر حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی جو مولانا آزاد کے بہت عقیدت منداوران سے دلی محبت کرنے والے تھے کہتے ہیں کہ مولانا آزاد گوملک کی تقسیم نہیں چاہتے تھےلیکن جب ملک تقسیم ہوگیا توانہوں نے پاکستان کی مخالفت ترک کردی۔اور ان کی یہ کوشش رہی کہ پاکستان کومضبوط سے مضبوط ہونا چاہیے۔اور ہر پڑھے لکھے تعلیم یافتہ انسان کو پاکستان چلے جانا چاہیے۔حکیم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میرا ارادہ بھی یہی تھا کہ میں ہندوستان میں رہوں تاکہ یہاں رہ کر ہندوستانی مسلمانوں کی کچھ خدمت کرسکوں۔ میں جولائی ۱۹۴۷ء کے آخری عشرہ میں مولانا سے دہلی میں ملا۔اور ملاقات میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں پاکستان نہ جاؤں اور یہاں رہ کر ہندوستان میں مقیم مسلمانوں کی کچھ خدمت کرسکوں۔میں نے ملاقات میں مولانا سے عرض کیا تھا کہ میرے اہل وعیال گوجرانوالہ میں ہیں۔مولانا نے میری بات سن کر فرمایا:

''میرے بھائی، ہوش کی بات کرو۔بیوی پاکستان میں اور میاں ہندوستان میں۔تمہیں فوراً پاکستان جانا چاہیے اور وہاں جاکر پاکستان کی خدمت کرواور کوشش کروکہ پاکستان مستحکم ہو۔اگر پاکستان مستحکم ہوگا توہندوستان میں مقیم مسلمانوں کا مستقبل روشن ہوگا۔''

والد صاحب مرحوم نے فرمایا کہ:

''میں نے مولانا کی بات پلے باندھی اور اگست ۱۹۴۷ء کے پہلے عشرے میں اپنے وطن سوہدرہ ضلع گوجرانوالہ آگیا۔''

مولانا ابوالکلام آزاد بلاشبہ ایک عظیم سیاستدان تھے۔ان کی سیاسی بصیرت کا اعتراف جواہر لعل نہرو نے بھی کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''میں صرف عملی سیاست ہی نہیں جانتا۔سیاست کا طالب علم بھی ہوں۔علم سیاست کی کتابیں مجھ سے زیادہ ہندوستان میں کسی اور نے نہیں پڑھیں۔میں

تیسرے چھوتھے سال یورپ کا بھی دورہ کرتا ہوں۔ جہاں سیاست کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے سیاست کے تازہ ترین علم سے واقفیت حاصل کرلی ہے۔لیکن جب ہندوستان پہنچ کر مولانا آزاد سے باتیں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب بھی مجھ سے بہت آگے ہیں۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از خلیق انجم ص ۲۱۶)

مولانا آزاد ایک عظیم مدبر اور صاحب فکر ونظر تھے۔وہ جنگ آزادی کے میر کارواں تھے۔ان میں دین وسیاست،تہذیب،مذہب ووطنیت اور جدت وقدامت کا حسین امتزاج تھا۔ان کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلام میں دین وسیاست کی وحدت کا بھولا ہوا سبق برصغیر کے مسلمانوں کو یاد کرایا۔ایک طرف وہ بڑے عالم دین اور راسخ العقیدہ مسلمان اور اپنی دین وتہذیبی روایات کے امین ومحافظ تھے۔مولانا ابوالکلام آزاد جس مرتبہ ومقام کے حامل تھے اور علوم وفنون کے اعتبار سے ان کا جو مرتبہ تھا۔برصغیر کے مسلمان ان کی خدمات جلیلہ سے کما حقہ استفادہ نہ کرسکے۔اور مولانا نے اس کا شکوہ کیا تھا۔فرماتے ہیں:

''افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کرسکا۔غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری کا رونا تھا۔معلوم نہیں میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔''

ملک عبدالرشید عراقی صاحب جماعت اہل حدیث کے معروف لکھاری ہیں۔شخصیات پر ان کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔مولانا آزاد مرحوم ومغفور سے ان کو بہت زیادہ محبت وعقیدت ہے۔اس سے پہلے ان کی تین کتابیں مولانا آزاد پر شائع ہوچکی ہیں۔۱۔مولانا ابوالکلام آزاد (شخصیت وخدمات) ۲۔مولانا ابوالکلام آزاد (صحافی ومفسر) ۳۔مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفی خدمات۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے راقم آثم کو بہت محبت وعقیدت ہے اور ان کی دینی وعلمی،

مذہبی و ادبی، قومی وملی اور سیاسی خدمات کا دل وجان سے معترف ہے۔ اور ان سے محبت وعقیدت مجھے اپنے والد محترم مرحوم پروفیسر حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی سے ورثہ میں ملی ہے۔ والد مرحوم مولانا آزاد سے بہت زیادہ محبت وعقیدت رکھنے والے تھے۔ اور ان کی خدمات جلیلہ کے معترف تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا اور والد محترم کی لغزشوں کو معاف کرے اور جنت میں اُنھیں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین!)

عراقی صاحب نے اپنی اس کتاب میں (۱۴) عنوانات کے تحت مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمات جلیلہ کا جائزہ لیا ہے۔ ذیل میں ان موضوعات کی کچھ مختصر تفصیل پیش کی جاتی ہے:

باب نمبر ۱ :...... مولانا ابوالکلام آزاد کے حالات زندگی، ان کے والد مولانا خیرالدین مرحوم کے مختصر حالات، تعلیم، اور ان کی عملی زندگی وغیرہ کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ اور آخر میں مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی نے اپنی کتاب ''نزھۃ الخواطر'' جلد ہشتم میں مولانا کے جو حالات عربی میں لکھے ہیں وہ بھی اردو زبان میں تحریر کردیے ہیں۔

باب نمبر۲ :...... مولانا کی صحافتی خدمات سے متعلق ہے۔ اس میں مولانا کا جن رسائل واخبارات سے تعلق رہا ہے۔ اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ اور ان رسائل واخبارات کی تعداد اٹھارہ (۱۸) ہے۔

باب نمبر۳ :...... مولانا کی خطابت سے تعلق رکھتا ہے۔ مولانا ایک عظیم خطیب تھے۔ اور ان کی خطابت کا شہرہ پورے برصغیر میں تھا۔ اس باب میں عراقی صاحب نے سات (۷) خطبوں کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ ان خطبوں کو پڑھنے سے مولانا کی خطابت اور ان کی وسعت معلومات اور ذوق مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

باب نمبر٤ :...... مولانا آزاد کی مکتوب نگاری، اب باب میں مولانا نے اپنی حیات میں مختلف احباب کے نام جو علمی ودینی اور ملکی حالات سے متعلق خطوط لکھے ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ خاص کر مولانا کی دو کتابیں (غبار خاطر اور کاروان خیال) کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

اس کے علاوہ مولانا غلام رسول مہر مرحوم کے نام مولانا نے جو خطوط لکھے اور مولانا مہر نے وہ تمام خطوط نقش آزاد کے نام سے شائع کر دیے۔ اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

باب نمبر ۵ :......مولانا ابوالکلام آزاد کی قرآنی بصیرت۔ عراقی صاحب کا یہ باب اڑسٹھ (۶۸) صفحات پر محیط ہے۔ اس باب میں مولانا کی قرآنی بصیرت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' پر بڑے عمدہ الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور مولانا نے ''ترجمان القرآن'' میں جو علمی نکات بیان کیے ہیں ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اور بڑے علمی عنوانات کے تحت مولانا نے جو رموز و نکات بیان کیے ہیں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اس باب کے شروع میں مولانا آزاد نے ''ترجمان القرآن'' کا انتساب جس نامعلوم شخص کے نام کیا ہے اس کا بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ بعد میں اس شخص کے نام کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ مولوی محمد قندھاری تھے۔ جو قندھار سے پیدل چل کر مولانا کے پاس رانچی (بہار) پہنچے تھے۔ جہاں مولانا ۴ سال کے لیے نظر بند تھے۔ اور مولانا سے قرآن مجید کے بعض علمی مباحث سے متعلق استفادہ کیا تھا۔

اس باب میں عراقی صاحب نے اکیس (۲۱) عنوانات کے تحت مولانا کی قرآنی بصیرت اور علوم القرآن پر مولانا کی معلومات اور ان کے تبحر علمی اور قرآن کے رموز و نکات پر روشنی ڈالی ہے۔ آیۃ الکرسی کے بارے میں مولانا نے جو نوٹ لکھا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''خدا کے سوا کوئی معبود نہیں وہ مالک الملک ہے۔ حی و قیوم ہے۔ اس کی حکمت سے کوئی گوشہ باہر نہیں۔ اس کے علوم سے کوئی شے مخفی اور اوجھل نہیں۔ وہ غفلت سے منزہ اور نسیان سے پاک ہے۔ جس ہستی کی صفتیں ایسی ہوں اس کے سامنے کی کسی کی سفارش کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ اس کے احکام و قوانین کے نفاذ میں کون ہے جو دخل دینے کی جرأت کر سکتا ہے۔''

عراقی صاحب نے اس باب میں جن عنوانات کے تحت مولانا کی قرآنی بصیرت سے متعلق ان کی تحریریں پیش کی ہیں۔ وہ آپ فہرست میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

باب نمبر ۶:......کا عنوان ہے ''مولانا ابوالکلام آزاد کا تصور حدیث''، بعض لوگوں نے مولانا کی زندگی میں یہ پروپیگنڈہ کیا تھا کہ مولانا آزاد کا حدیث نبوی ﷺ کے متعلق وہ نظریہ نہیں تھا جو سلف صالحین کا تھا۔ عراقی صاحب نے اس باب میں یہ بتایا ہے کہ مولانا کا حدیث کے بارے میں وہی نظریہ تھا جو سلف صالحین کا ہے۔ اور مولانا کے مخالفین نے جو پروپیگنڈہ کیا تھا وہ محض مخالفت برائے مخالفت پر مبنی تھا۔ اگر مولانا کی تصانیف اور خاص کر ان کی تفسیر ترجمان القرآن کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مولانا کا حدیث کے بارے میں وہی نظریہ تھا جو سلف صالحین کا تھا۔ مولانا حدیث نبوی ﷺ کو حجت اور واجب العمل مانتے تھے۔

باب نمبر ۷:......مولانا آزاد کے مذہبی فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس باب میں عراقی صاحب نے مولانا کے مذہبی فکر کے متعلق ان کے خطبہ صدارت پہلے اجلاس انڈین نیشنل کانگریس منعقدہ رام گڑھ (مارچ ۱۹۴۰ء) کا ایک اقتباس پیش کیا ہے۔ اس اقتباس سے مولانا کے مذہبی فکر کی واضح طور پر نشاندہی ہوگئی ہے۔ اس کے بعد عراقی صاحب نے یہ بتایا ہے کہ مولانا بدعات اور تقلید شخصی کے سخت مخالف تھے۔ بدعات سے سخت نفرت تھی اور تقلید شخصی کو کسی بھی طور پر پسند نہیں کرتے تھے۔

باب نمبر ۸:......مولانا کی انشاء پردازی سے متعلق ہے۔ مولانا ایک بہت بڑے انشاء پرداز تھے۔ ان کی انشاء پردازی کے متعلق مولانا حسرت موہانی کا یہ شعر حرف آخر ہے:

جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

باب نمبر ۹:......مولانا آزاد کی شاعری کے متعلق ہے، اس میں یہ تفصیل بیان کی

گئی ہے کہ مولانا نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا اور ۱۳۔۱۴ سال کی عمر میں آپ نے شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ مولانا نے اردو اور فارسی میں نظمیں لکھیں۔ غزل بھی لکھی ، رباعی بھی لکھی ، ان کی مشہور رباعی ہے :

تھا جوش خروش اتفاقی ساقی
اب زندہ دل کہاں باقی ساقی
میں نے روپ بدلا ایسا
مے کش مے رہا نہ ساقی ساقی

باب نمبر ۱۰ :......مولانا کی سوانح نگاری ، اس باب میں مولانا کی مشہور کتاب ''تذکرہ'' پر تفصیل سے تبصرہ کیا گیا ہے۔ مولانا نے اپنی اس کتاب میں ابتداء میں اپنے ایک خاندانی بزرگ جمال الدین کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ اس کے بعد امام احمد بن حنبلؒ ، امام ابن تیمیہؒ اور مجدد الف ثانی کے حالات زندگی اور ان کی حق گوئی و بیباکی اور دین اسلام میں ان کی استقامت اور دعوت وعزیمت پر روشنی ڈالی ہے۔

باب نمبر ۱۱ :......مولانا آزاد کی تصانیف ، اس باب میں عراقی صاحب نے مولانا کی چوبیس (۲۴) مشہور تصانیف کا مختصر تعارف کرایا ہے۔

باب نمبر ۱۲ :......مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت۔ مولانا نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز انڈین نیشنل کانگریس سے کیا۔ اور زندگی کے آخری ایام تک کانگریس سے وابستہ رہے۔ مولانا برصغیر کی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔ اور پاکستان کے قیام کے مخالف تھے۔ لیکن جب پاکستان معرض وجود میں آگیا تو پھر انہوں نے مخالفت ترک کردی۔ اور ان کا نظریہ یہ ہوگیا کہ اب پاکستان بن گیا ہے۔ اور اب اس کو مستحکم اور مضبوط کرنا چاہیے۔ اس کے مستحکم ہونے سے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کا مستقبل روشن ہوگا۔ عراقی صاحب نے اس سلسلے میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی ، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری ، میاں محمد شفیع

اور ڈاکٹر محمد باقر وغیرہ کی تحریروں کے ذریعے بتایا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے تقسیم ملک کے بعد پاکستان کی مخالفت نہیں کی۔

باب نمبر ۱۳ :......مولانا آزاد کے ایام اسیری سے متعلق ہے۔تحریک آزادی ہند کے سلسلہ میں مولانا نے جو قربانیاں دیں اور اس سلسلہ میں قید و بند کے مصائب برداشت کیے۔اور ایک بار نہیں متعدد بار قید ہوئے اور ان کے ایام اسیری کی مدت تقریباً ۸ سال بنتی ہے۔مولانا نے خود لکھا ہے کہ میری زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن جیل میں گزرا۔عراقی صاحب نے اس باب کے آخر میں اپنا ایک مضمون ''جیلوں میں علمی خدمات'' کا اضافہ کیا ہے۔جو روز نامہ امروز لاہور میں ۸ فروری ۱۹۸۶ء کو شائع ہوا تھا۔اس مضمون میں یہ بتایا گیا تھا کہ جن مسلمان اکابرین،اور علمائے دین کو اسیرانہ زندگی گزارنی پڑی وہ قید خانوں میں بیکار نہیں بیٹھے رہے بلکہ کچھ نہ کچھ علمی کام کرتے رہے،اس باب میں علماء کی ان علمی مساعی کا ذکر کیا ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد نے رانچی کی نظر بندی میں ترجمان القرآن اور کئی کتابیں ترتیب دیں۔اور قلعہ احمد نگر کی جیل میں ''غبار خاطر'' لکھی۔عراقی صاحب کا یہ مضمون اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑا معلوماتی اور جامع ہے۔

باب نمبر ۱۴ :......مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے معاصرین۔عراقی صاحب کا یہ باب بڑا طویل ہے۔اور (۱۳۷) صفحات پر محیط ہے۔اس باب میں مولانا کے (۲۴) معاصرین کے حالات اور مولانا سے ان کے تعلقات اور مولانا کے بارے میں ان کے ارشادات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔معاصرین کے نام آپ فہرست میں پڑھ آئے ہیں، عراقی صاحب نے ان معاصرین میں پنڈت جواہر لعل نہرو،علامہ شبلی نعمانی،سید سلیمان ندوی،علامہ اقبال،مولانا ظفر علی خان،عبدالماجد دریابادی،مولانا سعید احمد اکبر آبادی، اور مولانا غلام رسول مہر کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔مولانا ظفر علی خان پر مضمون بہت طویل ہے۔اور (۴۲) صفحات پر محیط ہے۔

عراقی صاحب کی خواہش پر میں نے کتاب کا یہ تعارف تحریر کیا ہے۔ اگرچہ میں اس قابل نہیں تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے علم وفضل اور ان کی علمی و دینی اور سیاسی خدمات پر اظہار خیال کرسکوں لیکن راقم مولانا کے عقیدت مندوں میں سے ہے۔ اس لیے عراقی صاحب کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا آزاد پر لکھنے والوں میں شامل ہوگیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ عراقی صاحب کی محنت کو قبول فرمائے۔ اور راقم نے مولانا کے بارے میں جو لکھا ہے اس کو بھی اہل علم وقلم میں پذیرائی حاصل ہو۔

حکیم راحت نسیم سوھدروی

ہمدرد دواخانہ، اسکیم موڑ، ملتان روڈ لاہور

باب نمبر ۱

مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح

مولانا ابوالکلام آزاد کے آباواجداد مغلیہ حکومت کے بانی ظہیرالدین بابر کے عہد حکومت میں افغانستان کے شہر ہرات سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ کچھ عرصہ آگرہ میں قیام کر کے پھر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا خاندانی شجرہ نسب یوں ہے:

مولانا ابوالکلام بن شیخ خیرالدین بن شیخ محمد ہادی بن شیخ محمد افضل بن شیخ محمد محسن۔

مولانا خیرالدین

مولانا خیرالدین ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۷ھ دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کے والدین کا انتقال ہو گیا۔ تو ان کی پرورش ان کے نانا مولانا منورالدین نے کی۔ مولانا منورالدین ایک جیّد عالم دین تھے۔ اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۸ء میں بمبئی میں انتقال کیا۔ مولانا خیرالدین نے دینی تعلیم اپنے نانا کے علاوہ دوسرے علمائے کرام سے بھی حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں مولانا مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، مولانا رشیدالدین اور مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی نواسہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بھی شامل ہیں۔

مولانا خیرالدین نے ۱۸ سال کی عمر میں علوم دینیہ سے فراغت پائی۔ علوم اسلامیہ کے علاوہ طب اسلامی میں بھی دسترس حاصل کی۔ مولانا منورالدین جب ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز جا رہے تھے تو مولانا خیرالدین بھی ان کے ساتھ تھے۔ مولانا منورالدین حجاز نہ پہنچ سکے۔ اور بمبئی میں انتقال کر گئے۔ لیکن مولانا خیرالدین حجاز چلے گئے۔ حجاز پہنچ کر خیرالدین کی اس زمانے کے دو مشہور علماء سے ملاقات ہوئی۔ ایک تھے شیخ عبداللہ سراج جن

کا قیام مکہ معظّمہ میں اور دوسرے شیخ محمد ظاہر وتری ان کا قیام مدینہ منورہ میں تھا۔ یہ دونوں علمائے کرام حدیث وفقہ کے درس وتدریس میں مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے۔ مولانا خیرالدین نے ان دونوں علماء سے استفادہ کیا۔

۱۸۷۱ء میں مولانا خیرالدین نے اپنے مدنی استاد شیخ محمد ظاہر وتری کی بھانجی سے نکاح کرلیا۔ اور اس کے ساتھ مکہ معظّمہ میں اپنے لیے مکان بنوایا۔ مکان کے لیے جگہ اپنے مکی استاد شیخ عبداللہ سراج سے خریدی۔

مولانا خیرالدین نے ہندوستان آمد ورفت جاری رکھی اور کئی دوسرے اسلامی ممالک کے سفر بھی کیے۔ مولانا خیرالدین نے پیری مریدی کا سلسلہ بھی چلایا، ایک وقت آیا کہ ان کا شمار پیروں میں ہونے لگا، ہزاروں لوگوں نے ان سے بیعت کی اور ان کے مریدوں کا حلقہ وسیع ہوگیا۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ان کے بے شمار مرید تھے۔

قیام مکہ کے دوران ایک دن مولانا خیرالدین گر پڑے۔ اور ان کی بائیں ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس وقت مکہ میں علاج کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ ڈاکٹر نے ہڈی جوڑی لیکن جوڑنے میں نقص رہ گیا جس سے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ چنانچہ مولانا خیرالدین علاج کے لیے مع اہل وعیال کلکتہ آئے۔ یہاں علاج سے کچھ تکلیف رفع ہوئی۔ لیکن خفیف سا لنگ رہا اور چلنے میں لکڑی کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ کلکتہ آکر ان کو ایک دوسرا حادثہ پیش آیا کہ ۱۸۹۹ء میں ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد مولانا خیرالدین نے مکہ معظّمہ جانے کا عزم کیا۔ لیکن معتقدین کا ایسا ہجوم شروع ہوا کہ ان کو مکہ معظّمہ جانے کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔ اور آخر آپ نے اپنی رہائش کے لیے کلکتہ میں مکان بنوالیا۔ یہیں آپ نے ۱۵/ اگست ۱۹۰۸ء کو ۷۷ سال کی عمر میں کلکتہ میں انتقال کیا اور اگرتلہ کے قبرستان میں اپنی بیوی کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مولانا خیرالدین کی اولاد میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ بیٹے! ابوالنصر غلام یٰسین آہ اور ابوالکلام محی الدین احمد آزاد۔ بیٹیاں۔ زینب، فاطمہ، حنیفہ۔ فاطمہ کا تخلص آرزو تھا۔ اور حنیفہ کا تخلص آبرو تھا۔

ولادت

مولانا ابوالکلام آزاد کی ولادت مکہ معظّمہ میں ہوئی۔تاریخ ولادت ۱۷/اگست ۱۸۸۸ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ۔والد نے تاریخی نام ''فیروز بخت'' رکھا۔اوراس مصرع سے ہجری سال کا استخراج کیا ہے:

جواں بخت وجواں طالع، جواں باد

تعلیم

مولانا کی جب عمر ۵ سال کی ہوئی تو حرم شریف میں شیخ عبداللہ نامی ایک بزرگ نے ان کی بسم اللہ کی رسم ادا کی۔ایک دوسال میں قرآن شریف ختم کرلیا تھا۔سورۃ یٰس اور سورۃ ق وغیرہ زبانی یاد کرلی تھیں۔ان کے والد مولانا خیرالدین ان کو گھر میں تعلیم دیتے تھے۔ عربی اور فارسی ایک ساتھ پڑھاتے تھے۔مولانا خیرالدین کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جن اساتذہ کرام سے مختلف علوم میں استفادہ کیا ان کے نام یہ ہیں:

- مولوی نذیرالحسن امیٹھوی
- مولوی محمد ابراہیم
- مولوی محمد عمر
- شمس العلماء مولانا سعادت حسین

(مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ خلیق انجم ص ۳۸)

مولانا نے ۱۹۰۰ء میں فارسی کی تعلیم مکمل کرلی۔اور ۱۹۰۳ء میں درس نظامی سے فارغ ہوگئے۔عربی اور فارسی میں اتنی استعداد پیدا کرلی کہ اردو بالکل نظر انداز ہوگئی۔مولانا کو اردو پڑھنے کا خود بخود شوق پیدا ہوا۔مکہ معظّمہ میں مولانا کو اردو پڑھانا شروع کردیا گیا تھا۔جب آپ کلکتہ تشریف لائے توانھوں نے اردو اپنی بہن حنیفہ (آبرو بیگم) سے اور گھر سے باہر حافظ بخاری سے اُردو کی تحصیل کی۔بعدازاں کثرت انہماک مطالعہ سے مختلف علوم میں غیر معمولی کمال حاصل کرلیا۔مغربی زبانوں میں انگریزی،فرانسیسی اور ترکی میں بھی اتنی استعداد پیدا کرلی

کہ ان زبانوں کی کتابیں آسانی سے پڑھ لیتے تھے۔ اور اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتے تھے۔

حافظہ

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے حافظہ کی غیر معمولی نعمت سے نوازا تھا۔ صلاحیت حفظ واستحضار کے لحاظ سے وہ قدرت کا ایک عجیب وغریب نشان تھے۔ بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ پڑھتے تھے۔ دماغ کے مختلف خانوں میں حسن ترتیب سے چنتے جاتے تھے۔ ہر خانہ ضرورت کے وقت خود بخود کھل جاتا اور جو شے چاہتے اٹھا لیتے۔

مولانا اپنے حافظہ کے بارے میں اپنے ایک مکتوب بنام مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی میں لکھتے ہیں کہ:

> ''بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں ہوتی گویا کسی کونے میں سو رہی ہے۔ پھر کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھے گی جیسے اسی وقت دماغ کے کواڑ کو کھول کر اندر سے لے لیا ہو۔ اشعار ومطالب کی یادداشت میں اسی طرح کی واردات اکثر پیش آتی رہتی ہیں۔ تیس چالیس برس پیشتر کے مطالعے کے نقوش کبھی اچانک اس طرح ابھر آئیں گے کہ معلوم ہوگا ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں۔ مضمون کے ساتھ کتاب یاد آ جاتی ہے۔ کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ اور صفحہ کے ساتھ یہ تعین کہ مضمون ابتدائی سطروں میں تھا، یا درمیانی سطروں میں، یا آخری سطروں میں۔ نیز صفحے کا رخ داہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا۔''

(غبارِ خاطر ص ۹۰۔۸۹)

ادبی زندگی کا آغاز

مولانا ابوالکلام نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شعر وشاعری سے کیا اور دس گیارہ برس کی عمر میں انھوں نے شعر کہنا شروع کر دیے۔ سہسرام کے ایک صاحب مولوی عبدالواحد مولانا کے گھر آیا کرتے تھے۔ یہ مولانا فاروق چڑیا کوٹی کے شاگرد تھے۔ شاعری کا بہت عمدہ ذوق

رکھتے تھے۔ اور مشاعروں میں شرکت فرماتے رہتے تھے۔ ان کی صحبت میں رہ کر مولانا ابوالکلام کو شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ بمبئی سے ایک رسالہ ''ارمغان فرخ'' شائع ہوتا تھا۔ اس گلدستے میں طرح دی جاتی تھی۔ ایک دفعہ ''ارمغان فرخ'' کی طرح تھی:

پوچھی زمیں کی تو کہی آسماں کی

مولانا نے اس پر ایک غزل کہی۔ اس کے تین شعر یہ ہیں:

نشتر یہ دل ہے آہ کسی سخت جاں کی
نکلی صدا تو فصد کھلے گی زباں کی
گنبد ہے گردبار تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائباں کی
آزاد بےخودی کے نشیب وفراز دیکھ
پوچھی زمیں کی تو کہی آسماں کی

مولانا نے یہ غزل مولوی عبدالواحد کو سنائی تو انہوں نے ان کی ہمت افزائی کی اور تعریف وتحسین کے کلمات کہے۔ مولوی عبدالواحد کے کہنے پر یہ غزل ''ارمغان فرخ'' کو اشاعت کے لیے بھیجی گئی۔ چنانچہ یہ غزل ''ارمغان فرخ'' میں شائع ہوئی۔

نثر میں بھی مولانا ایک خاص اہمیت اور مقام کے حامل تھے۔ ان کی نثر کے بارے میں مولانا حسرت موہانی نے فرمایا تھا:

جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

مولانا کی نثر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت مربوط ہوتی ہے۔ ایک ایک لفظ اپنی جگہ پہاڑ کی مضبوطی کی طرح جما ہوتا ہے۔ اگر ایک لفظ بھی ادھر ادھر ہوجائے تو ساری فصاحت خاک میں مل جائے۔

پروفیسر رفیع انور صاحب اپنے ایک مقالہ میں مولانا کی نثر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا کی تحریروں میں شروع سے آخر تک کوئی سبک اور رقیق لفظ ... باوجود ساری زندگی کی سیاسی جھمیلوں میں گزری لیکن کیا مجال جو ذاتی ... اور جماعتی تعصّبات آپ کو سوقیانہ اور رقیق الفاظ کے استعمال پر مجبور کرسکیں، سچ تو یہ ہے کہ ان کی ساری زندگی ہی جماعتی تعصّبات سے بہت زیادہ بلند ہے چہ جائیکہ لکھتے وقت ابتذال اور سوقیت میں پناہ گزیں ہوں۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ ابوسلمان شاہ جہان پوری ص۱۳۲)

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ:

''قادرالکلام کا لفظ ہمارے ہاں شاعری ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نثر نگاروں میں کسی پر اس کا اطلاق اگر پوری طرح ہوسکتا ہے تو وہ ابوالکلام کی ذات ہے۔ مضمون خوشی کا ہو یا غم کا، داستان رزم کی ہو یا بزم کی، موضوع علمی ہو یا شعری، عنوان سیاسی ہو یا فلسفیانہ، یہ سدابہار قلم ہر انداز بیان، ہر اسلوب نگارش، ہر پرواز فکر پر یکساں قادر، ان کا قلم ہر رنگ تحریر پر قادر، بے شبہ رہا۔ لیکن ایک چیز کا اضافہ کیا گیا ہے وہ اب سن لیجیے جس میدان میں ان کا راہوار قلم دوڑ نے کیا چلنے سے بھی معذور رہا۔ اس کا نام ہے کرختگی۔ یہ نہیں کہ انہیں غصہ نہ آتا ہو۔ آتا تھا لیکن عتاب بھی لطف خطاب سے خالی اور رنگ جلال پرتو جمال سے عاری نہ ہوتا۔''

(ماہنامہ نقوش لاہور ستمبر ۱۹۶۵ء ص ۵۱۶)

نثر کا ایک کمال یہ ہوتا ہے کہ موضوع زیر بحث میں کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے صرف الفاظ کی رنگینی اور تراکیب کی ندرت سے کام نہ لیا جائے بلکہ مستحکم اور قاطع وساطع دلائل وبراہین لائے جائیں تاکہ قاری کے ذہن میں کسی قسم کے شکوک وشبہات پیدا نہ ہوں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس صفت میں قادر الکلام تھے۔ اور مولانا کی تحریروں میں ایک واضح خوبی جوش وتاثیر ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا ابوالکلام آزاد جو کچھ لکھتے تھے وہ ان کے دل کی آواز ہوتی تھی:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

اسی چیز سے متاثر ہو کر مولانا محمد علی جوہر نے فرمایا تھا کہ:

''میں نے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور علامہ اقبال کی شاعری سے سیکھی۔''

تصانیف

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت بڑی ہمہ گیر تھی۔ انھوں نے ادب، صحافت، خطابت، سیاست اور کتنے ہی دوسرے شعبوں میں اپنے غیر فانی نقوش چھوڑے ہیں۔ مولانا ایک بہت بڑے مصنف بھی تھے۔ آپ نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا۔ جس موضوع پر لکھا اس کا حق ادا کر دیا۔ یہاں مولانا کی چند معروف مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف کی فہرست درج کی جاتی ہے:

مطبوعہ:

۱۔ ترجمان القرآن جلد اول و دوم
۲۔ تذکرہ
۳۔ قول فیصل
۴۔ مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب
۵۔ جامع الشواہد
۶۔ غبار خاطر
۷۔ کاروان خیال
۸۔ میرا عقیدہ
۹۔ فلسفہ
۱۰۔ البیرونی اور جغرافیہ علم
۱۱۔ خطبات آزاد
۱۲۔ نقش آزاد
۱۳۔ تبرکات آزاد
۱۴۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی (بہ روایت ملیح آبادی)
۱۵۔ رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم
۱۶۔ انبیائے کرام علیہم السلام

۱۷۔نگارشات آزاد
۱۸۔مکاتیب ابوالکلام
۱۹۔ملفوظات ابوالکلام
۲۰۔انڈیا وِنز فریڈم (تحریک آزادی)

غیر مطبوعہ :

۲۱۔تفسیر سورۃ الواقعہ
۲۲۔تاریخ معتزلہ
۲۳۔سیرۃ شاہ ولی اللہ دہلوی
۲۴۔مرزا غالب کے اردو دیوان پر تبصرہ
۲۵۔خصائص مسلم
۲۶۔امثال القرآن
۲۷۔دیوان شرف جہاں قزوینی پر تبصرہ
۲۸۔سیرۃ حضرت مجدد شیخ احمد سرہندی
۲۹۔اتحاد الخلف بطریقۃ السلف
۳۰۔الکلم الطیب
۳۱۔سیرۃ طیبہ ماخوذ از قرآن حکیم
۳۲۔سیرۃ امام احمد بن حنبلؒ
۳۳۔سیرۃ امام ابن تیمیہ واصحابہ
۳۴۔شرح حدیث غربت۔

(مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ غلام رسول مہرص ۱۷۰،۱۷۱)

مالی دشواریاں

مولانا ابوالکلام آزاد بہت زیادہ خوددار اور قناعت پسند انسان تھے۔عفاف واستغناء کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹا۔طبیعت میں قناعت بہت زیادہ تھی۔کریمانہ اخلاق اور ستودہ صفات کے حامل تھے۔شریف الطبع انسان تھے۔اپنے پہلو میں ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ اگر مالی حالات بہتر ہوتے تو عمدہ سے عمدہ چیزیں استعمال کرتے اور شاہانہ انداز میں روپیہ خرچ کرتے۔اگر کبھی مالی مشکلات میں مبتلا ہوجاتے تو قناعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ:

> ''مولانا نے آنکھ کھولی تو سونے کا چمچہ ہاتھ میں تھا۔بہت بڑے پیر کے نورنظر تھے۔دولت ہی دولت برستی تھی۔ایسے آدمیوں کے لیے فقروفاقہ دوسروں سے کہیں زیادہ مصیبت اور ذہنی اذیت کا سبب بن جاتا ہے۔مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ مولانا اسی فقروفاقہ میں بھی زیادہ سے زیادہ ہشاش

بشاش رہتے تھے۔کبھی ان کے ماتھے پر بل نہیں دیکھا۔کبھی جھنجھلائے نہیں بلکہ ان خشک دنوں میں مولانا کی بشاشت اور ظرافت عروج پر پہنچ گئی تھی۔"

(ماہنامہ آج کل دہلی۔ابوالکلام نمبر اگست ۱۹۵۸ء)

مولانا ابوعلی اثریؒ لکھتے ہیں کہ:

"مولانا ابوالکلام اپنے والد کے پیری مریدی کے طریقے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ان کے والد نے اپنے اس پیشہ کے ذریعے بہت دولت اور کلکتہ اور بمبئی وغیرہ میں بڑی جائیداد اور املاک پیدا کرلی تھی۔کئی مکانات تھے وہ سب مولانا کو وراثت میں ملے۔لیکن مولانا نے کوئی مستقل ذریعہ معاش نہ ہونے کی وجہ سے کلکتہ کے مسکونہ مکان کے علاوہ جو کڑایہ کی طرف صالح لین میں تھا۔جس کی زیارت کا شرف خاکسار کو بھی حاصل ہے۔رفتہ رفتہ ساری املاک وجائیداد بیچ دی۔مگر انھوں نے پیری مریدی کو ذریعہ معاش نہ بنایا۔جس کو وہ شرعاً صحیح نہیں سمجھتے تھے۔اور اسی پر وہ اپنی زندگی کے آخر تک پوری استقامت کے ساتھ قائم رہے۔اسی دوران میں ان کو اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے مقروض بھی ہونا پڑا۔پھر بھی انھوں نے دامن صبر ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔اور کھانے پینے اوڑھنے اور زندگی کی دوسری ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تکلیف اٹھاتے رہے۔اور اپنے والد کی زندگی میں انھوں نے اپنے لیے جو راہِ عمل اختیار کی تھی۔اس پر پوری استقامت کے ساتھ زندگی بھر گامزن رہے۔اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ہر طرح کی مدد کی۔اور خوب خوب نوازا۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ ابوعلی اثری ص ۴۰)

یہ حقیقت ہے اور اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلق ایک خوش حال خاندان سے تھا۔لیکن انھوں نے جو راستہ اختیار کیا تھا۔اس میں تنگ دستی کے سوا اور کیا تھا۔آدمی مصیبت میں پہچانا جاتا ہے۔مولانا ہر مصیبت میں خواہ وہ کتنی ہی بڑی رہی ہمیشہ سرفراز ہی رہے۔

وجاہت

مولانا ابوالکلام بہت خوبصورت وجیہہ انسان تھے۔مولانا عبدالماجد دریابادی نے ۱۹۰۹ء میں ابوالکلام آزاد کا قلمی چہرہ ان الفاظ میں لکھا ہے:

''پلیٹ فارم پر دیکھا کہ سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم سے ایک نوجوان سگرٹ پیتے ہوئے گورے چٹے، خوش رو، پاجامہ زیب، کشیدہ قامت، چھریرے بدن کے، سیاہ شیروانی اور سیاہ ایرانی ٹوپی میں ملبوس، نوجوان رعنا ایسے کہ نظر اُن پر خواہ مخواہ پڑے پوچھ گچھ شروع ہوئی کسی نے کہا کہ کوئی ایرانی پرنس (شہزادہ) معلوم ہوتا ہے۔آخر کو کھلا کہ یہ ابوالکلام آزاد ہیں۔''

(ماہنامہ شاہراہ دہلی آزاد نمبر فروری، مارچ ۱۹۵۸ء ص ۹۷)

دارالارشاد

۱۹۱۵ء میں مولانا نے کلکتہ میں دارالارشاد کی بنیاد رکھی۔ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ مطابق ستمبر ۱۹۱۶ء اس کا افتتاح عمل میں آیا اور درس کا سلسلہ شروع ہوگیا۔دارالارشاد میں علوم عربیہ اور انگریزی مدارس کے فارغ التحصیل طلباء کے لیے دو جماعتیں شروع کی گئیں تاکہ انھیں درس قرآن دیا جاسکے۔انگریزی مدارس کے فارغ التحصیل سے مراد گریجوایٹ ہیں۔

دارالارشاد میں طلباء کے قیام اور طعام کی ذمے داری مدرسے ہی کی تھی۔اور مدرسے کا پورا خرچ مولانا کے ذمے تھا۔انھوں نے کبھی کسی سے مالی مدد لی اور نہ چندہ مانگا۔

مولانا اسحاق بھٹی لکھتے ہیں کہ:

''جولائی ۱۹۱۵ء رمضان المبارک ۱۳۲۳ھ میں مولانا آزاد نے کلکتہ میں ''دارالارشاد'' کے نام سے ایک مدرسہ جاری فرمایا تھا۔اس مدرسے کے اجراء کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بہت ہی کم مدت میں نوجوانوں کی جماعت کو قرآن مجید کی تعلیم سے آراستہ کرکے ملک میں دعوت وتبلیغ اور اصلاح وارشاد امت کا فرض انجام دینے کے لیے تیار کیا جائے۔اس مدرسے میں تعلیم وتربیت حاصل

کرنے والوں کا ایک گروہ عربی اور دینیات کے فارغ التحصیل طلباء کا اور ایک گروہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم سے فارغ ہونے والوں کا تھا۔ ان طلباء کے قیام وطعام کی ذمہ داری مولانا آزاد نے خود اٹھائی تھی۔''

(نقوشِ عظمت رفتہ ص ۴۴۹)

۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال نے مولانا کو صوبہ بدر کر دیا تو مولانا رانچی (صوبہ بہار) چلے گئے۔ اور حکومت برطانیہ نے انہیں رانچی میں تین سال کے لیے نظر بند کر دیا۔ جہاں سے دسمبر ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے۔ کلکتہ سے نکلنے کے ساتھ ہی دارالارشاد بند ہو گیا۔

مولانا نے ''حزب اللہ'' کے نام سے ایک جماعت بھی قائم کی تھی جس میں چند علماء اور چند انگریزی نوجوانوں نے شرکت کی۔ مولانا نے ان میں درس قرآن کا سلسلہ شروع فرمایا۔ مولانا محی الدین احمد قصوری اور خواجہ عبدالحی فاروقی اس درس میں شریک ہوتے تھے لیکن یہ جماعت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ بقول مولانا محمد اسحاق بھٹی:

''مولانا آزاد نے جو توقعات اس سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ پوری نہ ہو سکیں۔ اس لیے انہیں یہ سلسلہ ختم کرنا پڑا۔''

وفات

۱۹ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا ابوالکلام پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو سوا دو بجے شب دہلی میں انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا احمد سعید دہلوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان گراؤنڈ مزار سرمد شہید کے قریب دفن کیے گئے۔

مولانا کی قبر سے متعلق شورش کاشمیریؒ لکھتے ہیں کہ:

''راقم الحروف کا یہ عقیدہ ہے کہ اقبال اور ابوالکلام اس صدی کے بہت بڑے مسلمان اور عبقری دماغ تھے۔ دونوں کا سیاسی میدان ہمیشہ ہی مختلف رہا لیکن عوام کی بھیڑ سے کنارہ کیا۔ اقبال کو شاہی مسجد لاہور کے پہلو میں جگہ ملی کہ سامنے قلعہ شاہی اور وسط میں حضوری باغ ہے۔ ابوالکلام کو جامع مسجد اور لال

قلعہ کے درمیان قلب میں جگہ ملی کہ مولانا دونوں عمارتوں کے شکوہ کی انسانی تصویر تھے۔''

(ہفت روزہ چٹان لاہور ۳ مارچ ۱۹۵۸ء)

مولانا کی وفات پر برصغیر پاک وہند کے اخبارات ورسائل نے تعزیتی اداریے، شذرات اور مضامین ومقالات لکھے۔کئی اخبارات ورسائل نے بعد میں مولانا کی یاد میں خصوصی نمبر شائع کیے۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے معارف اعظم گڑھ میں مولانا آزاد کے انتقال پر درج ذیل اداریہ لکھا:

''آہ! مولانا ابوالکلام

علم ودانش کا آفتاب غروب ہوگیا۔بالآخر اس مسیحانفس نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی جو نصف صدی سے اپنے انفاس گرم سے مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکتا رہا۔وہ روشن ضمیر اٹھ گیا جو اپنے نور بصیرت سے تاریک دماغوں کو منور کرتا رہا۔کاروانِ ملت کا وہ حُدی خواں رخصت ہوگیا جو اپنی ہدایت اور رہنمائی سے گم کردہ راہوں کو راہ راست دکھاتا رہا۔وہ شمع فروزاں خاموش ہوگئی جس کی روشنی سے علم ومعرفت کا ہر گوشہ منور تھا۔مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات تنہا ہندوستان کا نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کا حادثہ ہے۔اور اس حادثہ پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

آسمان راحق بود گرخوں ببارو برزمین

ایسی جلیل القدر ہستیاں اور عہد آفرین شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں۔جو افکار وتصورات کی دنیا اور قوموں وملتوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیتی ہیں۔اور تاریخ کا نیا دور شروع کرتی ہیں،اور تعمیر وترقی کی ہر راہ میں اپنے نقش قدم رہنمائی کے لیے چھوڑ جاتی ہیں۔حق یہ ہے کہ مولانا کی وفات پر ان کی زبان سے اقبال کا یہ قطعہ آج پھر دہرایا جائے:

سرود رفتہ باز آید کہ نہ آید
نسیمے از حجاز آید کہ نہ آید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ نہ آید

ان میں فطری عظمت تھی ۔وہ فلسفیانہ فکر، مجتہدانہ دماغ اور مجاہدانہ جوش عمل رکھتے تھے ۔اور اپنے گوناگوں کمالات کے اعتبار سے ایک یکتائے عصر عالم تھے۔علم وفن کے امام ومجتہد بھی تھے ۔وہ دانائے راز حکیم ومفکر بھی ،میدان سیاست کے مدبر بھی تھے ۔اور عصر حاضر کے شاہسوار بھی ،سحر طراز ادیب بھی تھے اور جادو بیان خطیب بھی ،ذہانت وذکاوت ،فہم وفراست ،فکر وتدبر کی گہرائی ،دیدہ وری ونکتہ رسی میں ان کا کوئی معاصران کا حریف نہ تھا۔ان کی ذات پر بہت سے اوصاف وکمالات اور تاریخ کے ایک پورے دور کا خاتمہ ہوگیا۔وہ فطرتاً عبقری تھے جس راہ میں انھوں نے قدم رکھا ،اپنا راستہ سب سے الگ نکالا ۔اور ہر میدان میں اپنا الگ مقام اور امتیازی شان رکھتے تھے ۔جہاں کسی دوسرے کو بار نہ تھا۔اخلاق میں ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ وہ ادنیٰ درجے کی بات سوچ ہی نہیں سکتے تھے ۔اپنے مخالفوں کے ساتھ بھی احسان و سلوک رکھتے تھے جس پر گذشتہ دس سال کی تاریخ گواہ ہے ۔

وہ حق وصداقت کی آواز اور عزم واستقلال کے پہاڑ تھے ۔جوراہ ابتداء میں انھوں نے اختیار کی اس پر آخر تک قائم رہے ۔اس طویل مدت میں بڑے بڑے انقلابات بھی ہوئے ۔بڑے بڑے لیڈروں کے پاؤں ڈگمگائے مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی ۔ان کی نگاہ اتنی دور بین تھی کہ ۱۹۱۲ء میں جو صدا بلند کی تھی وہ بالآخر پورے ملک کی آواز بن گئی ۔اس راہ میں وہ گاندھی جی کے بھی پیش رو تھے ۔

وہ جنگ آزادی کے میر کارواں اور آزاد ہندوستان کے معمار اعظم تھے ۔ان

کے کارنامے اتنے گوناگوں ہیں کہ ان کا احاطہ دشوار ہے۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جنگ آزادی کی ابتداء سے لے کر اس وقت تک جتنے نازک مراحل پیش آئے اور جس قدر اندرونی و بیرونی پیچیدہ مشکلات ومسائل پیدا ہوئے ،ان کو حل کرنے میں مولانا کے تدبر کو بڑا دخل تھا۔ہندوستان کی تقسیم کے بعد جب پورا ملک فرقہ پرستی کے سیلاب میں بہہ نکلا تھا تو انھوں نے ہی حکومت کو اس میں گرنے سے بچایا۔اور دنیا میں ہندوستان کی سیکولرزم کی لاج رکھ لی ۔اگر مولانا کی بصیرت رہنمانہ ہوتی تو معلوم نہیں کہ ہندوستان کس راہ پر پڑ جاتا اور اس کا انجام کیا ہوتا۔چنانچہ آج بلاتفریق مذہب وملت سارے ان کے غم میں سوگوار ہیں۔‘‘

(معارف مارچ ۱۹۵۸ء)

مولانا کی وفات پر کئی شاعروں نے ان کے مرثیے لکھے ۔ہندوستان کے مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد نے ایک طویل نظم لکھی ۔جس کا عنوان تھا۔مولانا ابوالکلام کی رحلت۔ اس نظم کے تین اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بجھ گیا اے زندگی !تیرا چراغ علم وفن
غرق ظلمت ہوگئی علم وادب کی انجمن

یوں چلا باد خزاں کا ایک جھونکا دفعۃً
رہ گیا مرجھا کے تہذیب وتمدن کا چمن

اب چمن میں اس وضع کا گل نہ کھلنے پائے گا
بوالکلام ، آزاد کا ثانی نہ ملنے پائے گا

مولانا ابوالکلام آزاد کے حالات نزہۃ الخواطر میں

’’مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی (م ۱۳۴۱ھ) نے برصغیر کے علمائے کرام کے حالات زندگی ۸ جلدوں میں رقم فرمائے ہیں۔آٹھویں جلد میں چودھویں صدی کے علماء کرام کے حالات ہیں۔یہ جلد مصنف علیہ الرحمۃ مکمل نہ کر سکے۔اور اس

دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے ۔اس جلد کی تکمیل آپ کے صاحبزادہ گرامی مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے کی ۔مولانا ابوالکلام آزاد کے حالات جو اس کتاب میں درج کیے گئے ہیں وہ مولانا حکیم سید عبدالحی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ دونوں کے تحریر کردہ ہیں ۔نزہۃ الخواطر عربی زبان میں ہے ۔تاہم اس کی پہلی چار جلدوں کا ترجمہ مولوی ابو یحییٰ امام خان نوشہرویؒ نے کیا جسے مقبول اکیڈمی لاہور نے شائع کیا ہے ۔آٹھویں جلد کا ترجمہ مولانا انوار الحق قاسمی صاحب نے کیا ہے جو دارالاشاعت کراچی ''چودھویں صدی کے علمائے برصغیر'' کے نام سے شائع ہوا ہے ۔آئندہ صفحات میں مولانا ابوالکلام آزاد کے حالات اسی کتاب سے نقل کیے جا رہے ہیں ۔عربی کتاب میں مولانا آزاد کے حالات صفحہ ۱۵ تا ۲۱ درج ہیں ۔اور سلسلہ نمبر ۷۱ ہے ۔''

(عبدالرشید عراقی)

ابوالکلام احمد بن خیرالدین کلکتویؒ

مولانا ابوالکلام آزادؒ

محترم فاضل ابوالکلام احمد بن خیرالدین کلکتویؒ ۔آپ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے دنیا میں مشہور ہوئے ۔آپ کے والد نے آپ کا نام غلام محی الدین رکھا تھا۔آپ اپنے وقت کے انتہائی ذہین لوگوں میں سے تھے۔ مکہ شہر میں پیدا ہوئے اور وہیں بلوغت کو پہنچے ۔بچپن سے ہی حصول علم میں مشغول ہوگئے ۔

اپنے بچپن ہی میں اپنے والد سے چند مسائل میں اختلاف کرلیا۔جس کی وجہ سے والد ناراض ہوگئے ۔اس بناء پر پوری ہمت اور جواں مردی کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول ہوگئے ۔اور کلکتہ ہی کے کچھ اساتذہ سے چند کتابیں پڑھیں ۔پھر بمبئی کے اساتذہ سے بھی علم حاصل کیا۔پھر جب آپ کو عربی زبان پر پورا عبور حاصل ہوگیا۔تو آپ دل جمعی کے ساتھ کتابوں کے مطالعہ میں مشغول ہوگئے ۔اور علوم میں ترقی کے لیے بھرپور کوشش کرتے رہے۔

بمبئی سے ایک ماہوار رسالہ نکالا۔پھر وہاں سے لکھنؤ آ گئے اور ندوۃ العلماء سے الندوہ نامی رسالہ کے نگران مقرر ہوئے ۔اس کی وجہ سے آپ کو لکھنؤ میں ایک زمانہ تک قیام کرنا پڑا۔ پھر شہر امرتسر تشریف لے گئے وہاں ایک ہفتہ وار رسالہ ''الوکیل'' جاری رکھنے کے لیے سرپرستی سر پر آن پڑی ۔اس غرض سے آپ نے وہاں ایک برس قیام کیا۔پھر وہاں سے کلکتہ شہر تشریف لے آئے ۔۱۳۳۰ھ میں ''الہلال'' نامی ایک ہفتہ وار رسالہ نکالا جسے پورے ہندوستان میں بہت شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ۔کیونکہ حضرت آزاد کو اظہار مطلب اور طرز بیان کی عمدگی پر پوری مہارت حاصل تھی ۔اس کے بعد ایک رسالہ ''البلاغ'' نکالا پھر ایک رسالہ ''الاقدام'' نکالا۔

چونکہ ان رسالوں میں مولانا آزاد کے تمام مضامین میں ہندوستان بالخصوص مسلمانوں کو

صحیح ملکی صورت حال سے باخبر رکھا جاتا تھا۔جس کی وجہ سے لوگ حکومت وقت کے سخت مخالف ہو گئے۔اس لیے حکومت وقت نے ۱۳۳۴ھ میں آپ کو صوبہ بنگال سے نکل جانے اور صوبہ بہار کے ایک شہر رانچی میں نظر بند رہنے کا حکم نافذ کیا کہ آپ اس شہر سے نکل کر کہیں نہ جائیں۔اور کسی قسم کا رسالہ اور پرچہ شائع نہ کریں۔

مجبوراً آپ نے خود کو صرف کتابوں کی تصنیف وتالیف،عوام کو وعظ ونصیحت،ذکر واذکار اور عبادات وتلاوت وغیرہ میں مشغول کرلیا۔ان باتوں سے بے شمار مخلوق خدا کو فائدے حاصل ہوئے۔آپ کے حکم پر لوگوں نے بچوں کے لیے درس گاہیں قائم کیں۔۱۳۳۵ھ میں انگریزی حکومت نے شہر بدری کا حکم واپس لے کر حسب مرضی ہر جگہ رہنے کی اجازت دے دی۔اس لیے مولانا حسب سابق کلکتہ لوٹ آئے۔۱۳۳۹ھ ایک بڑے مدرسہ کی بنیاد رکھی۔

یہ وہ وقت تھا جب ملک کے ہر حلقہ میں زبردست ہیجان اور شورشیں برپا ہو گئیں۔کیونکہ ترکی کی حکومت اسلامیہ عثمانیہ اور دوسرے اسلامی ممالک پر غیر مسلموں نے اپنا اثر قائم رکھنے کی تدبیریں شروع کردی تھیں۔حکومتوں والے بھی اپنے سیاسی اثرات بڑھا رہے تھے۔اور ان سب میں حکومت برطانیہ ہی پیش پیش تھی۔رولٹ کی تقریر سے اس کا اظہار ہو رہا تھا۔مسلمانوں کے لیے جانبدارانہ قانون نافذ کر رہے تھے۔اور خلافت مسلمہ جمنے کی کوشش کر رہی تھی۔چنانچہ اس تحریک میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب شریک ہو گئے۔اور لوگوں کو اپنے جادو بیان اور زبردست فصیح وبلیغ خطبوں سے مشتعل کردیا۔اور ساتھ ہی حکومت برطانیہ کے خلاف مسٹر گاندھی کی تحریک میں شمولیت اختیار کرلی۔کیونکہ گاندھی نے خلافت عثمانیہ کو گہری نظر سے دیکھا تھا۔اور مسلمانوں کے ساتھ اچھے روابط پر زور دیا اور عادلانہ حکومت کی تائید کی۔اب مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے اجنبی انگریزی حکومت کے دور سے تمام تر تعلقات کو ختم کرنے اور ان سے بائیکاٹ کرنے اور انگریزوں کے ساتھ کاروباری تمام تعلقات اور معاملات کو ختم کرنے کی پرزور تائید کی۔

مسٹر گاندھی کی انگریزوں سے بائیکاٹ کی تحریک (جو کہ آہنسا کی تحریک سے مشہور ہوئی) کی مولانا نے پرزور حمایت کی۔اور ان دعووں کو دلائل شرعیہ سے مدلل کرکے سارے

ہندی باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو زبردست جوش دلایا۔اس طرح یہ تحریک تمام لوگوں میں زبردست طریقے سے بہت مقبول ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ دوسرے اسلامی ممالک نے بھی اس تحریک کو قبول کر کے انگریزوں کے خلاف بائیکاٹ شروع کردیا۔چنانچہ اس زبردست تحریک کے مقبول عام ہوجانے کی وجہ سے انگریزی طاقت ہل گئی ۔اب مسٹر گاندھی اورخلافت اسلامیہ کے حامیوں نے زوردار طریقہ سے پورے ملک میں اپنی تحریک کو پھیلانا شروع کردیا۔اور بڑی بڑی مجالس میں زبردست اشتعال انگیز تقریریں کرنے لگے۔

حضرت مولانا آزاد نے ۱۳۳۹ھ میں ایک رسالہ ''پیغام'' نکالا۔اس تحریک موتمرالخلافہ کا مرکز آگرہ تھا۔انگریزی حکومت نے اس تحریک سے خائف ہوکر مولانا آزاد کو ۱۳۳۹ھ میں قید کردیا۔اس موقع پر مولانا نے ایک زبردست ادبی بلیغ تقریر کی ۔جس کا تمام مسلم اورغیر مسلم ملتوں کے دلوں پر اثر پڑا۔

بالآخر مقامی انگریزی حکومت نے ۱۳۴۲ھ میں آپ کو رہا کردیا۔تمام جماعتوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔اور ساتھ ہی تحریک خلافت کے لیے آپ کو صدر منتخب کرلیا گیا۔ جس نے ۱۳۴۲ھ میں دہلی میں شاندار جلسہ کر کے تمام اہل وطن کو اپنی اپنی جماعتیں ختم کر کے صرف ایک ہی جماعت میں شمولیت کی دعوت دی ۔لیکن یہ اتحاد اس شرط پر قائم کیا کہ ہر شخص اپنے اپنے مذہب اورعقیدہ پر قائم رہے ۔اس معاملہ میں کوئی کسی کو نہ چھیڑے ۔ اور مولانا آزاد موصوف کا یہی خیال اور یہی عمل ان کی آخری زندگی تک باقی رہا۔

لیکن آہستہ آہستہ ابنائے وطن میں مختلف وجوہ سے اختلاف پیدا ہونا شروع ہوگیا۔اور وہ اختلاف بالآخر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں زبردست طریقے سے پھیل گیا۔اختلاف کی آگ کا شعلہ ہر جانب بھڑکنے لگا۔یہاں تک کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں دونوں جماعتوں مسلم وغیر مسلم کے درمیان زبردست ٹکراؤ ہوگیا۔اور دونوں جماعتوں کے نمائندوں نے اپنے پرانے خیالات بدل ڈالے ۔اور وحدت قومی پر قائم رہنے سے بالکل منحرف ہوگئے۔

لیکن مولانا آزاد اپنے پرانے خیال ''متحدہ ہندوستان'' پر سختی سے قائم رہے ۔اور ہم خیال قدیم جماعت کے ساتھ چمٹے رہے ۔انتہائی صبر کے ساتھ اپنے ہم وطنوں کی اکثریت کی

تہمتوں اور الزاموں، ان کی سختیوں اور ان کی ذلت آمیز توہین کو سنجیدگی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔اور جمہور مسلمانوں کے مسلک سے آہستہ آہستہ دور ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ تمام جماعتوں سے کنارہ کش ہوکر اپنے آپ میں مشغول ہو گئے۔اس طرح سے کہ تصنیف وتالیف کے کام میں لگ گئے۔اور قرآن کریم کا اردو ترجمہ اور موجودہ زمانے کے ہم آہنگ تفسیر لکھنے لگے۔اس طرح آپ دنیاوی سیاست کے بعد دینی مصلح مشہور ہو گئے۔اور سیاسی قائد اور دینی مصلح بن گئے۔اور آپ ہر آن ان ہی تفکرات میں رہنے لگے۔کیونکہ آپ نے خلافت عثمانیہ کی بدحالی اور اسلامی جماعتوں کا اتحاد منتشر ہوتے دیکھا اور دینی اصلاح سے بددل ہوکر صرف ملکی اصلاحات کی فکر میں لگے رہے۔آپ کے اندر صرف اس وقت نشاط پایا جاتا جب عام سالانہ جلسے منعقد کیے جاتے۔

بہرصورت ۱۳۵۶ھ میں ہندوستان کے کئی صوبوں سے اپنے ہم وطن وزراء کو منتخب کرکے حکومت بنائی۔جن کے سب سے زیادہ اختیارات کے مالک خود مولانا منتخب کیے گئے۔اس میں آپ کا حکم نافذ ہوتا۔اور وزراء کے انتخاب میں آپ ہی کا مشورہ قبول کیا جاتا۔۱۳۵۸ھ تک ان وزراء نے حکومت کو کسی طرح سنبھالا دیا۔اس عرصہ میں اس کی مخالف جماعت اسلامیہ بہت قوی ہوگئی۔اور اس نے مسلمانوں کے لیے ایک نئی حکومت ''پاکستان'' بنانے کا مطالبہ کردیا۔یہاں تک کہ تمام صوبوں کے مسلمانوں نے اس مطالبہ کے منظور کرنے پر اپنی پوری طاقت صرف کردی۔لیکن مولانا ابوالکلام آزاد اور آپ کے دوسرے شرکائے کار اپنی سوچ پر قائم رہے کہ سارے ہندوستانی متحدہ ہندوستان کے لیے حکومت قائم کریں اور اپنے اتحاد کو ختم نہ کریں۔

آپ دوسرے خیال کے تمام مسلمانوں کا مقابلہ کرتے رہے لیکن مسلمانوں کی یہ سوچ بالکل کمزور ہوگئی۔اس کے باوجود مولانا آزاد اپنے خیال پر تذبذب میں پڑے بغیر قائم رہے۔۱۳۵۹ھ میں ہندوستان کے تمام سیاستدانوں نے دوبارہ ایک جلسہ عام کرکے مولانا ہی کو اس کا صدر بنایا۔اور مولانا نے اس جلسہ کے خطبہ صدارت میں ایک نئے انداز سے ادبی خطبہ دیا۔

۱۹۵۸ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی تو اس موقع پر اپنی حفاظت اور مقابلہ کا اس تحریک نے انتظام کیا۔ تو اس وقت کی حکومت نے مولانا کو بیس مہینوں کے لیے گرفتار کر لیا۔ لیکن حالات سے مجبور ہو کر حکومت نے قبل از وقت ہی مولانا کو رہا کر دیا۔ اور انگریزی سیاسی حکومت نے اس وقت کے اپنے سیاسی مشہور لیڈر راسٹیفورڈ کرپس کو جلسہ میں بھیجا تو اس جلسہ کے صدر کی حیثیت سے مولانا ہی کو اس کے ساتھ مکالمہ اور گفتگو کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس گفتگو کے دوران آپ کی ذہانت اور تجربہ کاری کھل کر سامنے آ گئی۔ بالآخر یہ مذاکرہ ناکام ہوگیا۔ ماہ رجب ۱۳۶۱ھ میں اس وقت کی سیاسی جماعتوں نے انگریزی حکومت کو صاف صاف اپنا یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ آپ لوگ اس پورے ملک کو مکمل طور سے خالی کر کے اپنے وطن چلے جائیں۔

چونکہ اس مطالبہ میں مولانا آزاد ہی صدر مجلس ہونے کی حیثیت سے پیش پیش تھے۔ اس لیے انگریزی غاصب حکومت نے اس پوری مجلس اور اس کے ارکان کو گرفتار کر کے احمد نگر کے مشہور تاریخی قلعہ میں بند کر دیا۔ اور ان کی یہ گرفتاری ۴ رجب ۱۳۶۴ھ یعنی دو ماہ کم تین برس تک رہی۔ پھر ان مہینوں میں آپ کتابوں کے مطالعہ اور جو اپنے ادبی رسالوں کی کتابت کرانے کے لیے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی صاحب کے پاس بھیجے تھے، ان کے مطالعہ میں مشغول رہے جس کی وجہ سے آپ کے دل ودماغ نے سکون وقرار پایا۔ اور ادبی انداز میں اور بھی بلندی آ گئی۔ اس قلعہ میں بند رہ کر جو آپ نے ایک کتاب تیار کی اس کا نام ''غبار خاطر'' رکھا۔

پھر شملہ میں ایک جلسہ کا انعقاد ہوا۔ اس میں بھی مولانا ابوالکلام اس جلسہ کے وکیل کی حیثیت سے پیش ہوئے۔ مگر وہ جلسہ بھی آخر ناکام ہوگیا۔ پھر مرکز میں ۱۳۶۵ھ میں ایک حکومت بنائی گئی۔ جس میں محبان وطن کے مرکزی لوگوں اور اسلامی جماعت کے لوگوں کو شریک کیا گیا۔ اس میں مولانا آزاد کو تعلیمی وزارت پیش کی گئی۔ پھر برطانیہ سے ایک وفد وہاں کے بڑے بڑے وزراء پر مشتمل آیا تاکہ حکومت برطانیہ ہندوستان کے عام سیاستدانوں، دوسری جماعتوں اور برطانوی حکومت کے درمیان اس پر گفتگو کر کے ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کیا جا سکے۔ اس موقع پر مولانا آزاد نے تمام لوگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے بہت طویل

اور اہم گفتگو اس انداز سے فرمائی جس میں آپ کی ذاتی قابلیت اور انتہائی دانشمندی کا مظاہرہ ہوا۔

لیکن مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں دوسرے تمام مسلمانوں نے صرف تقسیم ہند کے مطالبہ پر اصرار کیا کہ پاکستان نامی ایک مستقل ریاست مسلمانوں کے لیے قائم کی جائے جس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوسکتا ہے۔ جب کہ مولانا آزاد اس کے سخت مخالف اور اپنے پرانے خیال پر تھے۔ بالآخر اکثر دوسرے بڑے لیڈروں اور سیاستدانوں نے بھی ان کی تائید کردی۔ اور تقسیم ہند کے مطالبہ کو تسلیم کرلیا گیا۔

اس کے بعد ہی پورے ملک میں زبردست ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ اس طرح سے کہ گویا پورا ملک انسانوں کا مذبح اور انسانی جانوں کو پیسنے کی جگہ بنی ہوئی ہے۔ جس کے ذکر ہی سے انسانوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور ہوش وحواس ختم ہوجاتے ہیں۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں مولانا بالکل خاموش ہوگئے۔ اور ان کی ہمت جواب دے گئی۔ مجبوراً اپنے گھر میں خاموش ہوکر بیٹھ گئے۔ اور صرف اصلاحی مجلسوں کے ایک رکن کی حیثیت سے ملکی شعبہ تعلیم کے وزیر کی حیثیت سے قائم رہے۔ صرف اہم کاموں سے متعلق رہ کر دوسرے تمام معاملات سے قطع تعلق کرلیا۔

بالآخر آپ کا آخری وقت قریب آگیا کہ شعبان کی پہلی شب ۱۳۷۷ھ بمقام دہلی خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللھم اغفر لہ وارفع درجاتہ فی اعلی علیین (آمین)

اس کے بعد بے شمار مسلمانوں نے آپ کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔ اور دہلی شہر کے اس میدان میں دفن کیے گئے جو جامع مسجد کے سامنے ہے۔

بلاشبہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تنہا ذات کے اندر بہت سی شخصیتوں اور خواص کے حامل ہیں۔ اور آپ کی زندگی میں بے شمار نشیب وفراز اور سکوت وہلچل ہیں۔ آپ کے بارے میں ممالک عربیہ تک کے اخبار میں ذکر پھیلے ہوئے ہیں۔ اور آپ کی لیاقت اور عقل مندی کا جامعہ ازہر تک شہرہ تھا اور ہے۔ آپ کے حالات پر گہرائی کے ساتھ غور کرنے سے تاریخ

کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے ان کی تصدیق مشکل ہوتی ہے۔ اور آپ کی زندگی میں جس طرح ناپسندیدہ اور خوش کن حالات گزرے ہیں۔ ان کو اکٹھا کرنا اور ان کو جمع کر لینا بھی بہت مشکل کام ہے۔ ویسے آپ کی کتاب ''تذکرہ'' میں بھی بہت کچھ مواد موجود ہے۔ آپ سے خاص تعلق رکھنے والوں نے بہت سی چیزیں اور ان کی تفصیل بالخصوص آپ کے خاندان اور اجداد کے بارے میں اکٹھی کردی ہیں۔ آپ کے خاندانی اعزاز واکرام اور آپ کی دعوت اور قول حق میں پختگی کے بارے میں ایسی باتیں جمع کردی ہیں جن سے تاریخ ہند اور حالات علماء سے متعلق عام افراد واقف نہیں ہوسکتے ہیں۔ اور نہ ہی ان باتوں پر لوگ اعتماد کرسکتے ہیں۔ بلکہ بہت سے ناقدین نے ان کو موضوع بحث بھی بنالیا ہے۔

بہرحال بلاشبہ آپ ایک عظیم الشان اور زمانہ میں کمیاب تھے۔ اپنی سمجھ ذہانت و ذکاوت سے بہت جلد نتیجہ تک پہنچ جانے والے، اپنی ذات پر اعتماد کرنے والے، اس کی اہمیت اور عزت نفس کو سمجھنے والے، اپنی رائے اور عقیدہ پر سختی کے ساتھ جمے رہنے والے، بنیادی خیال پر ثابت قدم رہنے والے، زیادتی سے انکار کرنے والے، گری ہوئی باتوں سے بہت دور رہنے والے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد جسمانی لحاظ سے بہت ہی خوبصورت، چمکدار، گورے بدن سرخی لیے ہوئے، لانبے قد، داڑھی کے بال کم، اچھے لباس اور اچھی شکل وصورت والے، معاملات میں بہت نازک مزاج، نرم گفتگو، کتابت، خطابت وگفتگو میں بہت ہی عمدہ، صحیح وفصیح الفاظ کو چھانٹ چھانٹ کر استعمال کرنے والے، قوی حافظہ، بہت سی یادداشتوں کو باقی رکھنے والے، برمحل عمدہ سے عمدہ ابیات واشعار کو استعمال میں لانے والے، قرآن مجید سے بہت مناسب آیات کا بروقت انتخاب کرنے اور ان کو دلیل میں پیش کرنے والے، خطبہ دیتے وقت بجلی گرانے والے، بہت ہی بلاغت کے ساتھ لکھنے والے، صحافت میں نڈر، سیاست میں صحیح سوچ اور ذہن کے ساتھ سالم، تاریخی اور ادبی کتابوں مختلف خبروں اور شہروں کے حالات سے پورے طور پر واقف رہنے والے، جس معاملہ میں بھی ان سے مذاکرہ ہوتا، وہ بہتر طور پر اس سے عہدہ برآ ہونے والے اور سینہ میں سب کو محفوظ رکھنے

والے ،جس موضوع پر بھی وہ گفتگو کرتے ، سننے والا سمجھتا کہ ان کا خاص علمی موضوع یہی ہے۔عقیدہ کے پختہ اور تقلید کرنے کو چھوڑے ہوئے یہاں تک کہ اپنے والد کے عقیدہ اور عمل کی کھلم کھلا مخالفت کرنے والے ،چونکہ خود شیخ طریقت تھے یعنی والد کی تمام رسموں اور بدعتوں سے بیزار تھے۔

آپ نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد حافظ ابن القیم کے مذہب کو ترجیح دی تھی ۔اس کے باوجود کچھ لوگوں سے بیعت بھی لیتے تھے۔اوران کی طریقت میں رہبری فرماتے تھے ۔اور علوم عقلیہ میں سے جو کچھ اپنی جوانی کے زمانہ میں معقولیوں اور سید احمد خان اور ان کے ہمنواؤں کی کتابیں پڑھی تھیں ،ان کو ترجیح دیتے ۔اور انہیں سے متاثر بھی تھے ۔اس کے باوجود سیاسی اور علمی میدانوں میں ان کا معارضہ بھی کرتے ۔

مولانا بہت ہی ذہین تھے اور بہت سی آیات قرآنیہ کو بہت عمدہ طریقہ سے سمجھاتے اور اپنے خاص ادبی نئے انداز کی تفسیر فرماتے ۔جو نوجوان طلباء کو بہت پسند آتیں ۔آپ کی ذہانت آپ کے علم پر سبقت لے جاتی ۔اور آپ کی قوت بیان آپ کی علمی گہرائی پر غالب آتی ۔متقدمین کی کتابوں پر آپ کی نظر بہت وسیع تھی ۔آپ کی کتاب ''تذکرہ'' آپ کی زندگی کی ترجمان تھی ۔اور اسلاف کے حالات پر آپ کا ''تذکرہ'' نامکمل رہ گیا تھا۔اسی طرح '' غبارِ خاطر''اور'' کاروان خیال''میں آپ نے اپنے مختلف ادبی مضامین کو جمع فرمایا تھا۔اور یہ سارے مضامین آپ نے مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے حوالہ کر دیئے تھے ۔ان کے علاوہ دوجلدیں ترجمہ وتفسیر قرآن مجید،ان کے علاوہ آپ کے دوسرے بہت سے رسائل اور مضامین سیاسیہ اور اجتماعیہ بھی ہیں ۔

(چودھویں صدی کے علمائے برصغیر ص ۶۴ تا ۶۷)

باب نمبر۲

مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی محض ایک فرد کی زندگی ہی نہیں بلکہ پورے ایک عہد کی داستان ہے۔ان کی زندگی کے ماہ وسال ہماری تاریخ میں اس طرح تحلیل ہوگئے ہیں کہ اس زمانے کے واقعات اوران کے پس منظر کو سامنے رکھے بغیر ان کی صحافتی عظمت کو سمجھنا مشکل ہے۔

مولانا ایک خاص ذہن اور دماغ کے ساتھ صحافت کے آسمان پر اس وقت طلوع ہوئے جب ہماری فضائے ادب روشن اور تابناک ستاروں سے مزین تھی ۔اردو کے عناصر خمسہ میں سے حالی ،شبلی ،اور نذیر احمد زندہ تھے۔لیکن مولانا نے بقول شخصے :

''دہلیز پر قدم رکھتے ہی نقارے پر ایسی چوٹ لگائی کہ سب کے کان ان ہی کی طرف لگ گئے ۔اور سب کی نگاہیں ان ہی کی طرف اٹھ گئیں ۔''

علامہ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں کہ:

''مولانا آزاد اپنی فطری اُفتاد، اپنے فکر وتصور، اپنے رجحانات ومیلانات اور ذہنی اکتسابات کے تنوع کے لحاظ سے اس قدر غیر معمولی انسان تھے کہ بیک وقت نہ ہم ان کے جملہ فضائل وخصائص کا احصاء کر سکتے ہیں ،نہ ان کے دماغ کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے ان کی ادبی ،علمی ،مذہبی ،صحافتی خصوصیات کے درمیان کوئی حد فاصل قائم کر سکتے ہیں ۔''

(ماہنامہ آج کل دہلی ابوالکلام نمبر اگست ۱۹۵۸ء)

مولانا کی زندگی کا بڑا حصہ سیاسی صحافت کے میدان میں گزرا۔انھوں نے بہت سے رسالوں میں مضامین لکھے ۔ بہت سے رسالوں کے مدیر یا مدیر معاون کی حیثیت سے کام کیا۔ اور کئی ادبی وسیاسی رسائل خود بھی جاری کیے [illegible] میں ان رسائل واخبارات کی

تفصیل بہ ترتیب ماہ وسال بیان کی جاتی ہے جن سے مولانا آزاد کا تعلق رہا۔

خدنگ نظر

یہ ماہوار رسالہ ۱۸۹۷ء میں منشی نوبت رائے نے لکھنو سے جاری کیا تھا۔اس میں مولانا آزاد کے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین آہ اور دونوں بہنوں آرزو (فاطمہ) اور آبرو (حنیفہ) کی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ کچھ عرصہ بعد اس میں طرحی غزلوں کے علاوہ قسط وار ناول بھی چھپنے لگا۔۱۹۰۰ء میں ''خدنگ نظر'' میں مضامین بھی چھپنے شروع ہو گئے۔مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا بیان ہے کہ اس کے نثری حصے کی ترتیب مولانا آزاد کے ذمے تھی۔

نیرنگ عالم

مولانا نے زندگی میں جو پہلا رسالہ جاری کیا وہ ماہنامہ ''نیرنگ عالم'' تھا۔اور یہ رسالہ کلکتہ سے جاری کیا۔اور ۱۸۹۹ء میں اس کا اجراءعمل میں آیا۔اور یہ رسالہ ہادی پریس کلکتہ میں چھپتا تھا۔اس وقت مولانا کی عمر گیارہ سال تھی۔''نیرنگ عالم'' ایک برس بھی نہیں چلا اس سے پہلے ہی بند ہو گیا۔

المصباح

۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو مولانا نے کلکتہ سے ہفتہ وار ''المصباح'' جاری کیا۔یہ اخبار مصر کے اخبار ''مصباح الشرق'' کی تقلید میں جاری ہوا۔یہ اخبار صرف تین چار ماہ جاری رہا۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری رقم طراز ہیں کہ:

''مولانا آزاد نے ''المصباح'' کے اجراء کا زمانہ ۱۹۰۰ء کا اواخر اور عید الفطر کے موقع پر اس کے پہلے نمبر کی اشاعت کا تذکرہ کیا ہے۔لیکن عید الفطر چونکہ ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو ہوئی تھی۔اس لیے یہ خیال ہوتا ہے کہ اسی تاریخ کو ''المصباح'' کا پہلا نمبر شائع ہوا ہوگا۔محض اندازے سے زمانے کے تعین میں چند دن کا فرق پڑ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد۔ایک شخصیت،ایک مطالعہ،ص ۱۸۶)

مالک رام اپنے ایک مضمون ''مولانا آزاد بحیثیت صحافی'' میں لکھتے ہیں کہ:

''نیرنگ عالم'' اور ''المصباح'' دونوں مشق کی ذیل میں آتے ہیں۔ اور یہ دونوں پرچے بھی ایک طرح سے مولانا آزاد کی صحافتی زندگی کے لیے گویا مشق کا حکم رکھتے ہیں۔''

(ابوالکلام آزاد مرتبہ افضل حق قرشی ص ۳۱۲)

رسالہ محمدیہ

یہ ماہوار رسالہ کان پور سے شائع ہوتا تھا۔ مولانا ابوالکلام چند ماہ اس کے مدیر رہے۔ اور یہ زمانہ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ ہے۔ جناب افضل حق قرشی نے اپنی کتاب مولانا ابوالکلام آزاد (ادبی و شخصی مطالعہ) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

تحفہ احمدیہ

اس رسالہ سے مولانا آزاد کا تعلق ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۰ء تک رہا۔ اس کا تذکرہ جناب رشید الدین خاں نے اپنی کتاب ابوالکلام آزاد (شخصیت، سیاست، پیغام) میں کیا ہے۔

احسن الاخبار

۱۹۰۱ء میں سید احمد حسن نے کلکتہ سے ''احسن الاخبار'' جاری کیا۔ یہ اخبار ہفت روزہ تھا۔ مولانا ابوالکلام کا تعلق اس اخبار سے جنوری ۱۹۰۲ء میں قائم ہوا۔ مولانا اس اخبار کو مرتب کرتے تھے۔ اور اس کے ساتھ اس میں ان کے اپنے بیشتر مضامین بھی شائع ہوئے۔ اس اخبار سے تعلق ہونے کی وجہ سے مولانا کو ان عربی رسائل و اخبارات پڑھنے کا موقع ملا جو تبادلے میں مصر، قسطنطنیہ، طرابلس، اور تیونس سے آتے تھے۔ ان اخبارات میں مصر کے ''الہلال'' اور ''المنار'' نے بہت متاثر کیا۔ جس کا انھوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ بعد میں جب مولانا آزاد نے اپنی زندگی کا اہم ترین ہفت روزہ نکالا تو اس کا نام ''الہلال'' ہی رکھا۔ ''احسن الاخبار'' تقریباً دو سال جاری رہا۔

ایڈورڈ گزٹ شاہ جہان پور

۱۹۰۳ء میں مولانا کو ایڈورڈ گزٹ شاہ جہان پور کی ادارت سپرد کی گئی۔اس اخبار سے کتنا عرصہ تعلق رہا۔یہ معلوم نہیں ہو سکا۔

لسان الصدق

۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو مولانا نے ماہنامہ ''لسان الصدق'' جاری کیا۔مولانا کی اس وقت عمر ۱۵ سال تھی۔اس کے پہلے شمارے کے پہلے صفحہ پر رسالے کے چار حسب ذیل مقاصد بیان کیے گئے تھے:

۱۔ سوشل ریفارم۔یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا۔

۲۔ ترقی اردو۔یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرے کو وسیع کرنا۔

۳۔ علمی مذاق کی اشاعت، بالخصوص بنگال میں۔

۴۔ تنقید۔یعنی اردو تصانیف پر منصفانہ ریویو کرنا۔

مالک رام نے ''لسان الصدق'' پر بڑے اچھے اور عمدہ الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''جب یہ ماہنامہ جاری ہوا ہے تو مدیر محترم کی عمر ۱۵ سال سے کچھ ہی زیادہ تھی، یہ عمر اور پرچے یہ بھاری بھرکم مقاصد پھر یہ محض دعاوی ہی نہیں ہیں بلکہ انھوں نے واقعی ''لسان الصدق'' کو اسم بامسمی بنادیا۔اس کے مضامین کا معیار اتنا معتبر اور بلند تھا اور تحریر کا انداز ایسا دلکش کہ اس نے فوراً صف اول کے پرچوں میں جگہ حاصل کرلی۔''ستارہ درخشندہ و ماہ کامل شد۔''اس پر اس دور کے بعض پرانے اور مشہور جرائد میں بہت اچھے تبصرے شائع ہوئے۔اس کے مضامین میں لہجے کی متانت اور اسلوب کی ثقاہت سے بیشتر پڑھنے والوں کو خیال ہوا کہ مدیر کوئی معمر، سال خوردہ اور تجربہ کار بزرگ ہیں۔اس رسالے نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔انجمن حمایت اسلام لاہور اس دور کا مشہور ادارہ

تھا۔آج بھی ہے۔اس کے سالانہ اجلاس بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتے تھے۔ اہل انجمن باہر کے صاحب علم حضرات کو خاص دعوت دے کر اس میں تقریر کرنے کو بلاتے ہیں۔''لسان الصدق'' کے مضامین کے معیار اور خطیبانہ انداز نے انجمن حمایت اسلام کے اصحاب مجاز کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے ۱۹۰۴ء کے سالانہ جلسے کے لیے انہیں لاہور آنے اور اجلاس سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔انھوں نے خیال کیا کہ حضرت مدیر کوئی عمر رسیدہ عالم دین بزرگ ہوں گے۔تصور کیا جاسکتا ہے کہ جب ابوالکلام کی شکل میں ایک ۱۵۔۱۶ سال کا بے ریش و بروت لڑکا ان کے سامنے پیش ہوا تو ان پر کیا گزری ہوگی۔بارے اگلے دن مولانا آزاد کی تقریر سے انہیں مایوسی نہیں ہوئی کیونکہ اس کے اگلے دن ان سے پھر تقریر کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ان کی تقریر کا موضوع تھا۔''تبلیغ اسلام کا طریق کار'' یہ اجلاس یکم اپریل ۱۹۰۴ء تک ہوئے تھے۔

اس موقع پر مولانا آزاد کی ملاقات مولانا حالی مرحوم سے ہوئی۔اس کا قصہ بھی بڑا پُر لطف ہے۔مولانا آزاد انجمن کے اجلاس شروع ہونے سے ایک دن پہلے لاہور پہنچ گئے تھے۔اسی دن وہاں ان کی ملاقات مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی سے ہوئی۔سلیم کو جب معلوم ہوا کہ یہی ''لسان الصدق'' کے مدیر شہیر ہیں تو انھوں نے بجا طور پر اسے عجائب عالم میں سے خیال کیا۔وہ انہیں مولانا حالی کے پاس لے گئے جو جلسے میں شرکت کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔جب سلیم مولانا آزاد کو لے کر حالی کی خدمت میں پہنچے تو تعارف سے پہلے انھوں نے حالی سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں ان کی عمر کیا ہوگی۔حالی کا حزم واحتیاط معلوم ہی ہے۔انھوں نے تامل سے جواب دیا۔ابھی بہت کم سن ہیں۔۔اس پر سلیم نے اصرار کیا کہ نہیں فرمایئے آپ کے خیال میں کیا عمر ہوگی۔بالآخر مولانا حالی نے کہا یہی ۱۵۔۱۶ سال کی ہوگی۔اب سلیم نے انہیں بتایا کہ یہی ''لسان الصدق'' کے مدیر ہیں۔یہ پرچہ مولانا حالی کی نظر سے گزرتا تھا۔اور وہ

اس کے مضامین کے مداح تھے۔ساری دنیا کی طرح وہ بھی یہی گمان کرتے
تھے کہ رسالے کے ایڈیٹر کوئی تجربہ کار عالم صحافی ہوں گے۔یہ معلوم کر کے
انہیں بہت تعجب ہوا کہ یہ نوعمر صاحبزادے اس ماہنامے کے ایڈیٹر ہیں۔اس
دن جو تعلقات دونوں میں قائم ہوئے امتداد زمانہ سے ان میں استواری آئی
اور ایک دوسرے سے تعلق عزت اور محبت کے جذبات میں اضافہ ہوتا گیا۔
افسوس کہ ''لسان الصدق'' نے بھی کوئی ۱۸ مہینے میں دم توڑ دیا۔مولانا آزاد کی
سیمابی فطرت انہیں کوئی کام جم کر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔اس پر
ان کا اکثر سفر میں رہنا، اس سے پہلے پرچے کی باقاعدہ اشاعت پر اثر پڑا۔
بعض اوقات دو دو مہینوں کے لیے صرف ایک شمارہ شائع ہوا۔اس کا کچھ اندازہ
اس سے ہوگا کہ نومبر ۱۹۰۳ء کے بعد دسمبر کا شمارہ شائع ہوا تو اس کی پہلی جلد کی
تکمیل کا اعلان کر دیا گیا۔۱۹۰۴ء کے پورے سال میں صرف ۹ شمارے شائع
ہوئے۔اور اس سال کا آخری پرچہ بھی اگست اور ستمبر کا مشترکہ شمارہ تھا۔اس پر
دوسری جلد ختم ہوگئی۔۱۹۰۴ء میں ایک ہی پرچہ شائع ہوا جو اپریل اور مئی کا
مشترکہ شمارہ تھا۔اس کے بعد ''لسان الصدق'' بالکل بند ہوگیا۔''

(ابوالکلام آزاد مرتبہ افضل حق قرشی ص ۱۳۳، ۱۳۴)

''لسان الصدق'' کی ادارت کے زمانہ میں مولانا آزاد کی شہرت دور دور تک پھیل گئی
تھی۔اور لوگ ان کے مداح بن گئے تھے۔لسان الصدق کی اہل علم نے بہت تعریف
وتوصیف کی۔ڈاکٹر عابد رضا بیدار رامپوری لکھتے ہیں کہ:

''لسان الصدق مولانا کی اب تک کی صحافتی ریاضت کا پہلا حاصل اور پہلا
باقاعدہ رسالہ تھا۔اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت کے چند گنے چنے
معیاری پرچوں میں سے ایک تھا۔اچھا کاغذ، خوبصورت کتابت، اس نے علمی
دنیا میں اپنا وقار بلند کر لیا۔''

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری لکھتے ہیں کہ:

''لسان الصدق'' مولانا آزاد کی ادارت میں نکلنے والا پہلا رسالہ تھا، جو علمی، ادبی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح اور ترقی کے اہم مقاصد کے تحت جاری کیا گیا تھا۔ اور پہلے پرچے سے لے کر آخری پرچے تک اس کے تمام مضامین اور ان کا ایک ایک لفظ ان مقاصد کا ترجمان اور ان کے حصول کا محرک ثابت ہوا۔

اس کے مقاصد کی اہمیت کے اعتراف سے اس وقت کی ادب وصحافت کی پوری دنیا گونج اٹھی تھی۔ اس کے موضوعات کی اہمیت، مضامین کی افادیت، اسلوب کی دلربائی اور ترتیب وتدوین کے حسن نے وقت کے تمام اہل ذوق کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

''لسان الصدق'' کے اجراء سے مولانا کے پیش نظر زبان وادب اور تنقید میں ذوق کی تسکین وتربیت اور معاشرتی اصلاح کے جن مقاصد کا حصول تھا۔ ان کا ہر جز جس طرح اس وقت لائق توجہ تھا، اسی طرح آج بھی ان کی اہمیت اور افادیت مسلم ہے۔ ''لسان الصدق'' میں علمی شان نظر آتی ہے۔ اس کے مشمولات کی ترتیب وتہذیب وقت کی معیاری علمی صحافت کے مطابق ہے۔''

''لسان الصدق'' مولانا نے ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو جاری کیا۔ اور اس کا آخری شمارہ اپریل مئی ۱۹۰۵ء کے مشترکہ۔ شمارہ کے طور پر شائع ہوا۔ یعنی اس کی کل عمر ۱۸ ماہ بنتی ہے۔ اور شماروں کی تعداد (۱۲) بنتی ہے۔

''لسان الصدق'' کے تمام شمارے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے ایک جلد میں فوٹو لے کر اپنے تعارف، پیش لفظ اور ''لسان الصدق'' کے مقاصد وخدمات پر ایک نظر کے ساتھ شائع کر دیئے ہیں۔ صفحات کی معمولی تعداد ۴۰۰ ہے۔ اور ناشر مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان کراچی ہے۔

ڈاکٹر شاہ جہان پوری نے کتاب کے شروع ''لسان الصدق'' کا مکمل اشاریہ بہ ترتیب موضوعات شائع کر دیا ہے۔ موضوعات کی فہرست درج ذیل ہے:

اردو۔ اردو شارٹ ہینڈ۔ انتقاد۔ اصلاح رسوم ومعاشرت۔ ادارے (تعلیمی، علمی،

وادبی اور سیاسی)شخصیات ۔صحافت ۔لسان الصدق اور معاصرین۔علمی خبریں۔مقالات۔ متفرقات ۔وفیات ۔اشتہارات۔

ریویو

اپریل مئی ۱۹۰۵ء کے ''لسان الصدق'' میں ایک ماہانہ رسالہ ''ریویو'' کا اشتہار ہے۔ اشتہار درج ذیل ہے:

''اردو میں اپنے ڈھنگ کا پہلا رسالہ ''ریویو'' جس کا مقصد صرف ریویو ہے۔''

یورپ کی زبانوں میں متعدد رسائل ایسے شائع ہوتے ہیں جن کا مقصد صرف ریویو ہوتا ہے ۔وہ ملک کی قابل قدر تصنیفات پر مفصل تنقید کرتے ہیں ۔مصنفین کو ضروری معلومات سے مدد پہنچاتے ہیں ۔دوسرے ملکوں سے علمی تعلقات پیدا کر کے علم دوست جماعت کے لیے وہ اسباب مہیا کرتے ہیں جن سے وہ اپنی علمی ضرورتیں آسانی سے پوری کرسکیں ۔افسوس ہے کہ اردو میں اس وقت تک کوئی رسالہ اس مقصد سے شائع نہیں ہوا۔ یہ اہم کام لٹریری رسالوں کا ضمیمہ بن کر نا قابل اور غیر موزوں حالت میں خراب ہوتا رہا۔ آج ''لسان الصدق'' اس کمی کو پورا کرنے پر آمادہ ہوتا ہے ۔۲۰ جون ۱۹۰۵ء سے ایک ماہوار رسالہ بالفعل ۱۰۱ مضمون کی ضخامت پر مشتمل بطور ضمیمہ ''لسان الصدق'' شائع ہونا شروع ہوگا۔ جس کا نام اور نام کے ساتھ مقصد صرف اور صرف ''ریویو'' ہے ۔معلوم نہیں کہ ماہانہ ''ریویو'' جاری ہوا یا نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافتی خدمات پر جو مقالات ومضامین شائع ہوئے ہیں ۔ان میں بھی ''ریویو'' نام رسالے کا ذکر نہیں آتا ۔اس کا ذکر خلیق انجم صاحب نے اپنی کتاب مولانا ابوالکلام آزاد (شخصیت اور کارنامے) میں صفحہ ۱۰۹ پر ''لسان الصدق'' کے شمارہ اپریل مئی ۱۹۰۵ء کے حوالہ سے کیا ہے۔ ''لسان الصدق'' کے اس شمارہ کے صفحہ ۲ پر اشتہار درج ہے۔

الندوہ

ماہنامہ ''الندوہ'' دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا مشہور علمی رسالہ اور اس کا نقیب تھا۔ علامہ شبلی کو اس کی اشاعت کا خیال ۱۹۰۲ء میں آیا۔لیکن جب ندوہ کی طرف سے رسالہ

نکالنا طے ہو گیا تو مجلس انتظامی کے ارکان نے مولانا حبیب الرحمان خان شروانی کو اس کا ایڈیٹر بنا دیا۔

''الندوہ'' کا پہلا شمارہ بڑی آب وتاب کے ساتھ مطبع مفید عام آگرہ میں چھپ کر اگست ۱۹۰۴ء میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ ۳۲ صفحات کا یہ رسالہ علامہ شبلی کے بلند عزائم اور عالی حوصلگی کا پورا غماز تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کا نام بطور ایڈیٹر صرف تبرک کے طور پر لکھا گیا۔ ورنہ اصل میں ادارتی ذمہ داریاں علامہ شبلی ہی انجام دیتے تھے۔

''الندوہ'' کے اجراء کا ایک مقصد طلباء دارالعلوم کی تربیت بھی تھی۔ اس لیے وقتاً فوقتاً ہونہار اور باصلاحیت اشخاص اس کے نائب ایڈیٹر مقرر کیے جاتے تھے۔ چنانچہ جون ۱۹۰۵ء میں سب سے پہلے اس کے نائب ایڈیٹر مولانا عبداللہ العمادی مقرر ہوئے۔

اکتوبر ۱۹۰۵ء تا مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد ''الندوہ'' کے سب ایڈیٹر رہے۔ علامہ شبلی نے ان کو دعوت دی تھی کہ لکھنؤ آئیں اور ''الندوہ'' کی ترتیب وتدوین میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ مولانا آزاد لکھنؤ تشریف لے گئے اور ''الندوہ'' میں سب ایڈیٹر کی ذمہ داری سنبھالی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا پہلا مضمون ''مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ'' اکتوبر ۱۹۰۵ء کے شمارہ میں چھپا۔ اس کے بعد ''المرأۃ المسلمہ'' کے نام سے مصر کے قاسم بک اور فرید وجدی نے مسلمان عورتوں کی بے پردگی پر جو کچھ لکھا تھا اس پر مفصل ومدلل تبصرہ لکھا جو ''الندوہ'' میں بالاقساط عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ۶ ماہ تک ''الندوہ'' سے وابستہ رہے۔ اس ۶ ماہ کی قلیل مدت میں مولانا نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے اس کی مثال تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ مولانا کی عمر اس وقت ۱۷ سال تھی۔

مالک رام لکھتے ہیں کہ:

''الندوہ'' ایک خالص علمی اور تحقیقاتی پرچہ تھا۔ اور ندوۃ العلماء کا آرگن ہونے کی وجہ سے اس کی ایڈیٹری بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔ چنانچہ مولانا شبلی خود اس

کے ایڈیٹر تھے۔اور وہی مجلس ندوۃ العلماء کے سامنے اس کے لیے جوابدہ بھی تھے۔مولانا شبلی جس پائے کے مصنف اور نقاد تھے اس کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔اسے مدنظر رکھتے ہوئے ان کا ۱۷ سالہ نوجوان آزاد کو ''الندوہ'' کی ادارت میں شرکت کی دعوت دینا حیرت ناک تو ہے ہی لیکن اس سے بڑھ کر یہ مولانا آزاد کے علم وفضل کی ،ان کی تحریر کے معیار اور پختگی کی ، ان کی ذاتی متانت اور رکھ رکھاؤ کی عادت کی بھی اتنی بڑی سند ہے کہ مشکل سے اس کی مثال کہیں اور ملے گی۔''

(ابوالکلام آزاد مرتبہ افضل حق قرشی ص ۳۱۵)

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی لکھتے ہیں کہ:

''الندوہ'' کے مضامین نے پورے ملک میں ابوالکلام آزاد کے نام کا ایسا غلغلہ بلند کیا کہ دنیائے صحافت میں ہر طرف سے ان کی مانگ ہونے لگی۔''

(علامہ سید سلمان ندوی شخصیت وادبی خدمات ،ص ۳۲۵)

وکیل امرتسر

اس اخبار کے مالک شیخ غلام محمد تھے۔اور ۱۸۹۵ء میں امرتسر سے جاری ہوا۔یہ پہلے ہفت روزہ تھا۔یکم اپریل ۱۹۰۱ء سے ہفتہ میں دوبار شائع ہونے لگا۔مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۰۵ء میں اس اخبار سے وابستہ ہوئے اور اپریل ۱۹۰۶ء میں علیحدگی اختیار کر کے کلکتہ چلے گئے۔دوسری بار اگست ۱۹۰۷ء میں ''وکیل'' کی ادارت سنبھالی۔اور اگست ۱۹۰۸ء میں مستقل طور پر علیحدگی اختیار کر لی۔اور امرتسر سے واپس کلکتہ تشریف لے گئے۔

مالک رام مولانا آزاد کی ''وکیل'' امرتسر سے وابستگی اور علیحدگی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''لسان الصدق'' کی ادارت کے زمانہ میں مولانا آزاد کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی اور بہت لوگ ان کے مداح بن گئے تھے۔انہیں میں سے ایک صاحب شیخ غلام محمد امرتسر کے رہنے والے تھے۔وہ اس زمانے کے مشہور سہ

روزہ اخبار ''وکیل'' کے مالک تھے جو امرتسر سے شائع ہوتا تھا۔ جب مولانا آزاد ''الندوہ'' کے ادارہ تحریر سے الگ ہوئے تو شیخ غلام محمد نے انہیں امرتسر آنے اور ''وکیل'' کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔ اس پر مولانا امرتسر چلے گئے۔ انھوں نے اپنے زمانہ ادارت میں ''وکیل'' میں بہت خوشگوار تبدیلیاں کیں۔ جس سے پرچے کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ لیکن ایک نجی حادثہ ایسا پیش آ گیا کہ انہیں بادل نخواستہ جلد ہی امرتسر سے جانا پڑا۔

مولانا آزاد کے ایک بڑے بھائی تھے۔ مولانا ابونصر غلام یٰسین آہ، دونوں بھائیوں کی تعلیم ایک ہی نہج اور معیار پر ہوئی تھی۔ ان کے والد مولانا خیرالدین کا پیری مریدی کا سلسلہ بھی تھا۔ کلکتہ اور بمبئی کے اطراف میں ان کے مریدوں کی خاصی تعداد تھی۔ وہ بڑے بیٹے غلام یٰسین آہ کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کر رہے تھے۔ آہ بھی خوبیوں میں اپنے والد کے نقش قدم پر تھے لیکن خدا کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ آہ عراق کے سفر پر گئے۔ اور وہاں بیمار ہو گئے۔ حالت خراب سے خراب تر ہو گئی تو واپس بمبئی آئے۔ تاکہ یہاں مناسب علاج ہو سکے۔ حالت سدھرنے کی بجائے اور بگڑ گئی۔ والد کلکتہ سے بمبئی پہنچے اور انہیں ساتھ لے گئے لیکن ان کا وقت اخیر کو پہنچا تھا۔ کلکتہ پہنچنے کے بعد وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ وسط ۱۹۰۶ء کی بات ہے جب مولانا آزاد امرتسر میں وکیل سے وابستہ تھے۔ مولانا خیرالدین نے انہیں لکھا کہ اب تم گھر آ جاؤ۔ اور کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ یہ ابھی جانے کی سوچ رہے تھے کہ نومبر ۱۹۰۶ء میں والد نے ایک آدمی امرتسر بھیج دیا کہ انہیں اپنے ساتھ کلکتہ لے آئے۔ اب کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا۔ یہ کلکتہ چلے گئے۔ امرتسر کا زمانہ قیام اپریل ۱۹۰۶ء سے نومبر ۱۹۰۶ء تک صرف آٹھ مہینے رہا۔ وہ والد کے حکم کی تعمیل میں مجبوراً کلکتہ چلے گئے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہاں جو کام ان کے سپرد کیا گیا وہ کسی عنوان سے ان کی پسند کا نہیں تھا۔ مریدوں کی تعلیم و تربیت، پندو

وعظ وغیرہ سے وہ کوسوں دور تھے۔ادھر اخبار نویسی کا مشغلہ ان کا دل پسند کام تھا۔شیخ غلام محمد بھی ان کے کام سے ہر طرح مطمئن اور خوش تھے۔قصہ کوتاہ چند دن بعد انھوں نے اپنے والد سے کھل کر کہہ دیا کہ میں اس پیری مریدی کے کاروبار کو جاری نہیں رکھ سکتا۔نہ مجھے یہ پسند ہے کہ لوگ آئیں اور میرے ہاتھ پاؤں کو فرط عقیدت سے بوسہ دیں۔والد سمجھ دار تھے۔انھوں نے دیکھ لیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں۔ان کی مرضی کے خلاف انہیں کسی کام پر مجبور کرنے کا فائدہ!۔انھوں نے اجازت دے دی کہ اچھا اگر یوں ہے تو پھر تم امرتسر جاسکتے ہو۔اس پر اگست ۱۹۰۷ء میں امرتسر چلے گئے۔اور دوبارہ ''وکیل'' کی ادارت کی باگ ڈور ان کے سپرد کردی گئی۔لیکن اب ان کی صورت حال جواب دے گئے۔اور وہ بیمار رہنے لگے۔سال بھر بھی مشکل سے وہاں رہے۔اور اگست ۱۹۰۸ء میں ''وکیل'' سے الگ ہوگئے۔''

(ابوالکلام آزاد مرتبہ افضل حق قرشی ص ۳۱۵۔۳۱۶)

دارالسلطنت

یہ ہفت روزہ اخبار تھا۔اور کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔اس کے مالک وایڈیٹر عبدالہادی تھے۔ان کے انتقال سے یہ اخبار بند ہوگیا۔۱۹۰۷ء میں عبدالہادی کے صاحبزادے محمد یوسف نے دوبارہ جاری کیا۔اور اس کی ادارت کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمات حاصل کیں۔مولانا نے اس کی ادارت سنبھالی لیکن آپ اس اخبار سے جلد ہی علیحدہ ہوگئے۔

الہلال

ہفت روزہ دارالسلطنت سے علیحدگی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد دوبارہ اخبار وکیل امرتسر میں آگئے۔اتنے عرصہ میں بہت سی باتوں میں تغیر پیدا ہوچکا تھا۔اور تغیرات کا سلسلہ پوری سرعت کے ساتھ جاری تھا۔اس مرتبہ مولانا کے سیاسی خیالات اور خاص طور پر

ہندوستان کے مسائل کے متعلق ان کی سوچ میں کافی تبدیلی آچکی ہے۔اگست ۱۹۰۸ء میں مولانا اخبار ''وکیل'' سے مستعفی ہوئے۔اس زمانہ میں ہی مولانا کے دل ودماغ میں الہلال جاری کرنے کا خیال پیدا ہو چکا تھا۔اورانھوں نے یہ رائے قائم کرلی کہ جومقاصد اب پیش نظر ہیں یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتے جب تک ایک طاقت وراور وسیع انتظام واہتمام کے ساتھ اپنا ذاتی اخبار نہ نکالا جائے اور اپنا ذاتی پریس نہ ہو۔

مولانا نے ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے ہفت روزہ ''الہلال'' جاری کیا۔پہلے شمارے کے صفحہ اول پر مولانا نے لکھا کہ:

''۱۹۰۶ء کے موسم سرما کی آخری راتیں تھیں۔جب امرتسر میں میری چشم بیدار نے ایک خواب دیکھا۔انسان کے ارادوں اور منصوبوں کو جب تک ذہن وتخیل میں ہیں عالم بیداری کا ایک خواب ہی سمجھنا چاہیے۔کامل چھ برس اس کی عشق آمیز جستجو میں صرف ہوگئے۔امیدوں کی خلش اور ولولوں کی شورش نے ہمیشہ مضطرب رکھا۔اور یاس وقنوط کا ہجوم بارہا حوصلہ وعزم پر غالب آگیا۔لیکن الحمدللہ کہ ارادے کا استحکام اور توفیق الٰہی کا اعتماد ہر حال میں طمانیت بخش تھا۔یہاں تک کہ آج اس خواب عزیز کی تعبیر عالم وجود کے پیش نظر ہے۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' میں ہر ممکن جدت طرازی سے کام لیا ہے۔اور ان تمام جدتوں پر عربی اخباروں اور عربی کا اثر ہے۔

''الہلال'' مختلف حیثیتوں سے اردو صحافت میں ایک نیا باب تھا۔وہ صحیح معنوں میں ہماری سیاسی،صحافتی اور ادبی تاریخ میں سنگ میل ثابت ہوا۔الہلال عصری صحافت میں محض ایک اور اخبار کا اضافہ نہ تھا بلکہ درحقیقت وہ اپنی ذات میں ایک مستقل تحریک تھا۔جس نے طوفان حوادث میں اسلامیان عالم اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی ناخدائی کا فریضہ انجام دیا۔

''الہلال'' محض ایک اخبار نہیں دراصل ایک صور قیامت تھا۔جس نے مردہ دلوں میں ایک نئی جان ڈال دی۔اس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں بیداری کی روح پیدا کی۔جو شعلہ قیامت سرد ہورہا تھا،اس کو بھڑکایا۔مولانا نے اس کے ذریعے کلمہ حق بلند کیا۔اور

جرأت وحق گوئی کی ایک روشن مثال قائم کی۔

''الہلال'' میں مذہب، سیاست، معاشیات، جغرافیہ، تاریخ، عمرانیات، سوانح، ادب اور حالات حاضرہ پر تبصرہ، مشرقی اور مغربی ممالک سے متعلق خبریں اور ان پر تبصرہ اعلیٰ معیار کے مضامین ومقالات، نئی کتابوں اور رسائل واخبارات پر تبصرے بھی شائع ہوتے تھے۔

''الہلال'' نے ہندوستان کے مسلمانوں کے معتقدات میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا۔ بیگم ڈاکٹر سید عبداللہ ''الہلال'' کے کارناموں کے متعلق لکھتی ہیں کہ:

> ''یہ اخبار مسلمانان ہند کی انقلابی سیاست کا آئینہ دار تھا۔ مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے ملکی اور بین الاقوامی امور کی آزاد ترجمانی کا شرف اس کو حاصل تھا۔ چنانچہ ترکی کے جدید انقلابات، طرابلس وبلقان کی لڑائیوں کے واقعات پھر جنگ عظیم میں ترکی کی حکمت عملی کے متعلق ''الہلال'' میں طویل بحثیں موجود ہیں۔
>
> اسی طرح ملکی سیاست میں مسلم لیگ اور کانگریس کے جھگڑے، حقوق ومراعات کے قصے اور انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی تشریحیں بھی ''الہلال'' کے اوراق میں پھیلی ہوئی ہیں۔ تعلیمی معاملات میں ندوہ اور علی گڑھ کی سرگرمیاں اور ان میں سرکار پرستوں کی دسیسہ کاریاں بھی ''الہلال'' نے اچھی طرح کھول کر واضح کی ہیں۔''

(ابوالکلام آزاد مرتبہ عبداللہ بٹ ص ۹۲)

''الہلال'' کی امتیازی خصوصیت مولانا کے طرز تحریر کی بداہت، نئی زبان اور علوم اسلامیہ پر ان کی گہری نظر تھی۔ جواہر لعل نہرو نے ''الہلال'' کی اس نئی زبان پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار ''الہلال'' میں مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا۔ یہ ایک ایسا انداز تخاطب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے۔ وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجہ سے واقف تھے۔ اور سرسید، محسن

الملک ، نذیر احمد اور حالی کے انداز بیان کے علاوہ ہوا کا کوئی اور جھونکا ان تک پہنچا ہی نہ تھا۔ ''الہلال'' مسلمانوں کے کسی مکتب خیال سے متفق نہ تھا۔ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا۔''

(ڈسکوری آف انڈیا بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ ابوسلمان شاہ جہان پوری ص ۱۸۰)

قاضی عبدالغفار صاحب لکھتے ہیں کہ:

''الہلال'' میں مولانا کے پیام کی مذہبی نوعیت ایسی تھی کہ اس نے عوام کے قلوب میں زیادہ گہرائی تک جگہ پائی تھی۔ اس لیے ''الہلال'' نے اپنی مختصر زندگی میں عوامی افکار کے لیے ایسے نقشے بنائے جو نہ صرف اخلاقی بلکہ سیاسی اہمیت رکھتے تھے۔ اسی لیے تعلیم یافتہ گروہ سے زیادہ مسلم عوام کے لیے دل پذیر تھے۔ ''الہلال'' کے صفحات پر بعض بہت اہم قومی اور مذہبی مسائل زیر بحث آتے رہے۔ جنہوں نے ملت اسلامی کے ذہنی نقشوں کو بالکل بدل دیا۔ اس انقلاب میں بلاشبہ بڑا حصہ مولانا کے زورِ قلم اور اسلوبِ بیان کا بھی تھا۔''

(آثار ابوالکلام ص ۴۳۔۴۴)

ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں کہ:

''اس صدی کے شروع میں ہندوستان کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے کے لیے اور ان کے مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکنے کے لیے تین آوازیں بلند ہوئیں۔ ایک اقبال کی بانگ درا، اور ایک محمد علی کا نعرۂ تکبیر اور ایک ابوالکلام کا رجز حریت۔''

مولانا ابوالکلام سیاست اور مذہب کو علیحدہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ دونوں کو یک جان دو قالب قرار دیتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ نہ تو حکومت پر اعتماد کیجیے اور نہ غیر اللہ کی اطاعت کیجیے۔ مولانا اعلائے کلمۃ الحق پر کاربند ہونے کی تلقین کرتے تھے۔ اور جبروتی و فرعونی طاقت وقوت کے سامنے جھکنے کو اسلام کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور اس کی کسی بھی صورت میں اجازت نہیں دیتے تھے۔ وہ حق وصداقت کے لیے جہاد کرنا اور ظلم واستبداد کے

خلاف آواز اٹھانے کو عین اسلام قرار دیتے تھے۔

مولانا ابوالکلام ہر اس شخص کو مسلمانوں کا دشمن تصور کرتے تھے جو جابر حکومت کی حمایت کرتا تھا۔ خواہ وہ شخص مسلمان ہو یا ہندو اور سکھ وغیرہ۔ اور ایسے شخص کو انسانیت، مذہب اور قوم وملت کا بدترین دشمن سمجھتے تھے۔ الہلال میں مولانا نے اپنے ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مولانا امداد صابری لکھتے ہیں کہ:

''ملت اسلامیہ کی روح غفلت میں سو رہی تھی۔ ''الہلال'' کی تحریک ودعوت پر بالآخر جدوجہد کے میدان میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ جدوجہد ایسا سفر تھی جس کی بندھی ہوئی منزلیں تھیں۔ ٹھہرائی ہوئی رسم وراہ تھی۔ مولانا نے ''الہلال'' کے ذریعے ملت اسلامیہ کی بے شمار رکاوٹوں کی نشاندہی کی۔ اور ناگزیر مشکلات کے مقابلہ کی سکت اور برداشت کی توانائی پیدا کی۔ ''الہلال'' درحقیقت نالۂ جرس تھا۔ لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔''

(امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ص ۶۳)

''الہلال'' نے اپنے پڑھنے والوں کو بین الاقوامی سیاست اور خاص طور پر اسلامی ممالک کے جنگی وسیاسی حالات سے واقف کر دیا۔ اس کے ساتھ ''الہلال'' نے ہندوستان کے عوام کو انگریزوں کی مکاریوں سے روشناس کرایا۔ اور انگریزوں کے خلاف کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ''الہلال'' نے ہندوستان کے مجاہدین آزادی کے ذہنی افق کو وسعت بخشی اور ان کے عزائم اور ارادوں کو پختگی دی۔

''الہلال'' نے ہندوستان کے مسلمانوں میں بیداری کی روح پیدا کی۔ مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا نے فرمایا تھا:

''ہم سب اصلی کام بھولے ہوئے تھے۔ الہلال نے یاد دلا دیا۔''

''الہلال'' ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی، ذہنی اور سیاسی زندگی کا ایک اہم موڑ بھی ہے۔ ''الہلال'' نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اعتصام بالکتاب والسنہ کی دعوت دی۔ مولانا

لکھتے ہیں:

''الہلال'' کا مقصد اصلی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال ومعتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی دعوت دیتا ہے۔اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں، خواہ تمدنی وسیاسی ہوں، خواہ اور کچھ، وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔اس کی صدا صرف یہی ہے کہ ''تعالوا الی کلمة سواء بینناوبینکم ''اس کتاب کی طرف آؤ جو ہم اور تم دونوں میں مشترک ہے۔اور جس سے کسی کو انکار نہیں۔

(الہلال ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء)

مولانا نے اپنی دعوت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔اور واضح طریقہ بتایا ہے کہ:

''ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل واعتقاد کے لیے بھی قرآن کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا رہنما بنائے۔وہ مسلم نہیں۔بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح، شرک فی صفات القرآن کا مجرم ہے۔اس لیے مشرک ہے۔''

(الہلال ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء)

''الہلال'' کی دعوت میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو سب سے اول نمبر پر رکھا گیا تھا۔مولانا مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

''تم تمام امتوں میں سے سب سے بہتر امت ہو کہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو، اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔خدا نے فرمایا کہ ہم نے تم کو تمام دنیا کے لیے ایک عدل قائم کرنے والی امت بنایا کہ دنیا کے لیے تم ایک گواہِ عادل کی حیثیت سے شہادت دے سکو۔''

(الہلال ۸ اگست ۱۹۱۲ء)

''الہلال'' نے ہندو مسلم اتحاد کی بھی دعوت دی۔جیسا کہ مولانا نے مجلس خلافت آگرہ کے اجلاس منعقدہ ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء کے خطبۂ صدارت میں واضح کیا۔

''الہلال'' کی تحریروں میں مولانا کا ایک نیا اسلوب نظر آتا ہے۔اس کی نثر بارُعب

اور پرجلال ہے۔عربی آیتوں اور فارسی اشعار سے عبارت کو باوقار بنایا گیا ہے۔اس میں مرصع کاری اور مترادفات کی کثرت ہے۔جس سے خطیبانہ بلند آہنگی پیدا ہوگئی ہے۔اسی لیے تو مولانا حسرت موہانی نے فرمایا تھا:

جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

''الہلال'' کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس کے دور اول میں اس کے ادارہ تحریر میں ملک کے صف اول کے مشاہیر اہل قلم شامل تھے۔اس کے ادارہ تحریر میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، خواجہ عبدالواجد ندوی، علامہ عبداللہ عمادی اور حامد علی صدیقی مولانا ابوالکلام کے معاون تھے۔

مالک رام لکھتے ہیں:

''الہلال'' کے تمام کارناموں سے قطع نظر اس کی اہمیت اور معیار کا اندازہ لگانے کے لیے صرف اس کا حیرت انگیز ادارہ تحریر ہی کافی ہے۔جو ملک کے صف اول کے ادیبوں اور انشاء پردازوں پر مشتمل تھا۔ہفتہ وار تو درکنار کسی اردو ماہنامے کو بھی آج تک ایسا شاندار ایڈیٹوریل سٹاف نہ ملا ہوگا۔''

(سہ ماہی صبح دہلی آزاد نمبر ص ۵۸)

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''روزنامہ کے لیے نہیں ایک ہفتہ وار کے لیے اتنا بڑا اور ایسا کھرا اسٹاف اُردو صحافت کی تاریخ میں کسی اور کو کب نصیب ہوا ہوگا۔''

(سہ ماہی صبح دہلی آزاد نمبر ص ۴۴)

''الہلال'' اردو صحافت میں عطیہ خداوندی تھا۔حقیقت یہ ہے کہ ہماری صحافت کی پوری تاریخ میں کسی اخبار کی ایسی حیرت انگیز مقبولیت کی مثال خال خال ہی مل سکتی ہے۔

آغا شورش کاشمیریؒ لکھتے ہیں:

''الہلال'' جب نکلا تو ابوالکلام اس کی بدولت تھے۔ابوالکلام صف اول کے

رہنماء ہوگئے تو وہ ان کے ابتدائی سوانح وافکار کی دستاویز اور ماخذ ہوگیا۔المختصر ''الہلال'' مولانا کی صحافتی معراج تھا۔اور یہ حقیقت ہے کہ ''الہلال'' سے بڑا ہفتہ وار آج ۲۱ برس بعد بھی اُردو صحافت پیش نہیں کرسکی نہ اتنا بڑا مجلّہ، نہ اتنا بڑا ایڈیٹر، اور نہ اتنا بڑا ذہنی، علمی، تاریخی، فکری اور جذباتی صحیفہ کہ جسے لوگ پڑھتے تو سر دھنتے اور دیکھتے تو مست ہوجاتے تھے۔اس کی خوبیاں اس کے ساتھ ختم ہوگئیں۔وہ پرچہ نہیں تھا، ایک عہد تھا، ایک تاریخ تھا، ایک دعوت تھا، ایک انجمن تھا، ایک تحریک اور ایک اکادمی تھا۔''

(ابوالکلام آزاد ص ۳۸۹)

حکومت وقت ''الہلال'' کی آتش نوائی اور برق آسامی کا زیادہ عرصہ تک تحمل نہیں کرسکی۔اور صرف تین سال جاری رہ کر اس کا رشتۂ حیات منقطع ہوگیا۔اس مختصر مدت میں وہ اُردو ادب کا ایک تاج محل چھوڑ گیا۔جس کے اندر شالا مار کی شادابی بھی ہے اور شیش محل کی نفاست بھی، اور جہاں سے کبھی کبھی نغمہ ناہید بھی سنائی دیتا ہے۔

''الہلال'' کی پانچویں جلد کا بیسواں شمارہ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو نکلا تھا۔اور یہی دور اول کا آخری شمارہ تھا۔اس کے بعد ''الہلال'' کا کوئی پرچہ شائع نہیں ہوا۔اس شمارے کے صفحہ ۱۹ پر ''الہلال'' پریس کی ضمانت کی ضبطی'' کے عنوان سے سب ایڈیٹر کی جانب سے ایک خبر شائع ہوئی۔جس کا متن یہ ہے:

''بنگال گورنمنٹ نے ۱۶ نومبر ۱۹۱۴ء کو ''الہلال پریس'' کی دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کرلی۔اور ''الہلال'' کے دو نمبر مورخہ ۱۴، ۲۱ اکتوبر بھی ڈبل نمبر کی صورت میں ایک ساتھ شائع ہوئے تھے ضبطی میں آئے۔بنگال گورنمنٹ نے جن مضامین کو قابل اعتراض قرار دیا ہے۔وہ ''حدیث الجنود'' اور ''سقوط انٹورپ'' ہیں۔ایک بلجئین تصویر بھی قابل اعتراض قرار دی گئی ہے جس کے نیچے قرآن مجید کی یہ آیت درج ہے۔''وما ظلمهم الله ولكن كانوا انفسهم يظلمون ''سوءِ اتفاق سے مولانا اس وقت دورے پر تھے۔ان

کی عدم موجودگی میں ضبطی اور خانہ تلاشی کا وارنٹ آیا۔ دفتر کی طرف سے ان کو اس واقعے کی اطلاع دی گئی تو انھوں نے بذریعہ تار ہدایت فرمائی کہ جو نمبر چھپ رہا ہے اس کو فوراً شائع کر دو۔ اور ایک مختصر نوٹ میں ضبطی کی اطلاع کے ساتھ یہ اعلان کر دو کہ ہم اپنی ذات سے آخر وقت تک ''الہلال'' کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اور انشاء اللہ العزیز رکھیں گے۔ اس لیے ہم حسب ہدایت اس پرچہ کو شائع کر دیتے ہیں۔ اور ''الہلال'' کی آیندہ زندگی کی قارئین کرام کو کامل توقع دلاتے ہیں۔ ﴿ومن یقنط من رحمة ربه الا الضالون﴾ (۵۶۔۱۵)

(امام الہند ابوالکلام آزاد از امداد صابری ص ۱۲۲)

مولانا امداد صابری لکھتے ہیں:

''الہلال پریس کی نئی ضمانت داخل کرنے کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ لیکن باوثوق ذرائع سے جب یہ پتہ چلا کہ حکومت نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ''الہلال'' کو نکلنے نہ دیا جائے تو ضمانت داخل کرنا محض لاحاصل معلوم ہوا۔ اور ضمانت کے مزید نقصان کے بغیر ''الہلال'' بند کر دیا گیا۔''

البلاغ

جب حکومت نے ''الہلال پریس'' ضبط کر لیا تو مولانا ابوالکلام آزاد نے کامل ایک سال کے التواء کے بعد ''البلاغ'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو شائع ہوا۔ اور اس کا آخری شمارہ ۱۷، ۲۴، ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء کی مشترکہ اشاعت تھی۔ ''البلاغ'' صرف پانچ ماہ جاری رہا۔ البلاغ، الہلال کی بدلی ہوئی شکل تھی۔ لیکن اس میں ''الہلال'' کا طمطراق باقی نہیں تھا۔ ''الہلال'' میں سیاست پر زور تھا۔ ''البلاغ'' مذہبی تبلیغ کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس میں ادب، تاریخ، مذہب اور معاشرت کے مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ ''البلاغ'' کے صرف گیارہ شمارے شائع ہوئے اور اپنی مختصر مدت میں ''البلاغ'' تاریخ صحافت میں اپنا دائمی نقش ثبت کر گیا۔

''البلاغ'' کا نصب العین وہی تھا جو ''الہلال'' کا تھا لیکن طریق ''البلاغ'' کچھ

مختلف تھا۔ ''الہلال'' حرکت وعمل اور جوش وولولہ کا پیام رساں تھا۔اور ''البلاغ'' فکروبصیرت اور روحانی عزم وثبات کا پیام تھا۔''الہلال'' کے مقابلہ میں ''البلاغ'' کی پالیسی کچھ نرم تھی لیکن حکومت کو ''البلاغ'' کی پالیسی بھی گوارانہ ہوئی۔لیکن اس مرتبہ پریس کو بند کرنے یا اخبار پر ہاتھ ڈالنے کے بجائے یہی مناسب سمجھا گیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ''البلاغ'' سے الگ اور کلکتہ سے دور کر دیا جائے۔چنانچہ حکومت کی طرف سے مولانا کو یہ حکم ملا کہ آپ کلکتہ سے نکل جائیں۔اور صوبہ بنگال کے علاوہ کسی اور صوبے کے شہر میں چلے جائیں۔مولانا ''البلاغ'' کے آخری شمارے میں لکھتے ہیں:

> ''۲۸ مارچ ۱۹۱۶ء کو گورنمنٹ بنگال کا حکم زیر دفعہ ۳ ڈیفنس ایکٹ پہنچا کہ میں چار دن کے اندر کلکتہ کا قیام ترک کر دوں۔اور حدود بنگال سے باہر چلا جاؤں بعد کو یہ مدت ایک ہفتہ تک بڑھادی گئی۔''

چنانچہ مولانا رانچی (بہار) چلے گئے۔اور اس کے ساتھ ہی ''البلاغ'' کا رشتہ حیات منقطع ہوگیا۔

اقدام

۱۹۱۵ء میں مولانا محی الدین احمد قصوری نے یہ اخبار روزنامہ کی شکل جاری کیا تھا۔مولانا آزاد اس کے نگران اور سرپرست تھے۔مولانا کے صوبہ بدر ہونے کی وجہ سے یہ اخبار بند ہوگیا۔

پیغام

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں یہ ہفت روزہ نکلا، پہلا شمارہ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو شائع ہوا۔سرورق پر لکھا ہوتا ''زیر نگرانی ابوالکلام آزاد'' لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ عبارت حذف کر کے لکھا جانے لگا اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔اس کے ۱۲۔۱۳ شمارے شائع ہوئے۔مولانا آزاد اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی گرفتاری کی وجہ سے یہ رسالہ بند بھی ہوگیا۔اس کا آخری شمارہ ۶؍ دسمبر ۱۹۲۱ء کو شائع ہوا۔

الجامعہ

یہ عربی زبان میں تھا۔اس کے مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔اورنگران مولانا ابوالکلام آزاد۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار لکھتے ہیں کہ:

اس کا پہلا شمارہ یکم اپریل ۱۹۲۳ء اور آخری شمارہ مارچ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے مدیر عبدالرزاق ملیح آبادی اور مولانا ابوالکلام آزاد نگران تھے۔اس کا مقصد اتحاد اسلامی (پان اسلام ازم) اور اتحاد مشرق تھا۔اور فوری طور سے یہ شریف حسین کے خلاف اور گویا خلافت تحریک کے سلسلے میں نکالا گیا تھا۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از عابد رضا بیدار ص ۸۵)

آغا شورش کاشمیریؒ روز نامہ اقدام'ہفت روزہ پیغام''اور''ماہنامہ الجامعہ'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالقادر قصوری کے فرزند مولوی محی الدین قصوری نے''البلاغ'' کی اشاعت کے زمانے میں''اقدام'' جاری کیا۔مولانا اس کے محرک تھے لیکن ''اقدام'' بعجلت بند ہوگیا۔پھر ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ہفتہ وار''پیغام'' جاری کیا۔ عبدالرزاق ملیح آبادی ایڈیٹر اور مولانا نگران تھے۔کل ۱۳ شمارے نکلے کہ ایڈیٹر اور نگران دونوں گرفتار ہوگئے۔''پیغام'' غفرلہ ہوگیا۔''پیغام'' کے بعض مضامین (اداریے وغیرہ) جو مولانا کے قلم سے ہیں یا بعض ہدایت نامے جو عبدالرزاق ملیح آبادی کو لکھے،انھوں نے اپنی تالیف''ذکر آزاد''میں نقل کردیے ہیں۔''الجامعہ'' کے نام سے عربی کا ایک مجلّہ نکالا،نگران خود تھے اور مدیر عبدالرزاق ملیح آبادی۔ پہلا پرچہ یکم اپریل ۱۹۲۳ء کو نکلا،آخری مارچ ۱۹۲۴ء کو۔اس دوران میں کبھی کبھار دو دو تین تین شمارے یکجا شائع ہوتے رہے۔''الہلال'' سے ملتا جلتا سائز اور ۲۴ صفحے،اس مجلّے کا نصب العین پان اسلام ازم اور مشرق کا اتحاد تھا۔لیکن اس میں سب سے زیادہ شریف مکہ کو ہدف بنایا گیا۔وہ اس مجلّے سے سخت نالاں

تھا۔اپنے زمانہ اقتدار میں اس نے ''الجامعہ'' کا داخلہ حجاز میں بند کر دیا۔اس میں پہلی دفعہ محمد علی ،شوکت علی ،اور ان کی والدہ محترمہ کا مشترکہ فوٹو شائع ہوا۔ مہاتما گاندھی کی تصویر دو دفعہ چھاپی گئی۔

(ابوالکلام آزاد۔ازشورش کاشمیری ص ۳۹۰)

الہلال کا دور ثانی

''الہلال'' دوبارہ ۱۰ جون ۱۹۲۷ء کو جاری ہوا۔لیکن اب کلکتہ کی بجائے دہلی سے شائع ہوا۔اور ۹ دسمبر ۱۹۲۷ء تک جاری رہا۔اس عرصہ میں اس کے صرف ۲۰ شمارے شائع ہوئے۔مالک رام لکھتے ہیں کہ:

''چنانچہ ''الہلال'' ثانی کا پہلا شمارہ ۱۰ جون ۱۹۲۷ء کو دہلی سے شائع ہوا۔اس کی ترتیب وتدوین کی نگہداشت بھی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے سپرد رہی۔مولانا آزاد کی اپنی مصروفیتیں ایسی تھیں کہ وہ اس دور میں اس کے لیے کم لکھ سکے۔قارئین جوان کی تحریروں کے بے صبری سے چشم براہ تھے۔اس سے بہت مایوس ہوئے۔لیکن مولانا آزاد بھی مجبور تھے۔انھوں نے اتنے کام اپنے ذمے لے رکھے تھے۔اور ہر روز ملک کے طول وعرض سے اتنے مطالبے ان کے پاس پہنچتے تھے کہ وہ انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ایسے میں وہ لکھنے کے لیے وقت کیوں کر نکال سکتے ہیں۔''

(کچھ ابوالکلام کے بارے میں ص ۶۴)

''الہلال'' نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیے۔اس پر برصغیر کے اہل قلم نے بہت کچھ لکھا ہے۔علامہ سید سلمان ندویؒ لکھتے ہیں کہ:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' نے پیدا کیا۔اور جس اسلوب بلاغت، کمال انشاء پردازی، اور زور تحریر کے ساتھ انھوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی آیتوں کو پیش کیا،اس نے ان کے لیے

ایمان و یقین کے نئے دروازے کھول دیے۔ اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔"

(معارف اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۳۲ء)

"الہلال" کے مطالعہ سے برصغیر کے مسلمان زعماء بھی متاثر ہوئے۔ اور اس کی بہت زیادہ تعریف کی۔

مولانا محمد علی فرماتے ہیں کہ:

"میں نے لیڈری ابوالکلام آزاد کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی۔"

مولانا شوکت علی فرماتے ہیں کہ:

"ابوالکلام نے ہم کو ایمان کا راستہ بتلایا۔"

اکبر الہ آبادی الہلال کے مضامین پڑھ کر یوں گویا ہوئے:

فروغِ حق کو نہ ہوگا زوال دنیا میں
ہمیشہ بدر رہے گا ہلال دنیا میں

مولانا ابوالکلام آزاد نے تین ایسے رسائل جاری کیے جو ادبی نہیں تھے اور ان کی اشاعت کے مقاصد علیحدہ علیحدہ تھے۔ یہ تین رسائل حسب ذیل تھے:

۱۔ ماہنامہ "لسان الصدق"، تاریخ اشاعت ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء
۲۔ ہفت روزہ الہلال، تاریخ اشاعت ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء
۳۔ پندرہ روزہ البلاغ، تاریخ اشاعت ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء

ان کے مقاصد اشاعت کیا تھے۔ جناب خلیق انجم صاحب لکھتے ہیں کہ:

"مولانا نے مختلف اوقات میں تین ایسے رسائل جاری کیے جو ادبی نہیں تھے۔ بلکہ خاص مقصد کے تحت نکالے گئے تھے۔ یہ تین رسالے ہیں۔ ماہانہ لسان الصدق، ہفت روزہ الہلال اور پندرہ روزہ البلاغ۔

"لسان الصدق" سرسید کے تہذیب الاخلاق کے انداز پر تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مولانا پر سرسید کا گہرا اثر تھا۔ اس لیے جب تک "لسان الصدق" جاری رہا

مولانا سرسید کے مقاصد کے فروغ کے لیے مضامین لکھتے رہے۔ اگر کوئی سرسید کے خلاف کچھ لکھتا تو مولانا کو ناگوار گزرتا۔ اور وہ سخت لفظوں میں اس کا جواب دیتے۔

ہفت روزہ ''الہلال'' اس زمانے میں نکالا گیا ہے جب مولانا کی فکر میں انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔ اب وہ برطانوی حکومت کے حمایتی نہیں، بلکہ سخت مخالف ہیں۔ ''لسان الصدق'' میں سیاسی تحریریں نہیں ہوتی تھیں۔ ''الہلال'' سیاست کے لیے وقف تھا۔ پندرہ روزہ ''البلاغ'' مولانا کے ایک اور ذہنی انقلاب کا مظہر ہے۔ رانچی میں نظر بندی کے زمانے میں مولانا کا رجحان مذہب کی طرف ہو گیا۔ اپنے خاندانی ماحول کی وجہ سے انھوں نے مذہبی علوم حاصل کیے تھے۔ انہیں عربی زبان، قرآن، تفسیر، علم القرآن اور فقہ وغیرہ پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ رانچی میں مولانا کی علمی اور دینی صلاحیتوں کو چمکنے کا موقع ملا۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از خلیق انجم ص ۱۲۰)

پیام

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۲۷ء میں ''پیام'' کے نام سے ایک اور اخبار کلکتہ سے جاری کیا تھا۔ اس کے مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری لکھتے ہیں کہ ''پیام جنوری ۱۹۲۷ء کے بعد نکلا اور جون ۱۹۲۷ء میں جب دوبارہ ''الہلال'' نکلا تو پیام اس سے پہلے بند ہو چکا تھا۔

باب نمبر۳

مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت

جنگ آزادی کی جدوجہد میں جو شعلہ نوا خطیب پیدا ہوئے ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام سرفہرست ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں بے شمار خطیب اور مقرروں کے نام نظر آتے ہیں۔ اور ان کی تقریروں کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ لیکن بیسویں صدی کے افق خطابت پر مولانا ابوالکلام آزاد جیسا خطیب اور کوئی نظر نہیں آتا۔ ابوالکلام آزاد اپنے ساتھ فن خطابت کی خوبیاں لے کر میدان خطابت میں آئے۔ عربی ان کی مادری زبان تھی۔ فارسی ادب سے فطری شغف تھا۔ اردو تو ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ اور آپ اردو کے بہترین مقرر اور خطیب تھے۔ اور ان کی تقریر میں خطیبانہ انداز کلام کے ساتھ فقرے بڑے نپے تلے ہوتے تھے۔ مولانا کی شان خطابت کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے اس جادو بیان مقرر کو تقریر کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو قدرت کی طرف سے وہ تمام صفات اور صلاحیتیں وافر مقدار میں ملی تھیں جو کامیاب خطیب بننے کے لیے درکار ہیں۔

مالک رام اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

''مولانا ابوالکلام آزاد میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو ایک کامیاب خطیب بننے کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ عالی نسبی ایسی کہ صدیوں سے ان کا خاندان زہد و ورع اور رشد و ہدایت کا مرکز تھا۔ ان کے والد مولانا خیر الدین مشائخ کے حلقوں میں معروف اور ممتاز تھے۔ مولانا آزاد خود ذاتی وجاہت اور مردانہ حسن کا نمونہ تھے۔ ان کے علم و فضل اور عربی و فارسی پر قدرت کے سب معترف ہیں۔ طلاقت زبان اور قوت بیان کے ساتھ انہیں بے مثال حافظے کی نعمت بھی

حاصل تھی۔اور یہی چیزیں کامیاب اور مؤثر خطابت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔''

(کچھ ابوالکلام کے بارے میں، ص ۷۰)

آغا شورش کاشمیریؒ لکھتے ہیں کہ:

''مولانا آزاد نے اوائل عمر ہی میں علم ومطالعہ کی وادیاں قطع کرلی تھیں، وہ موروثی خطیب تھے۔ان کے والد ایک بہت بڑے واعظ تھے۔مولانا عمر کے ابتدائی دور میں ہی تھے کہ والد نے منبر ومحراب پر کھڑا کر دیا۔اور وہ تقریر کرنے لگے۔مولانا بیس سال کی عمر میں اکابر کے لیے موجب حیرت تھے۔انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں پہلی دفعہ خطاب کیا تو مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی ہکا بکا ہوگئے۔ڈپٹی نذیر احمد نے کہا: تقریر خوب رٹی ہوئی ہے۔ڈپٹی نذیر احمد کے ان ریمارکس پر مولانا نے اعلان کیا کہ ڈپٹی صاحب جو عنوان تجویز فرمائیں میں اسی اجلاس یا اگلے اجلاس میں اسی موضوع پر تقریر کروں گا۔ڈپٹی صاحب نے موضوع تجویز کیا۔مولانا نے تقریر کی تو مجمع لوٹ پوٹ ہوگیا۔علامہ شبلی نے مولانا کے انہی کمالات پر کہا تھا ''تمہارا دماغ عجائب روزگار میں سے ہے۔''

(ابوالکلام آزاد، ص ۲۴۲)

مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت کا ہندوستان کے بڑے بڑے خطیبوں نے اعتراف کیا۔ہندوستان کے چوٹی کے خطیبوں میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا آزاد سبحانی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا سید داؤد غزنوی، مظہر علی اظہر، نواب بہادر یار جنگ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا احمد سعید دہلوی رحمھم اللہ اجمعین بلند پایہ خطیب تھے۔آغا شورش کاشمیری کے لفظوں میں:

''سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہندوستان میں عوامی خطابت کے سرتاج ہیں۔اور قدرت نے ان کی زبان میں جادو بھر دیا ہے۔بلاشبہ ان کی شیوہ بیانی میں یہ اثر ہے کہ وہ دماغوں کی سطح پر چھا جاتے ہیں۔دل ان کی طرف ایسے کھنچتے ہیں جیسے

سرمئی نگاہوں کے نشیلے ڈوروں پر زہد وتقویٰ کا اثاثہ لٹ جاتا ہے۔

قریب قریب یہی حال بہادر یار جنگ کا تھا۔لیکن بہادر یار جنگ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری سے بے انتہاء متاثر تھے۔ایک موقع پر انھوں نے فرمایا کہ:

خطابت اور زور خطابت شاہ صاحب کے گھر کی لونڈی ہے،قدرت نے اس کی عطا میں بڑی فیاضی کا ثبوت دیا ہے۔

اور مولانا محمد علی مرحوم کا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت اور اس کی اثر آفرینی کے متعلق اعتراف کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔مگر عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا یہ حال ہے کہ انھوں نے ایک گفتگو میں فرمایا کہ:

ابوالکلام آزاد صاحب طرز ادیب اور خطیب ہے۔جس نے خطابت میں طرح نو کی بنیاد رکھی۔اور قصرودربار میں کھیلی ہوئی زبان کے نسوانی لوچ کو ختم کیا۔اور عزم وعمل کا شکوہ بھر دیا۔''

(ابوالکلام آزاد مرتبہ افضل حق قرشی،ص ۳۰۵)

مولانا ابوالکلام خطابت کے شہسوار تھے۔محمد یونس خالدی صاحب اپنے ایک مضمون ''بہترین خطیب اور بلند پایہ مقرر'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ابوالکلام آزاد کی تقریر میں طنز ومزاح کا حسین امتزاج بھی ہوتا تھا۔وہ الفاظ کا جال جس طرح چاہتے تھے بچھاتے تھے۔اور جس طرح چاہتے تھے اس سے کھیلتے تھے۔اور اسالیب بیان اور مطالب بیان کی یک جہتی سے ایک ایسا قالب تیار کرتے تھے کہ ہر فقرے میں سمندر کا سکون،پہاڑوں کی سنجیدگی،آبشاروں کا ترنم اور رنگ وبو کی غیر مرئی لہریں نظر آتی تھیں۔''

(ابوالکلام آزاد مرتبہ افضل حق قرشی،ص ۳۸۶)

شورش کاشمیری مرحوم لکھتے ہیں کہ:

''مولانا آزاد میں محمد علی کی مبارزت،ظفر علی خان کی مقاومت،عطاء اللہ شاہ کی شہامت،اور احمد سعید دہلوی کی نزاکت کے عناصر نہ تھے۔لیکن وہ ہر رعایت

سے اتنے جامع الصفات خطیب تھے کہ خطابت ان کے بیان کا ہالہ تھی۔ وہ برعظیم میں فن کی رعایت سے اردو زبان کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ اور خطابت کے معنوی اوصاف میں کوئی ان کے ہم پلہ نہ تھا۔ وہ ایک ہی شخص تھے جن میں قیادت وخطابت کی رعایتوں سے ایک نادر روزگار انسان کی وہ تمام خوبیاں بیک وقت اکٹھی ہوگئی تھیں جن سے پورا ہندوستان آخر تک خالی رہا۔ وہ قدیم وجدید کے محاسن کا امتزاج تھے۔ سیاستدان، مدبر، مفکر، راہنما، ادیب، صحافی، خطیب، مفسر اور کیا کچھ نہیں تھے۔ ہر مجلس میں منفرد و یگانہ تھے۔ ان کے محاسن اتنے عظیم تھے کہ ہر حسن ان پر فخر کرتا تھا۔ ان کے علم کی بے پناہی نے انہیں عوام سے الگ کر دیا تھا۔ وہ شمع محفل کی طرح سب سے جدا اور سب کے رفیق تھے۔ لیکن اپنے دماغ سے باہر نہیں جھانکتے تھے۔ انہیں چاروں طرف ایک سپاٹ میدان نظر آتا۔ اس چیز نے انہیں سیاستاً عوام سے محروم کر دیا۔ اور وہ نتیجتاً عوام سے محروم ہوگئے۔ لیکن بڑے سے بڑا خطیب زبان و بیان میں ان کے قدم لیتا تھا۔ وہ عوام میں شاذ ہی آتے تھے۔ ادھر تحریک خلافت کے بعد ان کی کم آمیزی انتہائی شدت تک چلی گئی۔ لیکن مسلم لیگ کے شعلہ نفس مقرر بہادر یار جنگ بھی تسلیم کرتے تھے کہ انھوں نے ابوالکلام آزاد کی خطابت سے بال و پر حاصل کیے۔ ادھر سردار عبدالرب نشتر نے بھی مولانا کے خرمن خطابت کی خوشہ چینی کا اعتراف کیا تھا۔''

(ابوالکلام آزاد، شورش کاشمیری، ص ۲۴۴)

مولانا آزاد کے خطبات کے چند اقتباسات نقل کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ ملک نصراللہ خان عزیز مرحوم کی ایک مختصر تحریر پڑھیں جو انھوں نے خطبات آزاد نامی کتاب مطبوعہ ادبستان لاہور کے مقدمہ میں لکھی۔

ملک نصراللہ خان عزیز لکھتے ہیں:

''قیامت کے روز جب داورِ محشر کے سامنے مسلمانانِ ہند کا مقدمہ پیش ہوگا

تو مجھے یقین ہے کہ استغاثے کے گواہوں میں شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہید، شیخ احمد سرہندی، اورنگ زیب عالمگیر، اور ٹیپو سلطان کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی بلایا جائے گا۔ جو اس بات کی شہادت دیں گے کہ مسلمانانِ ہند کو انھوں نے ایک حیات افروز اور پیغمبرانہ انداز کے ساتھ دعوتِ حق دی، مگر انھوں نے اس آواز صور پر بیدار ہو کر میدان عمل کی طرف بڑھنے کی بجائے خود بلانے والے کو اتنا مایوس کر دیا کہ وہ ان سے منہ موڑ کر دوسری جانب روانہ ہو گیا۔"

(ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ افضل حق قرشی، ص ۳۷۹)

مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت کا شہرہ پورے ہندوستان میں پھیل چکا تھا۔ مولانا حسرت موہانی نے فرمایا تھا:

سب ہو گئے چپ بس ایک حسرت
گویا ہیں، ابوالکلام آزاد

مولانا حافظ شمس الدین شمس مولانا آزاد کی ایک تقریر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"پٹنہ کالج میں مسلم طلباء کی ایک انجمن بنام "انجمن اسلامیہ" تھی۔ ان کے ناظم و مہتمم خان بہادر مولوی محمد معین صاحب پروفیسر فارسی تھے۔ اس انجمن کے زیر اہتمام ہر مہینہ میں ایک دینی جلسہ ہوتا تھا۔ اور کوئی مقامی یا بیرونی مقرر عام طلباء کو خطاب کرتے تھے۔ یہ جلسہ عموماً پٹنہ کالج کے لائبریری ہال میں ہوتا تھا۔ مگر جب کوئی بیرونی مشہور مقرر تشریف لاتے تھے تو حاضرین کی کثرت کی وجہ سے کسی کھلی جگہ میں جلسہ منعقد کیا جاتا تھا۔ غالباً ۱۱-۱۹۱۰ء کا واقعہ ہے کہ ایک جلسہ میں علامہ شبلی بلائے گئے۔ میدان میں شامیانہ لگایا گیا۔ اور انھوں نے پٹنہ کالج کے طلباء کے سامنے تقریر فرمائی تھی۔ اور انہی کی کئی تقریریں پٹنہ کالج میں ہوئیں۔ ایک نجی صحبت میں ہم لوگوں سے انھوں نے کہا کہ ابوالکلام آزاد کو کیوں نہیں بلاتے وہ شخص تو آگ لگا دینے والا ہے۔"

یہ تھا مولانا آزاد کا غائبانہ تعارف جو علامہ شبلی کی زبان کی وساطت سے ہوا اور

پھر جن لفظوں میں مولانا کا تعارف کرایا گیا تھا وہ ایسے نہ تھے کہ بے اثر رہتے۔ تھوڑے ہی دنوں میں مولانا آزاد پٹنہ کالج میں بلائے گئے۔اور ان کی پہلی تقریر اہل پٹنہ نے سنی۔مولانا کی تقریر شام کو بعد نماز مغرب ہوئی۔ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔مولانا اس شان سے تشریف لائے کہ سیاہ لباس سر سے پاؤں تک زیب تن تھا۔شیروانی کے اوپر لمبا عربی سیاہ جبّہ اور سر پر عربی وضع کا قصابہ یا رومال بندھا ہوا جس کا ایک حصہ چہرے کے ایک طرف لٹکا ہوا، اور چہرے کے اس رخ کو چھپائے ہوئے تھا۔گویا مولانا ایک تصویر نیم رخ بن کر سامنے آئے۔سر پر عربی عقال بھی تھی یا نہیں۔ یہ یاد نہیں۔ بہرحال مولانا بالکل عربی وضع میں تھے۔رنگ نہایت گورا چٹا،سیاہ لباس میں اور بھی چمک اٹھا تھا۔تقریر شروع ہوئی اور شاید گھنٹہ سوا گھنٹہ رہی۔موضوع یاد نہیں۔مگر تقریر کا تسلسل،آواز کا اتار چڑھاؤ،سر،گردن اور ہاتھوں کی پیہم جنبش،کالی آستینوں میں سے سفید ہاتھوں کا متواتر نکلنا اور گردش کرنا بس ایسا احساس ہوتا تھا کہ گویا کالی بدلیوں میں سے بجلی مسلسل چمک رہی ہے۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد۔ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری،ص ۱۹۸)

مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم اپنے ایک مضمون ''عزت نفس کا مینار'' میں لکھتے ہیں کہ:

''پٹنہ میں بڑی دھوم دھام سے طبی کانفرنس ہوئی۔غالباً مسیح الملک حکیم اجمل خان اس کے صدر تھے۔چونکہ مولانا آزاد بھی اتفاق سے وہیں (پٹنہ) میں موجود تھے۔اس لیے بعض طبیبوں نے ان سے استدعا کی کہ آپ کانفرنس میں طب یونانی کے متعلق چند کلمات کہہ دیجیے۔حکیم اجمل خان نے بھی سفارش کی لیکن مولانا تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو پورے دو گھنٹے طب قدیم اور طب جدید کے نظریوں اور طریق علاج وغیرہ پر بحث کرتے رہے۔حکیم نثار احمد صاحب نے جو کلکتہ کے مشہور طبیب ہیں اور اس اجتماع میں موجود تھے خود مجھ سے بیان کیا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تقریر میں جو باتیں بیان فرمائیں وہ

بڑے بڑے نامور طبیبوں کو بھی معلوم نہیں تھیں۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد۔ از خلیق انجم، ص ۱۳۸)

یہ ہے اس بے مثال مقرر اور عظیم خطیب کا اجمالی تعارف کہ اس جیسا عالی مرتبت اور بلند پایہ خطیب اور مقرر صدیوں سے پیدا نہیں ہوا۔ جس وقت بھی انسان کے حیطۂ تجسس میں یہ احساس اُجاگر ہو کہ مولانا آزاد کس مرتبہ کے مقرر تھے تو اس وقت زبانیں بے اختیار پکار اٹھیں گی:

نطق کو سو ناز تھے تیرے لب اعجاز پر
محو حیرت تھی ثریا رفعت پرواز پر

مولانا ابوالکلام آزاد کے جو خطبات تحریری صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب، بنگال خلافت کانفرنس منعقدہ کلکتہ فروری ۱۹۲۰ء کا خطبہ صدارت۔ (مطبوعہ البلاغ پریس کلکتہ ۱۹۲۰ء) اس کا دوسرا ایڈیشن بعض اضافوں کے ساتھ چند ماہ بعد شائع ہوا۔

۲۔ خطبہ صدارت۔ پروانشل خلافت کانفرنس (اجلاس آگرہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

۳۔ خطبہ صدارت تحریری جمعیۃ العلماء (اجلاس لاہور نومبر ۱۹۲۱ء)

۴۔ خطبہ صدارت تقریری جمعیۃ العلماء (اجلاس لاہور نومبر ۱۹۲۱ء)

یہ تینوں خطبے نمبر ۲، ۳، ۴، الگ الگ سوراج پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپے۔

۵۔ خطبہ صدارت کانگریس (اجلاس خاص منعقدہ دہلی ۱۵ ستمبر ۱۹۲۳ء) طبع ہندوستان الیکٹرک پریس دہلی۔

۶۔ خطبہ صدارت آل انڈیا خلافت کانفرنس (اجلاس کان پور دسمبر ۱۹۲۵ء) طبع محبوب المطابع مچھلی دالان، دہلی۔

۷۔ خطبہ صدارت انڈین نیشنل کانگریس (اجلاس رام گڑھ ۱۹۴۰) انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد۔

مالک رام صاحب نے "خطبات آزاد" مرتب کیے۔ اور مولانا کے ۱۵ خطبات کتاب

میں جمع کر کے ساہتیہ اکیڈمی دہلی کے زیر اہتمام جمال برقی پریس دہلی سے طبع کرا کے ۱۹۷۴ء میں شائع کیے گئے ہیں۔ خطبات آزاد کتاب کی ضخامت ۴۳۶ صفحات پر محیط ہے۔ اس میں صفحہ ۳۵۰ تک خطبات درج ہیں۔ اور صفحہ ۳۵۱ تا ۴۳۶ حواشی ہیں جو مالک رام صاحب نے تحریر کیے ہیں۔

حواشی کی تفصیل درج ذیل ہے:

صفحہ ۳۵۳ تا ۴۰۷ (حواشی کی تعداد بلحاظ نمبر ۴۳۶ ہے)

فہارس از مرتب

آیات قرآن (از صفحہ ۴۱۱ تا ۴۱۹)

احادیث نبوی (از صفحہ ۴۲۰ تا ۴۲۱)

اعلام (از صفحہ ۴۲۲ تا ۴۲۶)

بلاد و اماکن (از صفحہ ۴۲۷ تا ۴۳۱)

کتب و رسائل (از صفحہ ۴۳۲ تا ۴۳۳)

مآخذ حواشی (از صفحہ ۴۳۴ تا ۴۳۶)

خطبات آزاد کی فہرست درج ذیل ہے:

مقدمہ از مالک رام

۱۔	اتحاد اسلامی	کلکتہ	۱۲۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء
۲۔	افتتاح مدرسہ اسلامیہ	کلکتہ	۱۳ دسمبر ۱۹۳۰ء
۳۔	مجلس خلافت	آگرہ	۱۲۵ اگست ۱۹۲۱ء
۴۔	مجلس خلافت	آگرہ	۱۲۶ اگست ۱۹۲۱ء
۵۔	جمعیۃ العلماء ہند	لاہور	۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء
۶۔	جمعیۃ العلماء ہند	لاہور	۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء
۷۔	انڈین نیشنل کانگریس	دہلی	۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء
۸۔	آل انڈیا خلافت کانفرنس	کان پور	۲۹ دسمبر ۱۹۲۵ء

۹۔ جمعیۃ تبلیغ اہلحدیث	کلکتہ	ستمبر۱۹۳۴ء
۱۰۔ ہندوستانی کمیٹی بہار	پٹنہ	۱۹۳۷ء
۱۱۔ انڈین نیشنل کانگریس	رام گڑھ	مارچ ۱۹۴۰ء
۱۲۔ عربی نصاب کمیٹی	لکھنؤ	۲۲فروری ۱۹۴۷ء
۱۳۔روابط بین ایشیائی کانفرنس	نئی دہلی	مارچ ۱۹۴۷ء
۱۴۔مسلمانانِ دہلی کا اجتماع	دہلی	اکتوبر ۱۹۴۷ء
۱۵۔مہاتما گاندھی کی یادگار	نئی دہلی	فروری ۱۹۴۸ء

مولانا ابوالکلام آزاد کے مذکورہ بالا خطبات کے اقتباسات درج کرنے سے پہلے آغا شورش کاشمیری کی ایک تحریر پڑھیے۔جس میں انھوں نے ان خطبات کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''ان تقاریر وخطبات میں سے چند فقروں کا انتخاب سہل نہیں۔انتخاب ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا انحصار ہر شخص کے انفرادی ذوق پر ہوتا ہے۔اور خطبات کے کلمات اپنے زمانہ وعہد کی ذہنی فضا کو متاثر کرتے ہیں۔بالفرض ایک جملہ کل تیر بہدف تھا۔اور آج وہی جملہ تاثیر نہیں رکھتا۔وہ اگلے پڑاؤ میں متغیر ہوگیا ہے۔جس طرح کئی چیزیں پرانی ہوکر اپنی تروتازگی کو کھودیتی ہیں۔اسی طرح خطبات کے بول جو اپنے وقت میں جوان ہوتے ہیں۔اپنا زمانہ گزار کر بوڑھے ہوجاتے ہیں اور ان کا تأثر ماضی کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔''

(ابوالکلام آزاد۔ص ۲۴۸)

ذیل میں مولانا کے خطبات وتقاریر کے جو اقتباس درج کیے جارہے ہیں اس سے مولانا کی روشِ خطابت کے طریق واسلوب کا ضرور پتہ چلے گا۔

اتحاد اسلامی (کلکتہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۴)

جب سے اسلام دنیا میں موجود ہے۔یہ اخوت ووحدت بھی موجود ہے۔مگر یورپ کا جدید دسیسۂ شیطانی اس کو کسی مجہول الحال اور حدیث العہد الاسلامی اتحاد سیاسی سے تعبیر کرتا

ہے۔اور اس اضغاث احلام کی تعبیر اس کو ایک خونفشانی ہلال کی صورت میں نظر آتی ہے۔وہ کسی ایسے وقت کے تصور سے اپنے تئیں لرزاں و ترساں ظاہر کرتا ہے جب کہ تمام عالم میں چالیس کروڑ مسلمانوں کی تلواریں یکا یک چمک اٹھیں گی۔عیسائیوں سے ان کے گذشتہ چار سو سال کی مسیحی خونریزی کا حساب لیا جائے گا۔اور ''خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ'' کے نعروں کے ساتھ تمام دنیا کے درختوں پر صلیب پرستوں کی معلق اور مصلوب لاشیں، ان کے خدائے مصلوب کی لاش کی طرح لٹکنے لگیں گی۔مگر یہ یورپ کے چہرۂ خونین کا عکس ہے جو اس کو عالم اسلام کے آئینہ میں نظر آتا ہے۔

(خطبات آزاد،ص ۱۹)

اے اخوان عزیز! میں جس چیز کے اعلان سے نہیں ڈرتا۔تعجب ہے،اگر آپ اس کی سماعت سے خوفزدہ ہوں۔میں کہتا ہوں کہ ہر اس مومن پر جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اس کی کتاب پر ایمان رکھتا ہے،فرض ہے کہ آج جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔سب سے پہلا جہاد اس کے لیے جہاد مال ہے۔اور اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو جہاد نفس و جان،مال و متاع کو بھیج دو اور اپنی جانوں کو اپنی ہتھیلیوں پر تیار رکھو،آج اگر ضرورت پیش نہ آئی،تو کیا مضائقہ ہے کل کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔یہ متاع ایسی نہیں جس کی قربانی بیکار جائے۔(صفحہ ۳۴،۳۵)

خطبہ صدارت (مجلس خلافت آگرہ،۲۵اگست ۱۹۲۱ء)

﴿وَالْعَصْرِ ٥ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ٥ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ٥﴾

آپ کی تحریک خلافت ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے۔یہ ایک مقصد ہے جو فتح چاہتا ہے۔عمل چاہتا ہے۔جو لوگ مقصد اور عمل کے ڈھونڈ نے والے ہیں۔جو مقصد کے عشق میں آنسو بہانے والے ہیں۔تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ قرآن کا ہر اچھے مقصد کے لیے یہ اعلان ہے کہ اس آسمان کے نیچے نوع انسان کے لیے،انسانوں کی تلاش کے لیے،جستجوؤں کے لیے،امیدوں کے لیے بڑی بڑی ناکامیاں ہیں۔بڑے بڑے گھاٹے ٹوٹے ہیں۔

لیکن دنیا کی اس عام نامرادی سے کون انسان ہے، کون جماعت ہے جو بچ سکتی ہے۔ اور ناکامی کی جگہ کامیابی پاسکتی ہے۔ ناامیدی کی جگہ امید اس کے دل میں اپنا آشیانہ بنا سکتی ہے۔ وہ کون انسان ہے۔ وہ انسان ہے جو دنیا میں ان چار شرطوں کو قولاً اور عملاً اپنے اندر پیدا کر لے۔ جب تک یہ شرطیں پیدا نہ ہوں گی۔ اس وقت تک دنیا میں نہ کوئی قوم کامیاب ہوسکتی ہے نہ ملک حتیٰ کہ ہوا میں اُڑنے والا پرندہ بھی دنیا میں کامیابی نہیں پاسکتا۔ ان چار شرطوں کے نام سے گھبرا نہ جانا۔ اگر ایک چیز عربی بھیس میں آجائے تو کیا تم انکار کر دو گے چاہے وہ پہچانی ہوئی ہو۔

پہلی شرط وہ ہے جس کا نام قرآن مجید کی بولی میں ایمان ہے۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تم جبھی کامیابی پاسکتے ہو جب تمہارے دلوں کے اندر، روح کے اندر، وہ چیز پیدا ہو جائے جس کا نام قرآن مجید کی زبان میں ایمان ہے۔ ایمان کے معنی ہیں عربی میں زوال شک کے، یعنی کامل درجے کا بھروسہ اور علم، کامل درجے کا اقرار تمہارے دل میں پیدا ہو جائے۔ جب تک کامل درجے کا یقین تمہارے دلوں کے اندر نہ پیدا ہو، اللہ تعالیٰ کی صداقت پر، اللہ کی سچائی پر، اللہ کے اصولوں پر، جس وقت تک کامل درجے کا یقین تمہارے قلب کے اندر پیدا نہ ہوگا کامیابی کا کوئی دروازہ تمہارے لیے نہیں کھل سکتا۔ شک کا اگر ایک کانٹا بھی تمہارے دل میں چبھ رہا ہے تو تمہیں اپنے اوپر موت کا فیصلہ صادر کرنا چاہیے۔ تم کو کامیابی نہیں ہوسکتی۔ سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ تمہارے اندر ایمان، اطمینان، یقین، جماؤ اور تمکن اور قرار پیدا ہو۔ لیکن کیا محض دل کا یہ کام، دماغ کا یہ فعل، تصور کا یہ نقشہ کامیابی کو پورا کر دے گا! نہیں۔

فرمایا...... ایک دوسری منزل بھی اس کے بعد آتی ہے۔ جب تک وہ دوسری منزل بھی کامیابی کے ساتھ طے نہ کر لو گے اس ایک منزل کو طے کر کے کامیابی نہیں پاسکتے۔ اس لیے دوسری منزل یا شرط کا نام قرآن کی بولی میں عمل صالح ہے۔ (وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) یعنی وہ کام جو اچھا ہے اسے اچھائی کے ساتھ کیا جائے۔ جو کام، جس صحت اور جس طریقے کے ساتھ کرنا چاہیے جو طریقہ اس کے لیے سچا طریقہ ہوسکتا ہے اس کام کو اس طریقے کے ساتھ انجام دیں۔

قرآن کا یہ اصول تو عام ہے۔ایمان کے معنی ہیں وہ یقین، وہ کامل اطمینان، وہ کامل اقرار، جو عمل سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔جس وقت یہاں اس کانفرنس کی جگہ ایک چٹیل میدان تھا۔کوئی وجود اس شامیانے کا نہ تھا۔تمہاری خلافت کمیٹی کے ارکان نے اس وقت یہ شامیانہ نصب نہیں کیا تھا۔لیکن اس وقت بھی یہ شامیانہ مع ان چمکتی ہوئی لالٹینوں کے موجود تھا کہاں؟ ان کے دماغ میں وہ چیز جو ان کے دماغ میں موجود تھی۔وہ ارادہ جو ان کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔وہ پہلی منزل جو مذہب میں آ کر ایمان کا نام اختیار کر لیتی ہے۔پہلی چیز عمل دماغ ہے۔عمل تصور و یقین ہے۔اسی بناء پر سب سے پہلی منزل ایمان کی ہے۔پہلی چیز یہ ہے کہ تمہارے دل کے اندر سچا ارادہ پیدا ہو۔سچا عزم پیدا ہو۔دوسری منزل عمل صالحات کی ہے۔صرف دماغ کی منزل طے کر کے قدم نہ رک جائیں۔بلکہ عمل بھی کرو۔وہ عمل صالح ہو۔جو طریقہ صحیح ہے اس کے انجام دینے کا، جب اس کو پورا کر لیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ فتح مندی اور کامیابی کے دو منزلیں تم نے طے کر لیں۔

مگر کیا تمھارا کام ختم ہو گیا، اس کے بعد کیا تم منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔قرآن کی عالمگیر صداقت بتاتی ہے کہ نہیں بلکہ دو منزلوں کے بعد دو منزلیں اور بھی باقی ہیں۔اپنی ہمت کو آزماؤ، کہ ان کے لیے تمہارے تلوے تیار ہیں یا نہیں۔تمہاری کمر ہمت مضبوط ہے یا نہیں۔اگر نہیں ہے تو ممکن ہے کہ یہ دو منزلیں تمہارے لیے سود مند نہ ہوں۔وہ دو منزلیں یہ ہیں۔قرآن مجید نے فرمایا کہ ایمان اور عمل صالح آدمی کے اندر پیدا ہوا۔یعنی یہ ہوا کہ انسانیت کی جو ایک زنجیر ہے۔اس کی ایک کڑی نے اپنے آپ کو درست کر لیا۔لیکن کیا ایک کڑی کے درست کر لینے کے بعد زنجیر کا کام پورا ہو گیا۔ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔تم کیا ہو۔افراد کا مجموعہ، بکھری ہوئی کڑیوں کا ڈھیر۔اس بکھری ہوئی شکل میں بیکار ہو، اس میں تمہارا کوئی وجود نہیں۔قرآن وجود مانتا ہے اجتماع کا، قوم کا، اس کے نزدیک وجود کڑیوں کا نہیں بلکہ زنجیر کا ہے۔تم میں سے ہر وجود ایک کڑی ہے، اس کا کام پورا نہیں ہو سکتا جب تک وہ باقی کڑیوں کی خبر نہ لے، جب تک باقی کڑیاں مضبوط نہ ہوں گی زنجیر مضبوط نہیں ہو سکتی۔اس لیے فرمایا کہ کامیابی کا سفر کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک تیسری منزل تمہارے

سامنے نہ آئے۔وہ تیسری منزل فصیح و بلیغ لفظوں میں ''وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ'' ہے یعنی تم جو ایک کڑی تھے تم نے اسے ایمان کی مضبوطی سے استوار کرلیا۔لیکن تمہارا کام ختم نہیں ہوا۔تمہارا فرض ہے کہ دوسری کڑیوں کو بھی درست کرو اور انہیں اس طرح درست کرسکتے ہو، کہ جس سچائی کو تم نے اپنایا ہے۔اسے دوسروں میں بھی پھیلاؤ، جب تک تم میں یہ بات نہ ہوگی کہ تمہارا دل سچائی کے اعلان کے لیے تڑپنے لگے۔جب تک تم تواصی حق نہ کروگے کامیابی تم کو نہیں مل سکتی۔

لیکن اگر اس تیسری منزل کے لیے تم تیار ہوگئے۔اگر توفیق الٰہی نے تمہاری دستگیری کی، تو میری آخری منزل کون سی ہے۔وہ ہے جو صبر کی منزل کے لیے لازم وملزوم ہے۔اس کے ساتھ اس کی گردن اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ جدا نہیں کی جاسکتی۔فرمایا کہ حق کی وہ وصیت کریں گے حق کا وہ پیغام سنائیں گے حق کی دعوت پہنچائیں گے۔مگر حق کا یہ حال ہے کہ اس کی راہ میں کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا جب تک وہ قربانیوں کے لیے بھی نہ اٹھے۔فرمایا کہ مومن صرف حق ہی کا پیام نہ پہنچائے بلکہ صبر کا بھی پہنچائے، ہم نے اپنے طریق عمل سے شریعت کے لفظوں کو بولیوں کو بھی بدل ڈالا ہے۔صبر کے معنی کیا ہیں، تم سمجھتے ہو کہ صبر کے معنی ہیں بے غیرتی اور باطل کی پرستش اور پوجا۔تم صبر کے یہ معنی سمجھتے ہو۔لیکن جو شخص صبر کے یہ معنی سمجھتا ہے اس سے بڑھ کر قرآن مجید کی تحریف لفظی کرنے والا کوئی نہیں۔تحریف معنوی تو بہت سے علماء کررہے ہیں۔لیکن تحریف لفظی یہ ہے کہ اگر صبر کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے حق کے مقابلے میں مصیبت آجائے، تو تم کو چاہیے کہ صبر کے گوشہ میں پناہ لو۔یعنی ہر طرح کی بے غیرتی کو، بیچارگی کو، باطل پرستی کو قبول کرلو۔تو میرے بھائیو! تم سے بڑھ کر قرآن مجید کی تعلیم کو بدلنے والا کوئی نہیں۔

صبر کے معنی اس سے مختلف ہیں، صبر کے معنی برداشت کے، صبر کے معنی جھیلنے کے، صبر کے معنی تحمل کے، جو قدم تم مقصد کی راہ میں اپنے محبوب اور پیارے مقصد کے لیے اٹھاؤ، اور اس میں طرح طرح کی مصیبتیں آئیں، طرح طرح کی ڈراونی صورتیں آئیں، زنجیریں اور ہتھکڑیاں آئیں، بلکہ ممکن ہے کہ تمہارے سامنے تختہ آدے، اور اس پر ایک پھندا جھول

رہا ہو، یہ سب تمہارے سامنے آسکتا ہے۔لیکن اگر تم حق کے پرستار ہو،تو تمہارا فرض ہونا چاہیے کہ تمہارے اندر صبر ہو،جس پر دنیا کی کوئی شوکت ،کوئی تاج وتخت فتح یاب نہ ہو سکے۔ یہ معنی صبر کے ہیں ۔چنانچہ قرآن مجید کے مواقع استعمال پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوجائے گا کہ ہر جگہ صبر کے یہی معنی ہیں ۔(صفحہ ۵۸ تا ۶۲)

خطبہ اختتامیہ (مجلس خلافت آگرہ ۲۶ اگست ۱۹۲۱ء)

اسلام نے اور اسلام کے قانون نے اس نوکری کو،اس کام کو جس میں انسان کا خون بہانا پڑے ایک ایسا گناہ قرار دیا ہے جس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی زبان پر کفر کا لفظ جاری ہوا ہے ۔اسلام کے قانون نے مسلمانوں ہی کا قتل نہیں بلکہ کسی انسان کا بھی قتل کرنا اور اس کا خون بہانا،ایک بہت بڑی معصیت ،گناہ ،پاپ قرار دیا ہے ۔چنانچہ سورۃ فرقان میں فرمایا ہے وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ،یعنی وہ لوگ جو خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے ،کسی جان کو قتل نہیں کرتے جسے اللہ نے روک دیا ہے۔اور جسے اللہ نے حرام کر دیا لیکن اگر انہیں کرنا پڑتا ہے تو صرف ان جانوں کے لیے وہ قتال جائز رکھتے ہیں جن جانوں کو اللہ کی عدالت کے قائم رکھنے کے لیے سزا دینا ضروری ہے۔

اس قانون کی رو سے اگر قتل نفس جائز ہے تو صرف ان جماعتوں ،قوموں ،جتھوں کا جن کا وجود دنیا کی ہدایت وحریت کے لیے ،قوموں کے ایمان کے لیے ،سچائی کی بقاء کے لیے ایک فتنہ ہو۔قرآن کے قانون نے فتنہ وفساد کو قتال سے زیادہ سنگین قرار دیا ہے ۔ اسی طرح جس طرح ایک جج عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر پھانسی کو جائز قرار دیتا ہے ۔قاتل اس کے سامنے اس جرم میں لایا گیا ہے ۔اس نے ایک آدمی کا خون کیا ہے ۔جج حکم دیتا ہے کہ قاتل کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے ۔جج بھی قتل کرتا ہے مگر اس کا یہ قتل کرنا قتل نہیں ہے ۔زندگی کا اعلان ہے ۔قصاص میں تو فی الحقیقت زندگی چھپی ہوئی ہے ۔﴿ وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَاأُولِى الْاَلْبَابِ ﴾ اگر قاتلوں سے قصاص نہ لیا جائے ۔ اگر ظالموں سے خدا کے بندوں کو نہ بچایا جائے تو دنیا ظلم کا ایک جہنم بن جائے ۔

شریعت نے قتل نفس کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے جو دنیا میں انسان کر سکتا ہے اور اگر قتل نفس کو جائز رکھا ہے تو صرف فتنہ و فساد کے دور کرنے کے لیے اور جب کہ یہ علاج ہو جائے تو پھر اس علاج کو جائز نہیں رکھا۔

ایسی حالت میں کیونکر ممکن تھا کہ اسلام مسلمانوں کا مسلمانوں کے ہاتھوں قتل جائز رکھتا۔ اسلام نے بلا عذر شرعی مسلمانوں کے قتل کو ایک ایسی معصیت بتایا ہے کہ بمنزلہ کفر کے ہے۔ حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میرے بعد تم کافر نہ ہو جانا، کافروں کا چلن نہ اختیار کرنا اور کافروں کا چلن یہ ہوگا کہ مسلمان مسلمانوں کی گردنیں مارنے لگیں۔'' اسی طرح بخاری اور مسلم کی حدیث میں فرمایا: ''جس نے مسلمانوں پر ہتھیار اُٹھایا وہ مسلمانوں میں باقی نہیں رہا۔'' یہ اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ہے اور اس کی کوئی تاویل نہیں کروں گا۔ اسی طرح قرآن کی نص قطعی موجود ہے۔ ﴿وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾ یعنی جس شخص نے جان بوجھ کر کسی مسلمان کو قتل کیا تو اس کی جزا یہ ہے کہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں رہے۔ اور اللہ کی لعنت میں مبتلا رہے۔ (صفحہ ۷۹، ۸۰)

خطبہ صدارت (جمعیۃ العلماء ہند لاہور ۱۸ تا ۲۱ نومبر ۱۹۲۱ء)

۱۔ اسلام کے نظم شریعت میں دین و دنیا کی تقسیم نہیں ہے۔ اسلام نے شریعت الٰہی کو نوع انسانی کی تمام سعادت و ہدایت کا کفیل و سرچشمہ قرار دیا ہے۔ اور مسلمانوں کی سیاسی، علمی، اخلاقی، قومی و مدنی زندگی کی بنیاد صرف ایک ہی حقیقت جامعہ پر ہے۔ یعنی شریعت اسلامیہ اور کتاب و سنت۔

۲۔ مسلمانوں کی قومیت صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل ہے۔ شریعت نے انہیں بتلایا تھا کہ دنیا میں سب سے بڑی قوم وہی ہیں۔ وہ خَيْرُ الْاُمَمْ ہیں۔ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ہیں، وہی شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ ہیں۔ ان کے عروج و سعادت کی علت صرف یہی تھی کہ قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ کو انھوں نے اپنا دستور العمل وحیات قرار دیا تھا۔ قرآن حکیم کی نسبت صاحب قرآن کا اعلان تھا ان اللّٰه یرفع

بھذاالکتاب اقواما ویضع به آخرین (مسلم) اللہ اس کتاب کی ہدایت سے قوموں کو اٹھائے گا۔اور یہی ہے جس کو ترک کر کے قومیں گریں گی تو ہلاک ہوں گی۔اور روایت حضرت علی عند ترمذی وابونعیم والطبرانی فی الکبیر فرمایا:

"وھو الفضل لیس بالعزل من ترکه من جبار قصمه الله ومن ابتغی العلای فی غیره اصله الله الی ان قال من قال به صدق ومن عمل به اجر، ومن حکم به عدل ، ومن دعا الیه هدی الی صراط مستقیم ۔پس جب مسلمانوں نے قرآن وسنت کا علم وعمل ترک کر دیا تو اقبال وعروج نے بھی ان سے کنارہ کشی کر لی۔یہ مسلم اور حقائق تاریخی میں سے ہے کہ مسلمانوں کے عروج وزوال کا سب سے بہتر وارفع زمانہ وہی تھا۔جب بجز کتاب وسنت کے علم وعمل اور کوئی تعلیم ان کی رہنمانہ تھی۔یعنی عہد صحابہ کرام وخلفائے راشدین اولئك اصحاب محمد ابر ھذه الامة قلوبا و اعقها حکما و اقلها تکلفا، قوم اختارھم الله نصیحة نبیه واقامة دینه ظاهر فوالهم حقهم تمسکوا بهدیهم فانهم کانوا علی الهدی المستقیم (قال ابن مسعود رضی اللہ عنہم) اور تنزل وفساد کا عہد اسی وقت سے شروع ہوا جب کہ اقوام ماضیہ مغضوبہ کے علوم واعمال بشکل علوم ذخیلہ واعمال بدعیہ میں رائج ہوئے۔ایک ہی علت کے دو مختلف نتائج نہیں نکل سکتے۔بس اگر اب بھی مسلمان اپنے عروج ورفعت کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں تو اس کی صرف ایک ہی راہ ہے ۔اس کے علاوہ اور جس قدر راہیں بھی کھلی ہوں گی۔گمراہی وفساد کی ہوں گی یعنی علم وعمل شریعت کا احیاء اور ترک وہجر شریعت کا انسداد۔

۳۔ اس ملک کی بنیاد اس ایمانی اور اعتقادی حقیقت پر بھی تھی کہ شریعت اسلامیہ آخری واکمل شریعت ہے۔﴿اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ﴾ اور اس کا وعدہ ہے ﴿لِیُظْهِرَهُ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّه﴾ یقیناً اس وعدہ کا ظہور نہیں ہوا۔پس ضرور ہے کہ وعدہ الہٰی ظاہر ہو۔اور اس لیے مستقبل کے لیے اگر کوئی راہ فوز و

فتح ہوسکتی ہے تو وہ صرف دعوت شریعت اور احیائے عمل بالقرآن ہی کی ہے۔

۴۔ مسلمانوں سے اہتداء واتباع شریعت مہجور نہیں ہوا۔ مگر علمائے اسلام کی غفلت واعراض سے، شریعت کے علوم وعمل کے وہی حامل اور مبلغ تھے۔ اور امت کی حیات شرعیہ کا تمام دارومدار ان کی حیات علمی وعملی پر تھا۔ جب کتاب وسنت کا ترک وہجر، تفرقہ وتشتت، وحدت اور سبل متفرقہ کا شیوع، اختلاف وتحزیب کی عصبیت، علوم محدثہ کا استغراق، حب وجاہ وریاست کا استیلاء، فریضہ دعوت الی الخیر وامر بالمعروف ونہی عن المنکر سے تغافل، اہوائے سلاطین امراء کا اتباع، اجتہاد فکر ونظر کا فقدان، غرضیکہ منصب نیابت نبوت کا ضیاع اور احبار ورھبان اہل کتاب کے متذکرۂ قرآن مفاسد کا بحکم یاتی علی امتی علی بنی اسرائیل من النعل بالنعل اور کما قال ظھور واحاطہ خود طبقہ علماء میں بحد کمال پہنچ گیا تو اس کا لازمی نتیجہ امت کی ہلاکت تھا۔ اور وہ ظہور میں آیا۔ وکان وعداً مفعولا۔ پس اگر اصلاح حال کی کوئی راہ صحیح ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ علمائے امت کے طبقہ میں احساس حال کی تبدیلی پیدا ہو۔ وہ اپنے منصب عظیم کو از سر نو سنبھالنے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ اور اس طرح علم وعمل شریعت کا احیاء صورت پذیر ہو۔ (۱۱۰ تا ۱۱۲)

جمعیۃ تبلیغ اہلحدیث (کلکتہ ستمبر ۱۹۳۴ء)

قرآن حکیم کی عظمت

اس وقت تو محض یہ دیکھنا ہے کہ اسلام کیا ہے۔ یہ اللہ کی صداقت کا ایک عالمگیر پیغام ہے۔ ہم تمام کرۂ ارضی پر نظر ڈالیں۔ اس کرۂ ارضی کی نبض ہاتھ میں لے لیں۔ اور بیماری کی تشخیص کے بعد اس کے سامنے آبِ حیات پیش کریں۔ تمام قوموں کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان کو پیاس کس آب حیات کی ہے۔ لیکن آپ کی نظر محدود اور مسئلہ وسیع ہے۔ ہم سے کوتاہی ہو رہی ہے۔ اور ضرورت اس بات کی ہے کہ علمی حیثیت سے مطالعہ کریں کہ دنیا کی حالت کیا ہے۔ اس کو ضرورت کس چیز کی ہے۔ تو کام چل سکتا ہے۔ اور اگر ہم ایسا

کریں تو دنیا کی کونسی بات نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دنیا کی تمام قومیں جس چیز کی تلاش میں ہیں وہ تو آپ کے پاس قرآن میں ہے لیکن حالت یہ ہے کہ ہر گوشے میں اس سے انکار ہے۔

(صفحہ ۲۴۳)

اسلام کی تعلیم کس طرح پیش کی جائے

یورپ کا معیار یہ ہے کہ وہ جلد از جلد سوسائٹی کے تمام مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایسے لائحہ عمل کی تلاش میں ہے کہ جس کے ذریعہ سے زندگی امن وصحت کے ساتھ بسر ہو سکتی ہے۔ وہ رکاوٹیں جو راہ میں حائل ہو سکتی ہیں باقی نہ رہیں تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم کو پیش کرو۔ لیکن اس سے پہلے اس مسئلہ کو حل تو کرو کہ یہ تعلیم کن صورتوں میں پیش کی جائے۔ اس کے لیے قدم بڑھانا چاہیے۔ اس میں نقصان نہیں، کوئی برائی نہیں، اگر تعلیم انسان کے لیے ہے۔ اور اس لیے ہے کہ زمین پر بسنے والے اس پر عمل کریں تو اسی حالت میں، اسی صورت میں پیش کرو کہ وہ اسے دیکھ کر گھبرا نہ جائیں۔ اور اگر اس لیے ہے کہ اس پر فرشتے عمل کریں تو تمہیں اختیار ہے۔ (صفحہ ۲۴۴)

اسلام کا سب سے بڑا معجزہ

اسلام کا سب بڑا معجزہ یہ ہے کہ اس کا ظہور مغرب میں ہوا۔ اس کی پہلی کرنیں وہاں پھیلیں جہاں ظلمت وتاریکی تھی، نہ حقیقت کی روشنی وہاں نظر آتی تھی، اور نہ ان کی تاریکی پسند نگاہیں اس کو دیکھنا ہی چاہتی تھیں۔ عرب کا ہر فرد خود کو نوشیرواں اور خسرو سے کم نہ سمجھتا تھا۔ اب تم آنکھیں کھول کر دیکھ لو۔ علم کی روشنی میں وہی حال یورپ کا ہے یا نہیں۔ (صفحہ ۲۴۷)

اسلام سرمایہ داری کے خلاف ہے

اسلام سے زیادہ سرمایہ داری کی مخالف کوئی جماعت نہیں۔ کوئی تحریک نہیں۔ اس کی سب سے پہلے یہ کوشش ہوتی ہے کہ گھر میں دولت جمع ہی نہ ہو۔ یہ نہیں کہ جب دولت جمع ہو جاتی ہے، تو وہ اسے بانٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ دولت ایک گھر، ایک خاندان ہی میں نہ رہے۔ بلکہ ہمیشہ چلتی اور پھیلتی رہے۔

اسلام کا ایک قانون ہے وراثت۔ باپ کی جائیداد تمام اولاد میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ لیکن عیسائیوں میں بڑے بھائی کو ملتی ہے بقیہ دوسروں کو صرف زندگی گزارنے بھر، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وراثت نسلاً بعد نسل بڑھتی جاتی ہے۔ اور جب تک وراثت کا انجماد ختم نہ ہو جائے دنیا کو تسکین نہیں ہو سکتی۔ وہ ہمیشہ مضطرب رہے گی۔ اس لیے اسلام چاہتا ہے کہ دولت بٹ جائے، ایک جگہ جمع نہ ہو، بلکہ ہمیشہ پھیلی رہے۔ (صفحہ ۲۵۲)

خطبہ صدارت انڈین نیشنل کانگریس (رام گڑھ، مارچ ۱۹۴۰ء)

میں مسلمان ہوں، اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو سال کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہیں۔ اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعوی سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں، اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اور پھر ایک سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان

راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا۔ اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا میلان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے۔ لیکن پھر جیسا قدرت کا اٹل قانون ہے۔ دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اس دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کا جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔

ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے۔ یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی۔ اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام بھی دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ (صفحہ ۲۹۷ تا ۲۹۹)

مسلمانان دلی کا اجتماع (جامع مسجد دلی، اکتوبر ۱۹۴۷ء)

آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی چیز ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لیے شاہ جہان کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے اس زمانہ میں جس پر لیل ونہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں، تمہیں یہیں سے خطاب کیا تھا۔ جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا۔ اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد، آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے۔ میں نے تمہیں پکارا۔ تم نے میری

زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا تو تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیے۔ میں نے چلنا چاہا۔ تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغ جدائی دے گئی ہے، اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا۔ لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا، بلکہ غفلت وانکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے۔ جس کا اندیشہ تمہیں صراط مستقیم سے دُور لے گیا تھا۔ (صفحہ ۳۳۷)

یہ دیکھ کر مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا۔ آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔ (صفحہ ۳۴۰)

اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش وخروش بے جا تھا۔ اسی طرح آج یہ تمہارا خوف وہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ (صفحہ ۳۴۱)

میرے پاس تمہارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ وہی پرانا نسخہ ہے جو برسوں پہلے کا ہے وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان کہ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (صفحہ ۳۴۲)

باب نمبر۴

مولانا ابوالکلام آزاد کی مکتوب نگاری

خطوط نویسی کا آغاز لکھنے کے فن کی ایجاد کے بعد ہوا۔ابتداء میں پرندوں کے ذریعہ سے یہ خدمت لی جاتی تھی ۔اور اس کا ذکر مختلف زبانوں میں ملتا ہے ۔اور ہرکاروں کے ذریعے بھی خطوط ایک شہر سے دوسرے شہر پہنچائے جاتے تھے ۔جو پیدل یا کسی سواری پر جاتے تھے ۔جب بتدریج اس کی ضرورت عام ہوگئی تو اسے کسی حد تک منظّم کردیا گیا۔اور اسے ٹھیکہ داروں یا حکومت وقت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

قدیم ترین خط حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہے ۔جوانھوں نے ملکہ سبا کے نام لکھا تھا۔اوراس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَأْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ

''تم میرے مقابلے میں تکبر نہ کرو۔اور مطیع ہوکر میرحضور چلے آؤ۔'' (النمل ۳۰۔۳۱)

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے کئی ایک مجموعے شائع ہوئے ہیں ۔جو آپ نے برصغیر (پاک وہند) کے علمی ،ادبی ،اور سیاسی اکابرین کے نام لکھے ۔مولانا آزاد کے مکاتیب کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں اور جن حضرات نے مرتب کیے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ غبار خاطر ۔مرتبہ محمد اجمل خان (ایڈیشن اول)
غبار خاطر ۔مرتبہ مالک رام مع حواشی
۲۔ کاروان خیال ۔مرتبہ عبدالشاہد خان شروانی
۳۔ نقش آزاد ۔مرتبہ مولانا غلام رسول مہر

۴۔ تبرکات آزاد۔مرتبہ مولانا غلام رسول مہر

۵۔ مکاتیب ابوالکلام آزاد۔مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

۶۔ نوادرِ ابوالکلام۔مرتبہ ظہیر احمد خان ظہیر

۷۔ افادات آزاد۔مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

۸۔ خطوط ابوالکلام آزاد۔مرتبہ مالک رام

۹۔ ملفوظات آزاد۔مرتبہ مکتبہ ماحول کراچی

۱۰۔ مکاتیب ابوالکلام۔مرتبہ ادبستان لاہور

غبار خاطر

یہ مولانا آزاد کے (۲۴) خطوط کا مجموعہ ہے جو آپ نے اپنے دوست مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے نام لکھے۔پہلا خط شملہ سے،دوسرا سری نگر کشمیر سے،تیسرا خط بھی سری نگر سے اور چوتھا خط بمبئی میل سے براہ ناگپور۔اور باقی ۲۰ خط قلعہ احمد نگر سے لکھے گئے۔

مالک رام صاحب ان کے خطوط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''مولانا آزاد کی تحریریں جو غبار خاطر میں شامل ہیں ان میں سے بیشتر مختلف موضوعات ......علوم دینیات،تاریخ،انشاء وغیرہ سے متعلق ان کے وسیع مطالعے اور قدرت کلام اور غور وفکر کے نتائج کی مظہر ہیں۔انھوں نے ان خطوط سے وہی کام لیا جو ایک ماہر نفسیات،ایک مؤرخ،ایک انشاء پرداز اپنے علم اور قلم سے لیتا ہے۔کسی جگہ حروب صلیب کی داستان لکھی ہے تو کسی جگہ ہستی باری تعالیٰ پر دلائل فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ایک جگہ فلسفہ تنہائی پر رائے زنی کی ہے اور دوسری جگہ انانیت کا تجزیہ کیا ہے۔ایک خط میں موسیقی کی تاریخ ہے تو دوسرے میں کاشت کاروں کے رموز بیان ہوئے ہیں۔غرض ان کے علم کی ہمہ گیری اور تنوع حیرت ناک بھی ہے۔اور سُرورافزا بھی۔''

(غبار خاطر ساہتیہ اکیڈمی دہلی،ص ۸)

شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ:

''غبار خاطر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مولانا کے طرز تحریر کا جادو بولتا چلتا اور ان کے حسنِ بیان کا آہو چوکڑی بھرتا دکھائی دیتا ہے۔''

(ابوالکلام آزاد، ص ۳۶۲)

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے ایک مقالہ بعنوان ''غبار خاطر'' میں لکھتے ہیں کہ

''غبارِ خاطر کے خطوں میں عام خطوں کے برخلاف سادگی و بے تکلفی اور روزمرہ کی زبان کی بجائے رنگینی وخیال آفرینی اور انشاء پردازی کا رچاؤ ہے۔ دوسرے یہ کہ عام طور پر ہمارے یہاں خط کی خوبی اس کا اختصار بتایا گیا ہے۔ اس کے برخلاف ''غبار خاطر'' کے خطوط میں طوالت ہے۔ اور ہر قدم پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کی طبع دوراں کا بہاؤ رُکنے کا نام نہیں لیتا اور ہر خط پکار کر یہ کہہ رہا ہے:

کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے''

(مولانا ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ افضل حق قرشی، ص ۵۴۸)

غبار خاطر کا پہلا خط

شملہ

۲۷ جون ۱۹۴۵ء

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشیں دل
می غنیمت عیاں و دعا می فرست

دل حکایتوں سے لبریز ہے مگر زبان درماندہ فرصت کو یارائے سخن نہیں۔ مہلت کا منتظر ہوں۔

ابوالکلام

غبار خاطر مرتبہ مالک رام کا تعارف۔

کل صفحات ۴۳۵

ناشر۔ ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی

پہلی بار ۱۹۶۷ء۔ دوسری بار ۱۹۸۳ء

مقدمہ طبع جدید ص ۵۔ مقدمہ ص ۷ تا ۲۶

فہرست ص ۲۷، ۲۸

خطوط ص ۳ تا ۲۸۳، حواشی ۲۸۵ تا ۴۰۸، فہارس ۴۰۹ تا ۴۳۵۔

کاروانِ خیال

یہ کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کے ۱۸ خطوط کا مجموعہ ہے ۔ اس میں دس خطوط مولانا کے صدیق مکرم حبیب الرحمٰن شروانی کے اور ۱۷ مولانا کے ہیں۔ مولانا کا ایک خط مرتب عبدالشاہد خان شروانی کے نام بھی ہے لیکن وہ دیباچہ میں نقل کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں تین ایسے ہیں جو غبار خاطر میں آ چکے ہیں ۔ باقی ۱۵ خطوط میں زیادہ تر رسیدی ہیں۔ عبدالشاہد خان شروانی کا مقدمہ افادہ کی چیز ہے۔

شورش کاشمیریؒ لکھتے ہیں کہ:

"جو شخص مولانا کے سوانح پر کام کرنا چاہے وہ کاروانِ خیال کے پانچ چھ خطوط سے بہت سی بنیادیں فراہم کر سکتا ہے ۔ اوران گوشوں سے واقف ہوسکتا ہے جن سے مولانا کے عقیدت مندوں کا آشنا ہونا ضروری ہے ۔ المختصر ان خطوط سے مولانا کے سوانح وافکار کی ترتیب وتجزیہ میں کماحقہ مدد ملتی ہے۔"

(ابوالکلام آزاد ص ۲۶۲، ۳)

نقشِ آزاد

مرتبہ۔ مولانا غلام رسول مہر

اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ صفحہ ۲۵۶ تک مہر صاحب کے نام مولانا کے خطوط ہیں۔ یہ کل ۱۸۱ خط ہیں۔ جن میں ۱۴۲ مولانا کے قلم سے ہیں۔ دوان کی طرف سے تار ہیں۔ اور باقی ۵۰ خطوط ان کے پرائیویٹ سکرٹری محمد اجمل خان اور تین خطوط پرسنل سکرٹری مسٹر ایم این مسعود کے قلم سے ہیں۔

اس مجموعہ کا دوسرا حصہ ان نوٹس پر مشتمل ہے جو مولانا مہر کی گرانقدر تصنیف غالب کا مطالعہ کرتے وقت جڑواں اوراق پر لکھے تھے۔

تیسرا حصہ ۱۴ خطوط، ایک پیام اور ایک اپیل پر مشتمل ہے۔ اس میں ۸ خطوط خواجہ حسن نظامی، ایک خط واحدی، ایک خط شفاعت اللہ مرحوم اور چار خط نیاز فتح پوری کے نام ہیں۔

شورش کاشمیری مرحوم لکھتے ہیں کہ:

"نقش آزاد کے بعض خطوط آج کے حالات میں الہامی معلوم ہوتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مکتوب الیہ مہر تھے۔ جن کا سیاسی راستہ روزنامہ انقلاب کی آخری ہچکی تک مولانا سے مختلف رہا۔" (ابوالکلام آزاد، ص ۳۶۴)

مولانا غلام رسول مہر نے بیشتر خطوط پر بعض امور کی وضاحت کے سلسلہ میں حواشی بھی تحریر کیے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک خط ملاحظہ فرمائیں۔

کلکتہ

۱۵ مارچ ۱۹۴۰ء

عزیزی

لاہور سے کئی شخصوں نے مجھے "انقلاب" کا ایک کٹنگ بھیجا ہے۔ جس میں آپ لکھتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں پر بہتان لگایا۔ اور قرآن کریم کی یہ آیت بھی مجھے یاد دلائی گئی ہے کہ سبحانك هذا بهتان عظيم۔ بہتان اگر فرد پر لگایا جائے تو سخت جرم ہے لیکن اگر ایک مسلمان خود مسلمان پر لگائے تو اس جرم کی شناعت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ مجھے یقین ہے کہ اب آپ کی وہ رائے میری نسبت نہ رہی ہوگی جس کی بنا پر آپ اظہارِ اخلاص کرتے رہے ہیں اور یقیناً آپ یہ پسند نہیں کریں گے کہ مداہنت ونفاق سے کام لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مخمصے سے آپ کو نجات دے دوں۔ آپ نے اس وقت تک جو محبت واخلاص مجھ سے رکھا ہے اس کے لیے شکرگزار ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابوالکلام

مولانا مہر نے اس خط پر درج ذیل حاشیہ لکھا ہے:

"انقلاب میں ایک تحریر شائع ہوئی تھی جس کا اسلوب بڑا ہی افسوسناک تھا۔ لیکن میں اس وقت لاہور میں نہ تھا۔ بعد میں مولانا کا گرامی نامہ آیا۔ میں نے وہ تحریر دیکھی تو معذرت بھی کی، حقیقت حال بھی لکھی، یہ بھی عرض کیا کہ آپ کو آخری فیصلے سے پیشتر تحقیق فرمالینی چاہیے تھی۔"

(نقش آزاد، ص۱۷۶۔۱۷۷)

تبرکاتِ آزاد

مرتبہ۔مولانا غلام رسول مہر

۹۸ مکاتیب اور مقالات کا مجموعہ، آغاز میں ۶ صفحات کا دیباچہ۔ بہ قول مولانا مہر خطوط کا یہ مجموعہ دینی و علمی اور تعلیمی واخلاقی مسائل سے متعلق، مجتہدانہ بصیرت وموعظت کا نادر مرقع ہے۔اس کتاب میں مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا عبدالماجد دریابادی، اور مولانا سید سلمان ندوی، اور بعض دوسرے حضرات کے نام خطوط ہیں۔

مکاتیب کا پہلا مجموعہ۔مولانا مہر لکھتے ہیں:

"یہ ۲۷ مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ان میں بیشتر مولانا محی الدین احمد قصوری کے نام ہیں۔اور چند ان کے والد ماجد مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم ومغفور کے نام۔ابتدائی مکاتیب میں مختلف مسائل پر مفصل بحثیں فرمائی گئی ہیں۔اس وجہ سے مجموعے کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔میں نے پوری کوشش کی ہے کہ حواشی میں ہر ضروری معاملے کی توضیح ہو جائے تا کہ خوانندگان کرام کو مطالب کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

ایک خط ملاحظہ فرمائیں:

اگست ۱۹۳۸ء

عزیزی

۱۔ لا الہ الا اللہ۔ الخ بہ ظاہر شہادتین کا اختصار ہے۔ احادیث سے جو کلمہ ثابت ہوتا ہے، وہ شہادتین ہی ہے۔ غالباً اسی عہد میں یہ جملہ بہ طور خلاصہ شہادتین کے مستعمل ہونا شروع ہو گیا تھا۔

۲۔ حدیث میں ''یومہم'' سے مراد دن کا تعین نہیں ہے بلکہ نفس تعطیل کا یعنی تعطیل کے دن انہیں حکم دیا گیا تھا جس سے وہ گمراہ ہو گئے۔

۳۔ مولانا محمد علی کے لیے کوشش جاری ہے۔ غالباً قطعی نتیجہ ستمبر میں معلوم ہو۔

۴۔ مسٹر حسن کے بارے میں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا تھا۔ اس سے زیادہ اس طرح کے معاملات میں دخل دینا معقول نہ ہوگا۔ تاہم ایک اور خط لکھ دیا ہے۔''

ابوالکلام

مولانا مہر نے اس پر درج ذیل حواشی تحریر فرمائے ہیں:

''یہ جواب مولوی محی الدین احمد کے خط کی پشت پر لکھ کر واپس بھیج دیا گیا۔ پہلا سوال جواب سے واضح ہے۔ دوسرا سوال صحیح بخاری کی ایک حدیث کے متعلق تھا۔ جو کتاب الجمعہ میں آتی ہے۔ یعنی حضرت ابوھریرۃؓ کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ہم قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے، ہاں انہیں ہم سے پہلے کتاب دی گئی۔ پھر یہ ان کا دن ہے۔ جو ان پر فرض کیا گیا تھا۔ تو انھوں نے اس میں اختلاف کیا، اور اللہ نے ہمیں اس کی ہدایت کی۔ پس وہ لوگ اس میں ہمارے بعد ہیں۔ یہود کل اور نصاریٰ کل کے بعد۔ مطلب یہ ہے کہ جمعہ ہمارا دن ہے۔ اس کے بعد یہود کا ہفتہ یعنی سبت اس کے بعد نصاریٰ کا سبت یعنی اتوار۔''

(تبرکات آزاد، ص ۸۲)

دوسرے مجموعے میں ۱۹ خطوط ہیں۔ یہ سب خطوط مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ہیں، مولانا کا ایک خط ملاحظہ فرمائیں:

کلکتہ

۲۶ اکتوبر ۱۹۲۶ء

محبی فی اللہ۔ السلام علیکم

خط پہنچا۔ دہلی سے واپس آکر دو ہفتہ تک مبتلاء بخار و پیچش رہا۔ اس وقت طبیعت بکلی صاف نہیں ہے۔ جہاں تک مسئلہ حجاز کا تعلق ہے جو کچھ ہو رہا ہے تمام تر افراط وتفریط ہے۔ بڑی مصیبت یہ پیش آ گئی ہے کہ مسئلہ دینی احکام ومصالح سے ممزوج ہو گیا ہے۔ اور جو لوگ اس جھگڑے میں ہیں، ان کو چوں کہ خبر نہیں، ذاتی کاوشیں اور جماعت بندی کا جذبہ ایک مزید آفت ہے۔ مسئلہ پر آراء کی تقسیم حقیقت کی بناء پر نہیں بلکہ محض پارٹی کی بناء پر ہوتی ہے۔ مختلف حالات واسباب ایسے ہیں کہ اصلاحِ حال کی امید بہت کمزور ہے۔ اِلاّ یہ کہ اللہ مقلب القلوب ہے۔ (۱)

لکھنو میں جلسے کے موقع پر آنا ہی پڑے گا۔ اگرچہ سرے سے یہ جلسہ ہی بیکار ہے۔ ممکن ہے جلسہ کی تاریخیں بدل دی جائیں، لوگوں کو اعتراض ہے کہ دہلی میں یہ جلسہ صرف اس لیے قرار دیا گیا تھا کہ رپورٹ وفد چھپ کر شائع ہو جائے اور ممبروں کو مطالعہ ونظر ثانی کا کافی وقت ملے۔ لیکن رپورٹ اس وقت تک تقسیم نہ ہو سکی۔ غالباً آج بمبئی سے روانہ ہوئی ہوگی۔ میں نے شوکت صاحب کو لکھا ہے کہ جلسہ ۱۵ نومبر یا دسمبر کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہو۔ غالباً ۱۵ نومبر قرار پائے۔ (۲) بہر حال امید ہے آپ سے جلد ملاقات ہوگی۔ قیام غالباً نواب علی حسن صاحب ہی کے یہاں ہو۔ (۳) لیکن میں تو آپ کے یہاں ٹھہروں گا اگر آپ ٹھہرائیں۔

مولوی عبدالرزاق صاحب کا ادھر کئی ہفتہ سے کوئی خط نہیں آیا۔ (۴) مجھے ان کی صحت کی طرف سے برابر تشویش رہتی ہے۔ اگر ممکن ہو تو ملیے اور خط لکھنے کے لیے کہیے، مولوی ظفر الملک صاحب ملیں تو سلام شوق۔

الہ ااکاام

مولانا مہر نے اس خط پر جو حواشی قلمبند فرمائے ہیں۔ وہ درج ذیل ہیں:

ا۔ ''مولانا مجلس خلافت کے صدر تھے۔ اور سلطان ابن سعود کے ملک الحجاز بن جانے کا مسئلہ وجہ نزاع بن گیا تھا۔ جس حد تک مجھے اندازہ ہے نزاع کی حیثیت ابتداء میں بہت محدود تھی لیکن اختلافِ عقائد نے اس میں شدت پیدا کر دی۔ ایک گروہ جس میں اہل حدیث شامل تھے۔ سلطان کا حامی تھا۔ اس کے برعکس دوسرے لوگ حجاز، شام، اور عراق پر وہابیوں کے سوسوا سو سال پیشتر کی یورشوں کے سلسلہ میں افسانہ آرائیوں نیز قبہ شکنیوں سے متاثر تھے اور سلطان کے مخالف تھے۔ خود مجلس خلافت کے ارکان بھی دو فریقوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک حامی تھا اور دوسرا مخالف۔ حامی فریق میں ذی اثر اور متحدہ عنصر ارکان پنجاب کا تھا۔ جنہیں رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم ''پنجابی ٹولہ'' کہہ کر پکارتے تھے۔ ان ارکان میں سے صرف چند اہل حدیث تھے باقی احناف تھے۔ بلکہ بعض شیعہ حضرات بھی تھے۔ یقیناً آخر میں اس معاملے نے فرقہ بازی ہی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ خود مولانا نیز مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کو فریق مخالف میں درجہ اعتماد حاصل نہ تھا۔ اس لیے کہ وہ سلطان کی حمایت کی طرف مائل سمجھے جاتے تھے۔

۲۔ یہ اجلاس ماہ دسمبر لکھنو میں ہوا۔ اور افسوس کہ بعض معاملات پر نہایت ناگوار صورت اختیار کر لی۔ اور ناکامی پر منتج ہوا۔

۳۔ صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خان مرحوم ابن امیر الملک والا جاہ نواب سید صدیق حسن خان مرحوم کہ جن کی کوٹھی بھوپال ہاؤس کے نام سے مشہور تھی۔ مولانا وہیں ٹھہرتے تھے۔

۴۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی۔ وہ ''پیغام'' کی اشاعت کے وقت کلکتہ میں مولانا کے ساتھ تھے۔ پھر مولانا نے عربی کا رسالہ ''الجامعہ'' جاری کیا تو مولانا عبدالرزاق اس کے ایڈیٹر رہے۔ اسی زمانے میں مولانا کا بیان ''قول فیصل''

عربی میں منتقل کیا۔ جو المنار کے مطبع سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ پھر مولانا
عبدالرزاق کلکتہ چلے آئے۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا نے "الہلال" دوبارہ شائع
کیا تو مولانا عبدالرزاق پھر کلکتہ چلے گئے تھے۔"

(تبرکات آزاد، ص ۱۰۸ تا ۱۱۰)

تیسرا مجموعہ (۳۸) مکاتیب پر مشتمل ہے۔ اور یہ سب مکاتیب مولانا سید سلیمان ندوی
کے نام ہیں۔ مولانا مہر مرحوم ان مکاتیب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ خطوط معارف کے متعدد نمبروں میں شائع ہوئے تھے۔ اشاعت میں
مکاتیب کی تحریر تاریخ کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ اور میں نے انھیں مکاتیب کو
تاریخ وار مرتب کرنے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا۔"

(تبرکات آزاد، ص ۱۱۵)

چوتھے مجموعہ میں ۱۵ مکاتیب ہیں۔ جو مختلف حضرات کے نام ہیں مثلاً خواجہ الطاف
حسین حالی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا انشاء اللہ خان، عبداللہ بٹ اور مسیح الملک حکیم
اجمل خان وغیرھم۔

تبرکات آزاد ۳۹۲ صفحات پر محیط ہے۔ دو سو صفحات میں مکاتیب درج ہیں اور
۱۱۲ صفحات میں مولانا آزاد کے سات مضامین ہیں۔ جن کی فہرست یہ ہے۔
۱۔ ہجرت کا فتویٰ ۲۔ فتنہ ارتداد اور مسلمان ۳۔ مسئلہ خلافت اور جمہوریہ ترکیہ ۴۔ امیر بن
سعود اور حرمین شریفین ۵۔ مقابر و آثار پر عمارات ۶۔ دیش بندھو اور چترنجن داس
۷۔ کیا آخری منزل آ گئی ہے۔

مکاتیب ابوالکلام آزاد

مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

اس مجموعہ میں مرتب نے ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۵۷ء تک کے خطوط جمع کیے ہیں۔
خطوط کی تعداد (۱۷۱) ہے، ۱۴۸ خطوط مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے ہیں۔ اور ۲۳ خطوط
ان کے حسب ہدایت سیکرٹریوں کے قلم سے ہیں۔ حصہ اول میں مولانا کے مختلف مجموعہ ہائے

خطوط پر تبصرہ ہے۔حصہ دوم میں علامہ شبلی ،مولانا حالی ،مفتی کفایت اللہ دہلوی ، علامہ سید سلیمان ندوی ،چوہدری خلیق الزمان اور جواہر لال نہرو کے علاوہ کئی ایک احباب کے نام ۵۹ خطوط ہیں ۔تیسرے حصہ میں ان حضرات کا تعارف کرایا گیا ہے جن کے نام اس مجموعہ خطوط میں شامل ہیں۔ یہ تمام قابل مطالعہ ہیں۔بقول شورش کاشمیری ان خطوط کے مطالعہ سے مولانا آزاد کی سیرت اورسوانحی خاکہ تیار ہوسکتا ہے ۔یہ کتاب اُردو اکیڈمی سندھ نے ۱۹۶۸ءمیں شائع کی ۔

نوادرابوالکلام

اس کتاب کے مرتب ظہیراحمد خان ہیں۔ مولانا آزاد نے ان کے دادا محمد اکبر خان کے نام جوخطوط لکھے وہ اس مجموعہ میں شامل کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ڈھوک شرغا ضلع کیمبل پور سے شائع ہوئی ۔

آفاداتِ آزاد

مرتبہ۔ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

یہ کتاب مذہبی احکام ومسائل سے متعلق مختلف سوالوں کے جوابات پر مشتمل ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے پرائیویٹ سکرٹری محمد اجمل خان کو زبانی بتادیے یالکھوادیے تھے ۔خان صاحب کے پاس یہ یادداشتیں محفوظ تھیں ۔جن سے یہ مجموعہ مرتب ہوا۔پہلی بار یہ کتاب ۱۹۵۹ء میں حالی پرنٹنگ ہاؤس دہلی نے شائع کی ۔پاکستان میں پہلی بار ۲۲فروری ۱۹۸۴ءکوڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے ادارہ تصنیف وتحقیق پاکستان کراچی سے شائع کی ۔اس کتاب کے حصہ اول کے آغاز سے پہلے ڈاکٹر ابوسلمان کا دیباچہ اورمحمد اجمل خان کا مقدمہ ہے ۔اس کے بعد حصہ اول کا عنوان ہے ”دینی“ ۔اس میں ایمان وعقائد، عبادات ،نکاح وطلاق ،قرآن وحدیث ،فقہ ،مسائل جدیدہ ،تصوف ،تعلیم واصلاح ، رسوم ، قادیانیت ،اورمتفرق موضوعات پر مختلف حضرات کی طرف سے کیے گئے سوالات کے جوابات ہیں ۔

مولانا آزاد کو ایک شخص غلام محمد ساکن سری نگر (کشمیر) نے سوال بھیجا:

سوال:.....اہل کتاب کے عقائد بھی صریح شرک پر مبنی ہیں۔ پھر قرآن نے انہیں مشرکین مکہ میں شمار کیوں نہیں کیا۔ اور کن وجوہ کی بناء پر شریعت نے ان کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی۔ (۱۵ اکتوبر ۱۹۵۵ء)

جواب:..... اہل کتاب یہود ونصاریٰ بھی شرک میں مبتلا ہوئے لیکن چونکہ ان کے مذہب کی بنیاد ایک آسمانی کتاب پر ہے۔ اور وہ اس کے عامل ہونے کے مدعی ہیں۔ اس لیے قرآن کریم نے مشرکین عرب میں انہیں شامل نہیں کیا۔ ان سے الگ رکھا۔ اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دے دی۔

(افادات آزاد، ص ۵۰)

سوال:.....حدیث لاتسبوا الدھر فان الدھر ھو اللہ سند کے لحاظ سے کیسی ہے؟

جواب:..... یہ حدیث ضعیف ہے۔ نیز اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمانہ خدا ہے بلکہ یہ ہے کہ زمانے میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی مشیت سے ہوتا ہے لہٰذا اسے بُرا نہ کہو۔

(افادات آزاد، ص ۵۰)

سہسرام سے اکرام الحق صاحب نے مولانا آزاد سے دو سوالات کیے تھے۔

۱۔ مسلمان مسلمان ہونے کے باوجود غیر مسلموں کے مقابلے میں غریب، نادار اور ان سے مغلوب کیوں ہیں۔

۲۔ کیا موت کے بعد روح کا تعلق اس کے اعزاء واقارب سے رہتا ہے۔"

(۴ دسمبر ۱۹۵۴ء)

جوابات:

۱۔ کہیں بھی قرآن نے دعویٰ نہیں کیا کہ مسلمان کتنی ہی غفلت، جہالت اور بے عملی میں مبتلا ہو جائیں مگر وہ غیر مسلموں پر غالب رہیں گے۔ غلبہ ومغلوبیت کے قدرتی اسباب وعلل ہیں اور وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں سب پر یکساں اثر انداز ہیں۔

۲۔اس بارے میں شریعت نے کوئی روشنی نہیں دی ہے۔

(افادات آزاد،ص ۹۷)

حصہ دوم کا عنوان ہے ''ادبی''۔اس میں ۱۵۱ خطوط ہیں۔جو (۱۱۲) حضرات کے نام لکھے گئے ہیں۔ان میں ۴ نامعلوم حضرات شامل ہیں۔مشہور حضرات میں مولانا غلام رسول مہر،عبداللہ بٹ،خواجہ عبدالحی فاروقی،ریاض الرحمٰن خان شروانی،عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالجلال ندوی،شورش کاشمیری،مولانا مسعود علی ندوی،مولانا عبدالسلام ندوی اور خواجہ غلام السیدین شامل ہیں۔

خطوط ابوالکلام آزاد

مرتبہ۔مالک رام

اس کتاب میں خطوط کی مجموعی تعداد ۲۶۳ ہے۔اور یہ خطوط جن حضرات کے نام لکھے گئے ہیں۔ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

مولانا عبدالرزاق کان پوری (۲)

حکیم محمد علی طبیب (۱)

شمس العلماء مولوی محمد یوسف رنجور (۴۷)

بنیامین (۱)

خواجہ حسن نظامی (۶)

مولوی انشاءاللہ خان (۱)

مولوی عبداللطیف (۱)

ملا واحدی (۱)

عبدالماجد دریابادی (۱۹)

مولانا الطاف حسین حالی (۱)

مولانا غلام رسول مہر (۱۸۰)

مالک رام صاحب نے شروع میں تعارف کے عنوان سے ان خطوط پر روشنی ڈالی ہے

لکھتے ہیں کہ:

''ان خطوط سے مولانا آزاد کے سوانح حیات کی تکمیل میں بہت مدد ملے گی۔خاص کر اِن میں ان کی عادات اور خصائل کا باب پورا کرنے کے لیے بہت مواد ہے۔اس میں جو خطوط شمس العلماء مولوی محمد یوسف رنجور جعفری کے نام ہیں۔اس پہلو سے وہ بالخصوص بہت اہم اور قیمتی ہیں۔''

(خطوط ابوالکلام،ص ۹)

اس کتاب کی ضخامت ۴۸۴ صفحات پر محیط ہے۔صفحہ ۳۸۵ تک خطوط کا اندارج ہے۔ اور صفحہ ۳۸۷ سے ۴۸۰ تک مالک رام نے ان لوگوں کے حالات مختصراً بیان کیے ہیں جن کا تذکرہ ان خطوط میں آیا ہے۔صفحہ ۴۸۱ تا ۴۸۴ کتابیات ہے۔

حواشی میں مالک رام نے جن حضرات کے سوانحی خاکے بیان کیے ہیں۔ان کے نام درج ذیل ہیں:

مولانا عبدالرزاق کانپوری ،حکیم محمد علی طبیب ،محمد یوسف رنجور جعفری،خواجہ غلام الثقلین ،محمد بن یامین ،،خواجہ حسن نظامی ،مولوی انشاء اللہ خان ،مولوی عبداللطیف ، ملا واحدی ،عبدالماجد دریابادی ،مولانا شبلی ،سید وحیدالدین سلیم ،مولانا حمیدالدین فراہی، سید طفیل احمد منگلوری ،مفتی عبداللہ ٹونکی ،خواجہ الطاف حسین حالی ،غلام رسول مہر ،عبدالمجید سالک ،اختر علی خان ،مولانا محمد علی ،عبدالرزاق ملیح آبادی ،سیٹھ چھوٹانی ،مرزا محمد عسکری ،محمد ابراہیم میر سیالکوٹی ،ملک نصراللہ خان عزیز ،مولانا مظہرالدین شیرکوٹی ،مرزا شجاع الدین احمد خان تاباں ،مولوی محمد علی ،مرزا حیرت ،ننھے نواب ،مولانا عبداللہ گاندھی ،ڈاکٹر خان صاحب،گوپی چند بھارگو،ڈاکٹر شیخ محمد عالم ،موتی لعل نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ،ڈاکٹر ستیہ پال ،میاں عبدالعزیز ،گاباکے ایل ،منشی عبدالقیوم خان۔

میرے پیش نظر کتاب کا مطبوعہ نسخہ مطبوعہ ۱۹۹۲ء ہے۔جو''الفیصل ناشران کتب'' لاہور نے شائع کیا ہے۔

مکاتیب ابوالکلام

مرتبہ۔ادبستان لاہور

اس کتاب میں ۴۹ خطوط ہیں۔ایک خط مولانا حالی کے نام،دوخط مولانا شبلی کے نام ہیں۔ ۳۸ خط مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ہیں۔اور ۳ خط مولانا عبدالقادر قصوری کے فرزند مولانا محی الدین احمد قصوری کے نام ہیں۔اور ۵ خط مولانا مہر کے نام ہیں۔بقول شورش کاشمیری ان خطوط کے مطالعہ سے مولانا آزاد کے سوانح وافکار کی تدوین میں بہت زیادہ ملتی ہے۔

ملفوظات آزاد

یہ کتاب مکتبہ ماحول کراچی نے شائع کی ہے۔جو راقم کی نظر سے نہیں گزری۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ایک تو وہ خطوط جو مولانا نے ضرورتاً لکھے ہیں۔اور سیدھی سادی زبان میں لکھے ہیں۔ان میں ادبیت بہت کم ہے اور اشعار کا استعمال بھی بہت کم کیا گیا ہے۔لیکن ''غبار خاطر''اور''کاروان خیال'' میں جو خطوط شامل ہیں ان کا انداز علیحدہ ہے۔ان میں ادب کی چاشنی ہے اور مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے تلمیذ رشید حافظ ابن القیمؒ کی تصانیف کے بہت مداح اور شیدائی تھے۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا آزاد کا ذہن وفکر امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگرد رشید امام حافظ ابن القیم علیہ الرحمۃ سے شروع ہی سے بہت متاثر تھا۔ان دونوں ائمہ سلف کے افکار کا مولانا آزاد کے دماغ پر بڑا اثر تھا۔مولانا آزاد کا جو اپنا ذاتی عظیم الشان کتب خانہ تھا میں نے وہ کتب خانہ خود دیکھا ہے۔اس میں علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن القیمؒ کی تقریباً تمام تصانیف موجود تھیں۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد۔از سعید احمد اکبرآبادی،ص ۵۷)

مشہور اہل حدیث عالم خطیب الہند مولانا محمد ابراہیم جونا گڑھی نے جب حافظ ابن القیم کی مشہور کتاب اعلام الموقعین عن رب العالمین کا اردو ترجمہ کیا اور مولانا آزاد کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے مولانا جونا گڑھی کو دو خط لکھے۔ جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

پہلا خط

حبی فی اللہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے حافظ ابن قیم کی اعلام الموقعین کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ مجھے اس خبر سے نہایت خوشی ہوئی۔ عرصہ ہوا میں نے بعض عزیزوں کو جو ترجمہ کے کام سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کام پر لگایا تھا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور شیخ الاسلام ابن قیم کی مصنفات اردو میں منتقل کریں۔ چنانچہ منتخب کتابوں میں اعلام بھی تھی۔ لیکن کتاب ضخیم ہے۔ اس لیے اس کی نوبت نہ آئی۔ مختصرات شائع ہوگئیں۔ اب آپ اس طرف متوجہ ہوئے ہیں تو میں کہوں گا آپ نے ایک نہایت موزوں کتاب ترجمے کے لیے منتخب کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید توفیق کار عطا فرمائے۔ مباحث فقہ وحدیث میں متاخرین کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن اس سے بہتر اور اصلح کوئی کتاب نہیں۔ اسے اردو میں ترجمہ کر دینا اس گوشے کی تمام ضروریات ایک دفعہ پوری کر دیتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس کی ضرورت انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے ہے۔ اس طبقہ میں بہت سے لوگ مذہبی ذوق سے آشنا ہو چکے ہیں۔ لیکن صحیح مسلک کی خبر نہیں رکھتے۔ اور عربی سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے براہ راست مطالعہ نہیں کر سکتے۔ اگر اعلام اردو میں شائع ہوگئی تو ان کی فہم وبصیرت کے لیے کافی مواد مہیا ہو جائے گا۔ میں نہایت خوش ہوں گا۔ اگر اس ترجمہ کی اشاعت میں آپ کو کچھ مدد دے سکوں۔"

ابوالکلام

کان اللہ لہ از کلکتہ

دوسرا خط

حبی فی اللہ۔السلام علیکم

''اعلام الموقعین کا ترجمہ دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی۔مباحث فقہ اور حدیث اور حکمت تشریع الاسلامی میں متاخرین کی کوئی کتاب اس درجہ محققانہ اور نافع نہیں ہے جس درجہ یہ کتاب ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ اس مفید خدمت دینی پر متوجہ ہوئے۔میں ان تمام لوگوں کو جو مذہبی معلومات کا شوق رکھتے ہیں اور اصل عربی کا مطالعہ نہیں کر سکتے مشورہ دوں گا کہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔چونکہ اسلام کے اندرونی مذاہب ومشارب کی پیچیدگیوں سے عموماً مسلمان باخبر نہیں ہیں۔اس لیے بسا اوقات ان کا مذہبی شغف غلط راہوں میں ضائع ہو جاتا ہے۔اس کتاب کا مطالعہ ان پر واضح کر دے گا کہ حکمت ودانش کی حقیقی راہ کن لوگوں کی راہ ہے۔متبعین کتاب وسنت کی یا اصحاب جدل واختلاف کی۔خود صاحب اعلام اپنے قصیدہ نونیہ میں کیا خوب فرما گئے ہیں:

العلم قال اللہ قال رسولہ
قال الصحابة هم اولوا العرفان
ماالعلم نصبك للخلاف جهالة
بين النبی وبين اراى فلان

یعنی علم دین وہی ہے جو قرآن وحدیث میں ہے،جو معرفت خداوندی میں ڈوبے ہوئے فیضان صحبت رسول کے فیض یافتہ صحابہ کرام کی زبان سے ظاہر ہوا ہے۔کسی کی رائے کو سنت وحدیث سے ٹکرانا،رائے کے غلبے کے لیے دلائل قائم کرنا اور دینی جہالت کا ثبوت دیتے ہوئے رائے کے جھنڈے خلاف حدیث بلند کرنے کا نام علم دین نہیں۔

ضرورت تھی کہ اس کتاب کا ترجمہ کتاب کی شکل میں شائع کیا جاتا۔موجودہ

صورت حال کا یہ نہایت افسوسناک منظر ہے کہ اس طرح کی قیمتی اور ضروری خدمات پر اہل خیر واستطاعت کو توجہ نہیں ۔ مجھے امید ہے کہ بہت جلد ایسے حالات فراہم ہو جائیں گے کہ آپ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کر سکیں گے ۔ یہ بھی آپ نے خوب کیا کہ حافظ عماد الدین ابن کثیر کا ترجمہ شائع کر دیا۔ متاخرین کے ذخیرہ تفسیر میں یہ سب سے بہتر تفسیر ہے ۔ امید ہے کہ اصحاب خیر واستطاعت اس کام میں آپ کے مساعد ومددگار رہوں گے ۔''

ابوالکلام

کان اللہ لہ از کلکتہ

باب نمبر ۵

مولانا ابوالکلام آزاد کی قرآنی بصیرت

مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر قرآن کے سلسلہ میں مولانا محمد مستقیم سلفی بنارسی شیخ الجامعہ السلفیہ بنارس نے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کی درج ذیل فہرست اپنی کتاب ''جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات'' میں درج کی ہے۔

مطبوعہ

۱۔ ترجمان القرآن جلد اول سورۃ فاتحہ تا سورۃ انعام

۲۔ ترجمان القرآن جلد دوم سورۃ اعراف تا سورۃ المؤمنون

۳۔ باقیات ترجمان القرآن مرتبہ مولانا غلام رسول مہر

۴۔ باقیات ترجمان القرآن مرتبہ سید اصغر بخاری

۵۔ تصورات قرآن (تلخیص سورۃ الفاتحہ) مرتبہ ڈاکٹر عبداللطیف

۶۔ ام الکتاب (سورۃ الفاتحہ کی تفسیر)

۷۔ القول المتین فی تفسیر سورۃ والتین۔

۸۔ اصحاب کہف

غیر مطبوعہ

تفسیر سورۃ الواقعہ

امثال القرآن

مقدمہ تفسیر

تفسیر البیان

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے بہت پہلو تھے۔ وہ ایک جید عالم دین، مجتہد، مدبر

ومفکر، مورخ ومحقق، صحافی وادیب، نقاد ومبصر اور مفسر قرآن تھے۔ سیاسی بصیرت میں بہت بلند مقام پر فائز تھے۔ صحیح معنوں میں وہ عبقری تھے۔ مولانا نے مسلمانوں کو قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا عظیم الشان کارنامہ ان کی تفسیر ترجمان القرآن ہے۔ جو دو جلدوں میں ہے، مگر نامکمل ہے۔ جو سورۃ الفاتحہ تا سورۃ المومنون لکھی گئی۔ لیکن اب ساہتیہ اکیڈمی دہلی نے جو تفسیر چار جلدوں میں شائع کی ہے۔ اس میں سورۃ نور بھی شامل کردی گئی ہے۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی لکھتے ہیں کہ:

''ترجمان القرآن جو مولانا کی تفسیر ہے اس کو تفسیر کے بجائے ترجمہ اور اس پر مفصل حواشی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد، ص ۵۳)

محمد حبیب خان لکھتے ہیں کہ:

''مولانا آزاد کا ایک عظیم کارنامہ تفسیر قرآن ہے۔ جو سادگی، سلاست اور اسلوب کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ عربی زبان دنیا کی سب سے مشکل زبانوں میں سے ہے۔ لیکن مولانا کی مادری زبان عربی تھی اور عربی فارسی میں جو مہارت ان کو تھی اس کی بدولت انھوں نے آیات قرآنی کا مفہوم پیش کرکے اپنی انفرادیت قائم کی۔ مولانا سے پہلے سرسید قرآن مجید کی تفسیر لکھ چکے تھے۔ گویا اس کا نمونہ ان کے سامنے تھا۔ مگر سرسید کے قلم میں یہ جان نہ تھی جو مولانا کے ترجمان القرآن کی تفسیر میں ہے۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد۔ ازخلیق انجم، ص ۳۹۴)

ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر بھارت) لکھتے ہیں کہ:

''قرآن مجید حکمت ومعرفت کا وہ سرچشمہ ہے جس سے صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ سب اہل دل جو عرفان حقیقت کے پیاسے ہیں سیراب ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ہمارے ہندوستان کی یہ خصوصیت ہے کہ لوگ حق کی

ندا خواہ وہ کہیں سے اٹھے سننے کے لیے گوش برآواز رہا کرتے ہیں۔اس لیے غیر مسلموں میں قرآن مجید کی قدر و قیمت کو پہچاننے والے جتنے یہاں مل سکتے ہیں شاید ہی اور کہیں ملیں۔مگر مشکل یہ تھی کہ اردو کے سوا ہندوستانی زبان میں قرآن مجید کے مستند ترجمے موجود نہیں تھے۔اور اُردو میں کوئی بھی ترجمہ ایسا نہیں تھا جو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کے دلوں کو بھی کھینچ لیتا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن نے ایک حد تک یہ کمی پوری کر دی ہے۔ترجمان القرآن کو یہ غیر معمولی مقبولیت خصوصاً تعلیم یافتہ طبقے میں دو وجہوں سے حاصل ہوئی۔

ایک تو مولانا کی زبان اور ان کے بیان میں وہ غضب کی دلکشی ہے جس نے ان کے ترجمے اور تفسیری اشارات میں اردو ادب کے ایک شاہکار کی شان پیدا کر دی ہے۔

دوسرے وہ روح عصر کے محرم راز ہیں اور کلام الٰہی کے مطالب کو اس حکیمانہ انداز میں سمجھاتے ہیں جس سے نئے زمانے کے تنقیدی ذہن کی بھی تسکین ہو جاتی ہے۔"

(ترجمان القرآن۔جلد اول،مطبوعہ سندھ ساگر اکیڈمی لاہور،ص ۱۸)

مولانا سید سلیمان ندوی ترجمان القرآن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"میں نے قرآن کی جس قدر تفاسیر پڑھی ہیں ان میں ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کی تفاسیر سے بہتر کوئی نہیں۔ترجمان القرآن کا مصنف قابل مبارک باد ہے کہ اس نے یورپی سامراج کے زمانہ میں ہمت اور دلیری سے ابن تیمیہ اور ابن قیم کی اس صورت میں پیروی کی ہے جس طرح انھوں نے منگول فاتحوں کی مزاحمت کے سلسلہ میں کی تھی۔"

(مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت،ص ۱۶)

جب ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی تو مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف اعظم گڑھ (اکتوبر ۱۹۳۲ء) میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' نے پیدا کیا اور جس اسلوب بلاغت، کمال انشاء پردازی اور زور تحریر کے ساتھ انھوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا۔ اس نے ان کے لیے ایمان ویقین کے نئے نئے دروازے کھول دیے۔ اور ان دلوں میں قرآن پاک کے معانی اور مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔''

(معارف اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۳۲ء)

مولانا آزاد کو قرآن مجید سے غیر معمولی شغف تھا۔ ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ مسلمان قرآن مجید کی تعلیم حاصل کریں اور اس کی تعلیمات کو اپنے لیے حرزِ جان بنائیں۔ قرآن کریم کی تعلیم سے مولانا کے غیر معمولی شغف کی ترجمانی ان کے درج ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے اپنے جریدے ''البلاغ'' (مجریہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء) کے افتتاحی شمارے میں شائع کیا تھا۔

''قرآن حکیم کی تعلیمات کریمہ کے جو حقیقی معارف وبصائر تھے اور جن مقاصد عظمیٰ کے لیے اس کا نزول ہوا تھا۔ وہ صدیوں سے بالکل بھلا دیے گئے ہیں۔ اور یقیناً وہ وقت آ گیا ہے جس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ قرآن کے انوار وبرکات ذہن سے اٹھا لیے جائیں گے اور جب لوگ تلاوت کے لیے صحائف کھولیں گے تو اس کے اوراق کو بالکل سادہ وغیر منقوش پائیں گے۔''

(البلاغ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد از خلیق انجم ص ۳۱۴)

ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد کے دیرینہ خواب کی تعبیر ہے اور ان کے عملی تصورات کی تصویر ہے۔ ترجمان القرآن وہ آئینہ ہے جس میں مولانا کی دینی وعلمی سرگرمیوں کا پرتو پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔

ترجمان القرآن کے بارے میں مولانا کا بیان ہے:

''کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب وروز کے فکر ونظر کا موضوع رہا

ہے۔اس کی ایک ایک سورت،ایک ایک مقام،ایک ایک آیت،ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں۔ اور مرحلوں پر مرحلے طے کیے ہیں ۔تفاسیر وکتب کا جتنا مطبوعہ وغیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزر چکا ہے ۔اور علوم قرآن کے مباحث ومقامات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے حتی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔ اس تمام عرصے کی جستجو وطلب کے بعد قرآن کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھ چکا ہوں میں نے اس کتاب کے صفحوں پر پھیلا دیا ہے۔''

(ترجمان القرآن جلد اول ص ۱۵،۵۳)

ترجمان القرآن کی پہلی جلد کے آغاز میں مولانا نے لکھا ہے:

''میرا یقین ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کی سعادت کے لیے سرچشمہ حیات حقیقت قرآنی کا انبعاث ہے ۔اور میں نے کوشش کی ہے کہ اس کے فہم و بصیرت کا دروازہ ان پر کھل جائے ۔میں ترجمان القرآن شائع کرتے ہوئے محسوس کرتا ہوں کہ اس بارے میں جو کچھ میرا فرض تھا توفیق الٰہی کی دست باری سے میں نے ادا کر دیا۔اب اس کے بعد جو کچھ ہے وہ مسلمانوں کا فرض ہے اور یہ اللہ کے ہاتھ ہے کہ انہیں اداء فرض کی توفیق دے۔

حدیث عشق وسرمستی زمن بشنونہ اے واعظ
کہ باجام و سبو ہر شب قرین ماہ وپروینم

(ترجمان القرآن ج۱ ص۵۳)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن لکھنے کا ارادہ ۱۹۱۵ء میں کیا اور کتاب کا اعلان پہلی بار نومبر ۱۹۱۵ء میں اپنے رسالہ البلاغ کے صفحات میں شائع کیا۔اس وقت ترجمہ پانچ پاروں تک پہنچ چکا تھا۔اور تفسیر سورۃ آل عمران تک مکمل ہو گئی تھی ۔لیکن مارچ ۱۹۱۶ء میں حکومت بنگال نے ڈیفنس ایکٹ کی دفعہ ۳ کے تحت حکم جاری کر دیا کہ چار دن کے اندر کلکتہ کا قیام ترک کر دیں اور حدود بنگال سے نکل جائیں ۔چنانچہ مولانا رانچی (بہار)

تشریف لے گئے۔ اور بعد میں مرکزی حکومت نے آپ کو چار سال کے لیے نظر بند کر دیا۔

اس کے بعد واقعات نے جونا خوشگوار شکل اختیار کی اس نے ترجمان القرآن کے مسودے کو طرح طرح کی دشواریوں سے دوچار کیا۔ متعدد بار کی تلاشیوں میں کتاب کے اوراق ضبط ہو کر ضائع ہوتے رہے اور ایک مرتبہ کتاب کے بعض ضبط شدہ حصے پولیس کمشنر کلکتہ کے دفتر میں آتش زدگی کی بھی نذر ہوئے۔ ان دل شکن موانع کے باوجود مولانا آزاد ۱۹۱۸ء تک قرآن مجید کا ترجمہ مکمل کر چکے تھے۔ لیکن بار بار کی گرفتاریوں اور تلاشیوں کا سلسلہ جاری رہا اور یوں اس کتاب کے مسودات اور کتابت شدہ اوراق برباد ہوتے رہے۔

ترجمان القرآن کے سلسلہ میں مولانا آزاد کو جو پریشانیاں لاحق ہوئیں اس کے بارے میں مولانا خود لکھتے ہیں:

"یہ میرے صبر و شکیب کے لیے زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی۔ لیکن میں نے کوشش کی کہ اس میں بھی پورا اُتروں۔ یہ سب سے زیادہ تلخ گھونٹ تھا جو جامِ حوادث نے میرے لبوں کو لگایا۔ لیکن میں نے بغیر کسی شکایت کے پی لیا۔ البتہ اس سے انکار نہیں کرتا کہ اس کی تلخی آج تک گلوگیر ہے:

رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھتے کیا ہو
ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی نزاکتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتیں اور پنبہ و آتش میں آشتی محال ہے۔ میں نے چاہا دونوں کو بہ یک وقت جمع کر دوں۔ میں نامراد ایک طرف متاعِ فکر کے انبار لگاتا رہا۔ دوسری طرف برقِ خرمن سوز کو بھی دعوت دیتا رہا۔ نتیجہ معلوم تھا مجھے حق نہیں کہ حرفِ شکایت زبان پر لاؤں۔ عرفی نے میری زبانی کہہ دیا ہے:

نواں شکستم کہ بہ دتیال دِل خویش مدام
درنشیب شکن زلف پریشان رفتم

اب ترجمان القرآن اور تفسیر کی بپتی اس کے سوا ممکن نہ تھی کہ از سرنو محنت کی

جائے۔لیکن اس حادثے کے بعد طبیعت کچھ اس طرح افسردہ ہوگئی کہ ہرچند محسوس کیا کہ حادثے کا زخم اتنا ہلکا نہیں ہے کہ تھوڑا مندمل ہو جائے۔"

(ترجمان القرآن جلد اول ص ۳۳،۳۴)

کئی سال گزر گئے مولانا ابوالکلام آزاد اپنے آپ کو اس پر آمادہ نہ کر سکے کہ ترجمان القرآن از سر نو ترتیب دیا جائے۔لیکن ۱۹۲۷ء میں انھوں نے دوبارہ ترجمان القرآن کی ترتیب وتدوین کی طرف توجہ مبذول کی۔جیسا کہ مولانا ترجمان القرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"۱۹۲۷ء قریب الاختتام تھا کہ اچانک مدتوں کی رکی ہوئی طبیعت میں جنبش ہوئی۔اور رشتہ کار کی جو گرہ ذہن ودماغ کی پیہم کوششیں نہ کھول سکی تھیں۔دل کی جوشش بے اختیار سے خود بخود کھل گئی،کام شروع کیا تو چند دن تک طبیعت رکی رکی سی رہی۔لیکن جونہی ذوق فکر کے دو چار جام گردش میں آئے۔طبیعت کی ساری رکاوٹیں دور ہوگئیں۔اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا اس شورش کوہ ہستی میں افسردگی وخمار کی آلودگی کا کبھی گزر نہیں ہوا تھا۔"

(ترجمان القرآن جلد اول ص ۳۵)

قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کے لیے وسیع علم اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔مولانا ابوالکلام علوم اسلامیہ کے بحر زخار تھے۔تمام علوم اسلامی پر ان کو یکساں قدرت حاصل تھی۔اس لیے انہیں ترجمان القرآن کی تالیف میں بہت زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔پروفیسر کاظم علی خان اپنے ایک مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ترجمان القرآن لکھنے کے لیے علم وبصیرت اور استعداد وصلاحیت کے جس سروسامان کی ضرورت تھی۔اس سے آزاد کا دامن خالی نہ تھا۔قرآن فہمی کے لیے عربی زبان پر مکمل عبور ہونا ضروری ہے۔عربی آزاد کی مادری زبان تھی۔درس قرآن جس سازگار ماحول کا متقاضی ہوتا ہے وہ مولانا کو خاندانی ورثے میں ملا تھا۔مکہ مکرمہ کی روحانی فضا بھی اس سلسلے میں معاون ثابت ہوئی ہوگی۔جہاں آزاد (ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء) میں پیدا ہوئے تھے۔مکہ معظمہ

آیات قرآنی کے اولین مہبط کی حیثیت رکھتا ہے۔اور قرآن مجید میں مکی آیات کی تعداد بھی قابل لحاظ ہے۔قرآن کی آیتوں اور سورتوں کو یاد رکھنے کے لیے ایک اچھا حافظہ بھی درکار ہوتا ہے۔مولانا آزاد کو قدرت نے جس غیر معمولی حافظے کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔وہ ان کی تحریروں اور تقریروں میں جگہ جگہ جلوہ گر نظر آتی ہے۔آیات قرآنی پر مولانا کا پورا عبور ان کے اچھے حافظے کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے۔قرآن کریم کے مفاہیم کو عربی سے اردو میں منتقل کرنے کے لیے ترجمے میں جو مشق و مہارت درکار ہوتی ہے۔وہ بھی آزاد اپنی زندگی میں ہی اس زمانے میں پیدا کر چکے تھے۔جب انھوں نے متعدد کتب ورسائل کے تراجم کیے تھے۔''ترجمان القرآن'' کے تفسیری حواشی لکھنے کے لیے وسیع مطالعے اور تحقیقی مزاج کی بھی ضرورت تھی۔اور یہ دونوں باتیں مولانا آزاد میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔''ترجمان القرآن'' کو کامیابی سے ہم کنار کرانے میں ان تمام عوامل کی کارفرمائی شامل رہی ہوگی۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از خلیق انجم ص ۳۱۸)

بعض علماء کرام نے ترجمان القرآن کے سلسلے میں اس سوال پر بحث کی ہے یہ محض قرآن کا ترجمہ ہے یا اسے تفسیر بھی کہا جاسکتا ہے۔مولانا سعید اکبرآبادی لکھتے ہیں کہ:

''ترجمان القرآن جو مولانا کی تفسیر ہے اس کو تفسیر کی بجائے ترجمہ اور اس پر مفصل حواشی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از سعید احمد اکبرآبادی ص ۵۳)

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ:

''مترجمین قرآن کا عام دستور یہ تھا کہ وہ آیات کے مطالب اردو میں منتقل کرتے تھے۔ساتھ ساتھ حاشیے پر ضروری مطالب کی تشریح فرمادیتے تھے۔جنہیں عموماً ''فوائد'' کا نام دیا جاتا تھا۔مولانا نے اس کے بجائے حواشی کا طریقہ اختیار کیا۔یعنی ترجمہ کے ساتھ ساتھ ہر ضروری مقام پر وہ ذرا مجمل

عبارت میں تشریح لکھتے گئے ۔جو مختلف آیات کے ضروری نکات پر مشتمل تھی۔ انہیں تفسیر نہیں کہا جا سکتا۔ترجمے اور تفسیر کے درمیان کی چیز قرار دیا جا سکتا ہے۔

(باقیات ترجمان القرآن ص ۵۱)

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد اسے مفصل ترجمہ اور مجمل تفسیر تسلیم کرتے ہیں۔مولانا آزاد خود لکھتے ہیں کہ:

''ترجمان القرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس کی تمام خصوصیات کا اصل محل ترجمہ اور ترجمے کا اسلوب ہے۔اگر اس پر نظر رہے گی تو پوری کتاب پر نظر رہے گی اور یہی وہ خزینہ ہے جس میں کتاب کی خصوصیات مدفون ہیں۔جس قدر غور وتدبر سے ترجمے کا مطالعہ کیا جائے گا۔اسی قدر قرآن حکیم کے حقائق اپنی اصلی طلعت وزیبائی میں بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ ترجمے کے بعد کتاب کا دوسرا محل تدبر نوٹ ہیں۔ان کی ہر سطر تفسیر کے ایک (پورے) صفحے، بلکہ بعض حالتوں میں ایک پورے مقالے کی قائم مقام ہے۔ اکثر مقامات میں ایسا ہوا ہے کہ معارف ومباحث کا ایک پورا دفتر دماغ میں پھسل رہا تھا۔مگر نوک قلم پر پہنچا تو ایک سطر یا ایک جملہ بن کر رہ گیا۔''

ترجمان القرآن کے متعلق مولانا ابوالکلام نے دبے الفاظ میں انکساری کا جو دعویٰ کیا ہے اس سے قرآنیات میں اس کتاب کا مقام متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ:

''کام کی علمی نوعیت کا اندازہ اس سے کیا ہوسکتا ہے کہ قرآن کے جس قدر اردو فارسی ترجمے موجود ہیں سب سامنے رکھ لیے جائیں۔نیز قدیم تفاسیر میں سے چند مقبول ومستند تفسیریں اٹھالی جائیں، یا کم ازکم تفسیر کبیر ہی منتخب کرلی جائے کہ تفسیری مباحث میں متاخرین کا منتہائے نظر وکاوش وہی ہے۔پھر کم ازکم ایک سورۃ کا ترجمہ ترجمان القرآن میں نکال کر ایک آیت کے ترجمے،شرح کا

ان سب سے مقابلہ کیا جائے اور پوری دقیقہ سنجی کے ساتھ دیکھا جائے کہ کون سی بات وہاں کس شکل ونوعیت میں آئی ہے۔پھر اس اختلاف نظر نے مقاصد ومطالب قرآنی کا معاملہ کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔لیکن ظاہر ہے کہ اہل نظر کہاں سے آئیں ۔اگر کوئی ہو بھی تو اتنی زحمت کیوں برداشت کرنے لگا۔بہرحال زمانہ اس کام کا اندازہ شناس ہو یا نہ ہو۔مگر مؤلف نے زمانے کی حالت کا پوری طرح اندازہ کرلیا ہے۔اور اول دن سے اس پر قانع ہے جو کچھ طلب ہے استفادہ وعمل کی ہے۔اعتراف وتحسین کی نہیں۔

(دیباچہ ترجمان القرآن)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن کے دیباچہ میں اپنے فہم قرآن کے بنیادی تصور پر بھی بحث کی ہے۔انھوں نے اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ قرآن فہمی اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں جس اعلی معیار پر تھی۔بعد کے مفسرین وہ معیار قائم نہ رکھ سکے۔ مولانا آزاد یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ بعد کے مفسرین کے لیے یہ لازمی امر ہے کہ وہ قرآن کے معانی ومفاہیم کے لیے قدیم ترین سرچشموں تک رسائی حاصل کریں۔بعد کے مفسرین کرام نے قرآن کے مطالب بیان کرنے میں لفظی گورکھ دھندوں اور قیاس آرائیوں سے بھی کام لیا ہے۔مولانا نے ترجمان القرآن کے تفسیری حاشیوں میں ان گورکھ دھندوں اور قیاس آرائیوں کو دور کرکے حقائق قرآنی کی رونمائی فرمائی ہے۔مولانا نے سورہ کہف کی تفسیر میں اصحاب کہف کے واقعے کے اصل حقائق بیان کیے ہیں۔اور اس کے ساتھ اس سورۃ میں ذوالقرنین کی شخصیت کے تعین میں جو بحث کی ہے وہ قابل دید ہے۔اور اس سے یقیناً قرآن فہمی کے نئے دروازے وا ہوئے ہیں۔

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں قرآن کے طریقہ استدلال کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ پروفیسر کاظم علی خان لکھتے ہیں کہ:

''مولانا آزاد کے نزدیک قرآن حکیم اپنے مطالعے کی پہلی منزل میں انسانی ذہن کو تعقل وتفکر کی دعوت دیتا ہے۔اور پھر آیات قرآنی انسان کے نہاں خانہ

دل پر دستک دے کر اس کے سوئے ہوئے وجدان کو بیدار کر کے اس کے قلب
کی گہرائیوں میں یوں جاگزیں ہو جاتی ہیں کہ ان کا ہر لفظ اور ہر بول اس کے
قلب وذہن کی فطری آواز بن جاتا ہے۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از خلیق انجم ص ۳۲۱)

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد لکھتے ہیں:

''قرآن کا یہی اسلوب تخاطب جو تعقل اور وجدان کی حسین آمیزش سے قارئین
کے دل و ماغ کو مسخر کرتا ہے۔ مولانا کے ترجموں اور تفسیری حاشیوں میں بھی
کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ انداز بیان مولانا کے رگ وریشہ میں اس حد تک سرایت
کر گیا ہے کہ ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر جملہ قرآنی طرز بیان کا عکس لیے ہوئے
ہوتا ہے۔ وہ پہلے ہمارے وجدان کو متاثر کرتے ہیں اور پھر ہمارے دل کے
دروازے سے داخل ہو کر دماغ تک پہنچ جاتے ہیں اور اس کو منور کر دیتے ہیں۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد (فکر وفن) ص ۳۷۵)

ترجمان القرآن جب شائع ہوئی تو اس کو قبول عام حاصل ہوا۔ اور اہل علم نے اس کی
خریداری میں تساہل نہ برتا۔ مولانا اپنے ایک خط بنام مولانا غلام رسول مہر بتاریخ ۲۵ جولائی
۱۹۳۲ء لکھتے ہیں کہ:

''میری اردو مطبوعات کی تاریخ میں ترجمان القرآن پہلی کتاب ہے جسے
لوگوں نے اس قدر ذوق وعشق کے ساتھ خریدا ہو اور پڑھا ہو۔''

(نقش آزاد ص ۳۴)

۲۷ مئی ۱۹۳۶ء کے ایک خط میں مولانا غلام رسول مہر کو لکھتے ہیں کہ:

''لوگوں کا یہ حال ہے کہ اپنی شیروانی بیچ کر ترجمان القرآن کو خریدنا چاہتے ہیں۔''

(نقش آزاد ص ۸۷)

جب ترجمان القرآن شائع ہوئی تو بعض حضرات کی طرف سے ترجمان القرآن پر
تنقید کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور مولانا آزاد کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا گیا۔ یہ پروپیگنڈہ

حاجی عبدالوھاب صاحب دہلوی (آف حاجی علی جان) مقیم مکہ معظمہ کے حوالہ سے مولانا سید مودودی اور ان کے حلقہ کی طرف سے کیا گیا۔ آج تک بھی مولانا مودودی کے سفرنامہ ارض القرآن میں یہ افسانہ موجود ہے۔ (صفحہ ۱۵۲)

مولانا سید مودودی کے علاوہ آنجہانی مسٹر غلام احمد پرویز نے اس مسئلہ کو اپنے رسالہ ''طلوع اسلام'' میں خوب اچھالا۔

مولانا ابوالکلام پر یہ اعتراض کیا گیا کہ مولانا انسان کی نجات کے لیے صرف توحید کو کافی سمجھتے ہیں۔ نبوت ورسالت پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔

اس قضیہ کے بارے میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی لکھتے ہیں کہ:

> ''قرآن کی تفسیر تو اس طرح لکھی جانی چاہیے اور اس طرح سامنے آنی چاہیے کہ یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کسی خاص علم کلام یا کسی خاص فقہی مکتب فکر کا پابند ہے۔
>
> امام رازی کی تفسیر میں منطق اور فلسفہ کا اتنا غلبہ ہے کہ ان کی تفسیر کے متعلق یہ قول مشہور ہو گیا ہے کہ تفسیر کبیر میں سب کچھ ہے سوائے قرآن کے۔
>
> مولانا آزاد نے اس صورت حال کا اپنے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر علماء منطق اور فلسفہ سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں، فقہ سے بڑا شغف رکھتے ہیں، حدیث سے بھی دلچسپی موجود ہے۔ لیکن اگر دلچسپی نہیں ہے تو قرآن کے معارف، اس کے عرفان، اس کی جاوداں انقلابی دعوت سے، اس کے حقیقی پیغام کی طرف التفات کم سے کم ہے۔ الا ماشاءاللہ
>
> مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں اس بات کی رعایت ملحوظ رکھی کہ قرآن جو بات جس مقام پر کہتا ہے۔ اسے اسی طرح مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ مثلاً سورہ بقرہ کی آیت:
>
> ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرہ:٦٢)

''(جولوگ پیغمبر اسلام پر) ایمان لائے وہ ہوں یا وہ لوگ ہوں جو یہودی کہلاتے ہیں یا نصاریٰ اور صابی ہوں (کوئی بھی ہو) لیکن جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا۔ اور اس کے کام بھی اچھے ہوئے تو وہ اپنے ایمان وعمل کا اجر اپنے پروردگار سے ضرور پائے گا۔ اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا کھٹکا ہے نہ کسی طرح کی غمگینی۔''

اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ اور غلام احمد پرویز نے طلوع اسلام کے ذریعے اس کو خوب اچھالا۔ چونکہ مولانا نے اس آیت کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اگر مولانا آزاد اس کے حاشیہ میں یہ لکھ دیتے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد ایمان کا مفہوم بالکل متعین ہو گیا ہے۔ اور اب اس کا مفہوم یہ ہے کہ نجات اخروی کے لیے اب آں حضرت ﷺ پر ایمان لانا لازم، لابد اور ناگزیر ہے۔ قرآن میں اکثر جہاں بھی ایمان لانے کی دعوت ملے گی وہاں عموماً ایمان کی تفاصیل نہیں ملیں گی۔ آمنـــــوا میں ان تمام امور پر ایمان لانا ضروری ہوگا جن پر جگہ جگہ قرآن ایمان لانے کی مختلف اسالیب سے دعوت دیتا ہے۔ لہٰذا ایمان کی تعریف ہی قرار پا گئی ہے کہ اللہ پر ایمان، یوم آخرت پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، وحی پر ایمان، کتابوں پر ایمان، نبوت ورسالت پر ایمان اور اس پر ایمان کہ حضرت محمد ﷺ آخری نبی اور آخری رسول ہیں اور قیامت تک آپ ﷺ کی دعوت ورسالت کا دَور جاری وساری رہے گا۔

میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ مولانا آزاد ان تمام باتوں کو مانتے تھے۔ لوگوں نے مولانا سے پوچھا، تو مولانا نے جواب دیا کہ میرا عقیدہ وہی ہے جو تمام مسلمانوں کا ہے۔ اور وہ عقیدہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت اور قرآن کے نزول کے بعد اب نجاتِ اخروی کا دارومدار صرف حضور ﷺ کے اتباع اور آپ ﷺ کی اطاعت اور قرآن کی پیروی پر ہے۔ آپ ﷺ سے پہلے رسولوں پر ایمان اور سابقہ کتب سماوی پر ایمان اور ان کے مطابق عمل سے اب

نجات اُخروی نہیں ہوگی۔

پھر مولانا سے سوال کیا گیا کہ آپ نے یہاں یہ بات لکھی کیوں نہیں تو مولانا نے جواب دیا کہ اس مقام پر آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے میں نے اتنی ہی بات پر وہاں اکتفا کیا ہے۔لیکن میں اس کو اس کے مناسب مقام پر مفصل طور پر بیان کردوں گا۔اور اس کی وضاحت کروں گا۔

آپ کے شہر لاہور سے مولانا غلام رسول مہر اور ان کے ساتھ چند دوسرے حضرات مولانا آزاد سے جا کر ملے تھے۔اور اسی مسئلہ پر ان سے سوالات کیے تھے۔مولانا آزاد نے وہی جوابات دیے تھے جن کو میں بیان کر چکا ہوں۔

یہ سوالات و جوابات ''میرا عقیدہ'' کے نام سے اسی زمانے سے مطبوعہ موجود ہیں۔جس میں مولانا آزاد نے صاف لفظوں میں کہا ہے میرا عقیدہ وہی ہے جو تمام مسلمانوں کا ہے۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از سعید احمد اکبرآبادی ص ۵۵،۵۶)

میرا عقیدہ قاضی سید احمد حسین ممبر پارلیمنٹ (بھارت) نے مدون کیا اور مکتبہ جامعہ دہلی نے فروری ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔مولانا غلام رسول مہر نے توضیح لکھی۔مرتب نے پیش لفظ۔خط زیادہ نہیں حکیم سعد اللہ، مولانا مہر اور مولانا ثناء اللہ کے نام پانچ چھ خطوں کا مجموعہ ہے جس میں مولانا نے ان کے استفسار پر اپنے عقیدے سے متعلق بعض غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کا ازالہ کیا ہے۔اور ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسالت کا مقام و محل بیان فرمایا ہے۔

(ابوالکلام آزاد از شورش کاشمیری ص ۳۶۳)

مشہور اہل حدیث عالم دین حضرت مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی (م ۱۹۵۶ء) نے بھی مولانا آزاد کی تفسیر آیت سورۃ فاتحہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا تھا۔اور مولانا سیالکوٹی مرحوم ان دنوں سورۃ فاتحہ کی تفسیر لکھ رہے تھے (یہ تفسیر واضح البیان کے نام سے شائع ہوئی)۔

مولانا غلام رسول مہر سے مولانا آزاد کے تفسیری حواشی کے متعلق ذکر کیا تھا جیسا کہ

مولانا مہر لکھتے ہیں کہ:

''مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی مرحوم ومغفور جس زمانے میں تفسیر سورۃ فاتحہ مرتب فرما رہے تھے، میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ مولانا آزاد کی تفسیر مشمولہ ترجمان القرآن جلد اول پر بعض شبہات وارد کیے جاتے ہیں، ان کا بھی ازالہ فرمادیں۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب نے اس سلسلے میں خدا جانے کس اثر کے ماتحت مناظرانہ رنگ اختیار کرلیا۔ اور اپنی تفسیر میں تحریر فرمایا کہ بعض امور کی توضیح کے لیے مولانا آزاد کو خط بھیجا تھا مگر اس کا جواب نہ ملا۔

میں نے مولانا سے اس باب میں استفسار کیا تو یہ جواب موصول ہوا۔ بحث کو مکمل کرنے کے لیے یہاں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے مولانا محمد ابراہیم صاحب میر کو مولانا کا خط دکھا کر پوچھا کہ آپ کلکتہ میں مولانا سے ملے تو سب کچھ پوچھ کیوں نہ لیا۔ انھوں نے فرمایا بے شک مولانا کے ساتھ ملاقات کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ لیکن رات کے وقت میرے پاؤں میں تکلیف ہوگئی تھی اور نقل وحرکت خالی از تعب نہ رہی۔ نیز ایک رفیق سے مولانا کے ساتھ گفتگو کا ذکر آیا، تو انھوں نے کہا کہ زحمت اٹھا کر جاؤ گے مگر نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔ میں اس رائے سے متاثر ہوا اور نہ گیا۔ یہ تمام حالات میں نے ایک مرتبہ مولانا محمد ابراہیم صاحب میر کے بیان کے مطابق ''انقلاب'' میں بھی شائع کر دیے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد ابراہیم صاحب میر مولانا کی خدمت میں خط بھیجنے اور جواب نہ آنے کا ذکر اپنی تفسیر میں فرما چکے تھے۔ اور یہ حصہ چھپ چکا تھا کہ انہیں کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ملاقات کے لیے مولانا سے کہہ دینے کے باوجود بوجوہ مذکورہ مل نہ سکے۔ اور ان امور کا ذکر کتاب میں نہ آ سکا۔ اس لیے کہ وہ پہلے چھپ چکی تھی۔''

(نقش آزاد ص ۴۵، ۴۶)

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس معاملہ میں دو خط تفصیل سے مولانا مہر کو لکھے تھے۔ یہ

دونوں خط نمبر ۲۳، ۲۴ مہر صاحب نے نقش آزاد میں درج کر دیے ہیں۔

مولانا ابوالکلام نے اپنی تفسیر کا نام حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لقب "ترجمان القرآن" کے نام پر رکھا۔ امت میں ابن عباسؓ اسی لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ اور متقدمین علماء میں علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱) نے بھی اپنی تفسیر کا نام ترجمان القرآن رکھا۔ (تاریخ تفسیر ۲۲۹)

حضرت والا جاہ محی السنہ مولانا سید نواب صدیق حسن خان قنوجی (م ۱۳۰۷ھ) نے اُردو زبان میں جو تفسیر لکھی تھی۔ اس کا نام بھی ترجمان القرآن ہے۔

مولانا آزاد نے قرآن مجید کا ترجمہ قرآن ہی کے الفاظ میں کیا ہے۔

آغا شورش کاشمیری مرحوم لکھتے ہیں کہ:

"مولانا سے پہلے قرآن پاک کے تراجم عربی آیات کے الفاظ کا تحتانی ترجمہ تھے۔ یعنی جس ترتیب سے سورۃ کے الفاظ تھے اسی ترتیب سے الفاظ کے نیچے ان کا ترجمہ تھا۔ ان ترجموں میں الفاظ کے لغوی معنوں کا التزام کیا جاتا لیکن اس طرح نہ تو کلام پاک میں زور پیدا ہوتا اور نہ وہ دلنشینی ابھرتی جو قرآن پاک کی دعوت کا سحر ہے۔ مولانا نے اس روش کو یک قلم موقوف کر دیا۔ وہ اردو زبان کے پہلے مترجم و مفسر ہیں جنھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ قرآن ہی کے الفاظ میں اس شکوہ سے کیا ہے کہ داغ کا وہ شعر بامعنی ہوگیا:

احمد پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور
ورنہ قرآن بھی آتا بزبانِ اُردو

سجاد علی انصاری نے کہا تھا کہ قرآن پاک نازل نہ ہو چکا ہوتا تو مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم۔ سید سلیمان ندوی نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ترجمہ صحیح، دلنشیں، مؤثر اور باوقار ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی رقم طراز تھے کہ مولانا ابوالکلام الفاظ کو نبوت والوہیت کا جامہ پہنا دیتے تھے۔"

(ابوالکلام آزاد از شورش کاشمیری ص ۳۱۳)

انتساب

''غالباً دسمبر ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے میں رانچی میں نظر بند تھا، عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر نکلا، تو مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص پیچھے آ رہا ہے۔ مڑ کر دیکھا کہ ایک شخص کمبل اُوڑھے کھڑا تھا۔

آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

ہاں جناب! میں بہت دور سے آیا ہوں

کہاں سے

سرحد پار سے

یہاں کب پہنچے

آج شام کو پہنچا ہوں، میں بہت غریب آدمی ہوں، قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے۔ انھوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرہ پہنچا دیا۔ آگرہ سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔

افسوس تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی۔

اس لیے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا، اور پھر یکا یک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لیے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا کہ میں واپسی کے مصارف کے لیے روپیہ دوں گا۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔

مجھے اس کا نام یاد نہیں، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہے یا نہیں لیکن اگر میرے حافظہ نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اس کے نام سے منسوب کرتا۔''

ابوالکلام

کلکتہ

۱۲ستمبر ۱۹۳۱ء

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن کے انتساب میں جس آدمی کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بارے میں پتہ نہ چل سکا کہ وہ کون آدمی تھا، اور اس کا کیا نام تھا۔ آخر حکیم فضل الرحمٰن خان سواتی کے ذریعے معلوم ہوا کہ وہ شخص مولوی دین محمد قندھاری تھے۔ جو مولانا آزاد کے پاس قرآن کریم کے بعض مقامات کے مطالب ومعانی سمجھنے کے لیے رانچی گئے تھے۔

اس کی تفصیل مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب نے اپنی کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں مولانا ابوالکلام کے حالات میں درج ذیل الفاظ میں بیان کی ہے۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں کہ:

''۱۹۲۷ء کی بات ہے کہ حکیم فضل الرحمٰن صاحب پٹیالہ جارہے تھے۔ دہلی کے اسٹیشن پر چند پٹھان ان کے ڈبے میں آکر بیٹھے، ان سے بات چیت ہوئی تو پتہ چلا کہ ان میں سے ایک شخص مولوی دین محمد قندہاری کے شاگرد ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں مولوی صاحب نے وفات پائی تو اس کے بعد وہ دلی آگئے اور اب مسجد فتح پوری کے مدرسے میں داخل ہیں اور درجہ آخر میں تعلیم پا رہے ہیں۔

حکیم صاحب نے مولوی دین محمد قندہاری کے اس شاگرد سے پوچھا کہ ۱۹۱۶ء میں مولوی عبدالحنان نعمانی سے معلوم ہوا تھا کہ مولوی دین محمد قندہاری نے مولانا ابوالکلام آزاد کے قائم کردہ ''دارالارشاد'' میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تھا۔

شاگرد نے کہا یہ صحیح ہے کہ وہ ''دارالارشاد'' میں داخل ہونا چاہتے تھے لیکن جنگ عمومی کی وجہ سے انہیں راہ داری کا پروانہ نہیں مل رہا تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد یہ پابندی اٹھ گئی اور وہ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچے۔ اور پھر وہاں اُنھیں اُن کے تین ہم وطن سوداگر مل گئے۔ جن میں ایک بیمار تھا۔ اور وہ اپنے علاج کے لیے دہلی جارہا تھا۔ مولوی صاحب کا مقصد معلوم کر کے ان تینوں نے کوئٹہ سے آگرہ تک کا ٹکٹ ان کے لیے بھی خرید لیا۔ دوران سفر مولوی صاحب نے بیمار سوداگر کی بڑی خدمت کی، اور اس طرح انھوں نے احسان کا بدلہ ادا کیا۔ اس وقت مولانا آزاد چونکہ کلکتہ سے خارج البلد ہو چکے تھے۔ اور

رانچی میں نظر بند کر دیے گئے تھے۔ اس لیے مولوی دین محمد قندہاری آگرہ سے رانچی پہنچے۔ چند دن وہاں مقیم رہے اور پھر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ جیسا کہ مولانا آزاد نے اپنے انتساب میں ظاہر فرمایا ہے۔

جب ۱۹۳۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر چھپی تو ایک مدت تک حکیم فضل الرحمٰن صاحب کو اس کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ جب ۱۹۳۸ء میں یہ تفسیر دیکھی تو فوراً ان کے ذہن میں یہ بات آئی۔ اور خیال کیا کہ جس شخص کی طرف اس کا انتساب کیا گیا ہے۔ وہ مولوی دین محمد قندہاری ہیں۔ مگر اس ضمن میں ان کو براہ راست مولانا ابوالکلام آزاد سے رجوع کرنے کا موقع نہیں ملا۔

کانگریس نے صوبائی وزارتیں چھوڑ کر پھر سے انگریزی حکومت کے خلاف تحریک شروع کر دی تھی۔ تمام رہنما جیلوں میں چلے گئے تھے۔ مولانا آزاد کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان حالات میں اس مسئلے کی تحقیق کرنا مشکل امر تھا۔ اور مولانا سے دریافت کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ لیکن جب ۱۹۴۵ء جنگ ختم ہونے کے بعد تمام کانگریسی رہا ہوئے۔ اور اکتوبر کے مہینے میں کانگریس کا اجلاس بمبئی میں میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت حضرت مولانا آزاد کے سپرد تھی۔ اس وقت مولانا فضل الرحمٰن آمبور میں تھے۔ آمبور ہی سے کانگریس کے اجلاس شرکت کے لیے بمبئی آ گئے۔ اور اپنے ایک دوست میرزا خان صاحب کے مکان پر قیام فرمایا۔

اجلاس سے ایک دن پہلے وہ حضرت مولانا سے ملنے کے لیے بھولا بھائی ڈیسائی کے بنگلے میں پہنچے۔ یہاں مولانا فروکش تھے۔ مولانا کے سیکرٹری محمد اجمل خان صاحب سے ملاقات ہوئی اور مولانا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اجمل خاں صاحب نے صاف کہہ دیا کہ مولانا اس وقت بہت مصروف ہیں کسی سے مل نہیں سکتے۔ اجلاس ختم ہو جانے کے بعد آ کر ملو۔

یہ الفاظ سن کر حکیم فضل الرحمٰن صاحب اور میرزا خان صاحب جو حکیم صاحب کے میزبان تھے واپس لوٹے اور موٹر میں بیٹھ گئے۔ موٹر کو اسٹارٹ کرنے کی

کوشش کی وہ اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ مشین کی دیکھ بھال میں کچھ وقت صرف ہو گیا۔ اتنے میں دیکھا کہ بنگلے سے ایک کار نکلی جس میں چند افراد کے ساتھ اجمل خان صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔ میرزا صاحب نے حکیم صاحب سے کہا کہ اب بہت اچھا موقع ہے مانع چلا گیا ہے۔ آپ ایک دفعہ پھر قسمت آزمائی کر لیں۔

بنگلے میں گئے تو بھولا بھائی ڈیسائی کے صاحبزادے دھیرو سے ملاقات ہوئی انھوں نے پوچھا، مولانا آزاد سے ملنے آئے ہیں۔

جواب دیا۔ ہاں

پوچھا، پہلے سے ملاقات ہے۔

بتایا، جی ہاں

کہا، اپنا وزیٹنگ کارڈ دیجیے۔

حکیم صاحب نے کہا وزیٹنگ کارڈ تو نہیں ہے۔

دھیرو نے ایک سلپ دے کر کہا کہ اس پر اپنا نام اور پتہ لکھ دیجیے۔

حکیم صاحب نے اس پر انوری کا حسب ذیل قطعہ لکھ کر اس کے نیچے اپنا نام لکھا۔

اے خداوندے کہ از یام اگر خواہی بیابی
جز نظر خویش دیگر ہر جہت از خاطر بیاید
کمترین بندگانت انوری بر در ستادہ
چوں حوادث باز گر دریا چو اقبال اندر آید

العبد المذنب
حکیم فضل الرحمٰن سواتی
خدائی خدمتگار

والنٹیر یہ سلپ اندر لے کر گیا۔ پھر فوراً ہی پلٹ آیا اور کہا چلیے۔

مولانا آپ کو بلا رہے ہیں۔
دھیر و حیران رہ گیا کہ اس قدر جلد باز یابی کیسے حاصل ہو گئی۔
مولانا نے حکیم صاحب کو دیکھتے ہی فرمایا۔ کیا آپ کے پاس انوری کا کلیات ہے۔
حکیم صاحب نے جواب دیا، انوری کا کلیات نہیں ہے۔ مگر مجھے یہ قطعہ شیرانی کے ایک مضمون میں ملا تھا۔
مولانا نے فرمایا، کون شیرانی، وہی تو نہیں جنہوں نے مولانا شبلی کا تعاقب کیا تھا۔
حکیم صاحب نے کہا، ہاں وہی پروفیسر محمود شیرانی۔
مولانا نے فرمایا بہت زیادہ تعاقب کیا ہے۔ حد سے آگے بڑھ گئے ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔
چونکہ مولانا بہت مصروف نظر آرہے تھے اس لیے فوراً حکیم صاحب نے گفتگو کا موضوع بدلا اور کہا، مولانا! آپ نے اپنی تفسیر کا جس شخص کی طرف انتساب کیا ہے وہ مولوی دین محمد قندہاری ہیں۔ پھر اس کی توضیح کرتے ہوئے حکیم صاحب نے کہا کہ ۱۹۱۶ء میں مولوی عبدالحنان سے افغانستان میں معلوم ہوا تھا کہ مولوی دین محمد قندہاری آپ کے قائم کیے ہوئے دارالارشاد میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ مگر چند روز بعد معلوم ہوا کہ آپ کلکتہ سے خارج البلد کر دیے گئے ہیں اور رانچی میں نظر بند ہیں۔ مولوی دین محمد قندہاری کے ایک شاگرد سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب قندہار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچے۔ پھر اس کے تین ہم وطن سوداگر انہیں کوئٹہ سے آگرہ لے آئے۔ وہاں سے وہ آپ کی خدمت میں پہنچے۔ کچھ دن آپ کے پاس رہے پھر وہاں سے روانہ ہو گئے جیسا کہ آپ نے انتساب میں فرمایا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں مولوی دین محمد قندہاری کا انتقال ہو گیا۔ وہ آپ کی تفسیر نہ دیکھ سکے۔

یہ سن کر مولانا سوچ میں پڑ گئے۔ پھر فرمایا علامات تو بالکل ٹھیک ہیں۔

حکیم صاحب نے کہا، ان کی سب سے بڑی علامت ان کا کمبل ہے جس کا آپ نے ذکر فرمایا ہے۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ کمبل کے عادی تھے۔ کبھی اپنے ساتھ بستر نہیں رکھا، ان کا اوڑھنا بچھونا اور تکیہ سب کچھ کمبل ہی تھا۔ اس وجہ سے طلباء نے ان کو ''شڑے قندھاری'' کا لقب دیا تھا۔ کیونکہ شڑے ''پشتو'' میں کمبل کو کہتے ہیں۔

اس پر مولانا نے فرمایا: واقعی بڑے سادہ مزاج بزرگ تھے۔ علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ تمام علوم پر اچھا عبور حاصل تھا۔ پہلے پہل جب معلوم ہوا کہ یہ متبحر عالم ہیں تو میں سمجھا شاید معترض بن کر آئے ہیں۔ ان کے علمی ذوق اور اس راہ میں طلب صادق اور جستجو سے میں بہت متاثر ہوا۔ تاریخ میں ایسی مثالیں تو بکثرت ملتی ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے ایک ایک مسئلے اور حدیث کی چھان بین کے لیے بہت دور دراز تک کا سفر کیا۔ مگر یہ بزرگ اپنی مثال آپ تھے۔ میں نے ان سے نام پوچھا نہ تھا۔ اور نہ انھوں نے بتایا تھا۔ اور اس کے جاننے کے لیے کبھی ضرورت بھی پیش نہیں آئی تھی۔ میں نے ان کے کھانے کا انتظام کر دیا تھا اور رہتے مسجد میں تھے۔ خاص وقتوں میں آتے تھے اور کچھ پوچھ کر چلے جاتے تھے۔ اچانک وہ غائب ہو گئے اور مجھے پتہ نہیں چلا کہ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔

حکیم صاحب نے مولانا سے کہا کہ اب جب کہ بات واضح ہو چکی ہے اور مولوی دین محمد قندھاری بھی زندہ نہیں رہے تو ان کے نام کی تصریح کر دینے میں کیا حرج ہے۔

مولانا نے فرمایا: ابہام تصریح سے اچھا ہے۔

''الابھام افصح من التصریح ''

مشہور مقدمہ آپ نے بھی سنا ہوگا۔

حکیم صاحب کی اس سے تشفی ہوگئی۔اور وہ اجازت لے کر چلے آئے۔چونکہ مولانا آزاد نے تصریح نہیں چاہی۔اس لیے پھر اس واقعے کی طرف حکیم صاحب کا خیال بھی نہیں گیا۔''

(بزم ارجمنداں ص ۱۱۶ تا ۱۲۰)

ترجمان القرآن وہ آئینہ ہے جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی ودینی اور ادبی شخصیت پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ملتی ہے۔

ترجمان القرآن ایسی تفسیر ہے کہ جو ایک طرف حدیث وسنت کا پختہ رنگ اپنے اندر رکھتی ہے اور اس کے ساتھ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کے مشرب کی ترجمان ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

''میں نے قرآن کی جس قدر تفاسیر پڑھی ہیں ان میں ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کی تفاسیر سے بہتر کوئی تفسیر نہیں۔ترجمان القرآن کا مصنف قابل مبارک باد ہے کہ اس نے یورپی سامراج کے زمانہ میں بڑی ہمت اور دلیری سے ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی اس صورت میں پیروی کی ہے جس طرح انھوں نے منگول فاتحوں کی مزاحمت کے سلسلہ میں کی تھی۔'' (مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت)

مولانا غلام رسول مہر نے ایک طویل مقالہ ''ترجمان القرآن فضائل ومحاسن'' کے عنوان سے لکھا ہے۔یہ مقالہ ۴۷ صفحات پر محیط ہے۔اور پروفیسر افضل حق قرشی صاحب کی کتاب ''ابوالکلام آزاد (ادبی وشخصی مطالعہ)'' میں درج ہے۔اس مقالہ کے ذیلی عنوانات درج ذیل ہیں۔

تمہید،مولانا کا بیان،بنیادوں کی استواری،میری گزارشات کے حدود،تفسیر وترجمہ ور حواشی،مشکلات کار،چند ضروری نکتے تفسیر بالرائے تفسیر فاتحہ،فاتحہ کے نام اور مطالب،اسلوب بیان اور مجمل تفسیر،نظام ربوبیت،مبدائے استدلال،نظام رحمت،عقائد کا ذہنی تصور اور رحمت،انجیل اور قرآن،مخالفوں کی شدت،صفت عدالت،صفات الٰہی کا

تصور، نزول قرآن کے وقت دنیا کے تصورات، قرآنی تصور، معلم کی شخصیت، صفات کی قدرتی تربیت، صراط مستقیم، ہدایت وحی ونبوت، گروہ بندی نہیں، عقیدہ وعمل، کامیابی اور فلاح کی راہ، قرآنی قصص اور تاریخی استقراء، وحدت دین کی اصل عظیم، جمعیت بشری میں ہدایت وحی کا ظہور، الدین اور الشرع، قرآن کی دعوت، المعروف اور المنکر، الدین القیم اور فطرت اللہ، نزاع کی تین بنیادیں، شرع ومنہاج کا معاملہ، سیرۃ النبی کے اقتباسات، دین الٰہی کی وحدت، گم شدہ صدائے حق کی تکرار، ہماری حالت، فاتحہ کی تعلیمی روح، مردراوی کے حدود، ترجمان القرآن کے نوٹ، جامعیت کی ایک مثال، ایمان وعمل، قانون الٰہی، صبر اور نماز، دینداری اور دنیوی معیشت، مرد اور عورت کے حقوق، لا اکراہ فی الدین، تقویٰ کی تشریح، معنی تسخیر، بنائے کار اصول وعقائد میں، غیب وشہادت اور محکمات ومتشابہات۔

جلد دوم ۔حقائق ونظر، قرآن کا اسلوب بیان، خدا کی مخفی تدبیریں، دعوت حق کی حیات بخشی، سیرت طیبہ کا نچوڑ، حب ایمانی اور حب دنیا، دفاع ملت اور قومی فرض، علماء ومشائخ کو پروردگار بنانا، اصلاح کنیسہ کی اصل بنیاد، مسلمانوں کی حیرانی وبے چارگی، رضوا عنہ کا مقام، ایمان افروز مثالیں، تذکیر وتوکیل، مسئلہ معیشت اور تساوی حال، مقام محمود، قرآن مجید کے علمی سانچے، دعوت حق کا طریقہ، ادوارِ گذشتہ کے متعلق سوال، انسانی طبیعت کا خاصہ، حضرت یوسفؑ، آخری گزارش۔

تفسیر الفاتحہ

ترجمان القرآن میں سورۃ فاتحہ کی تفسیر مولانا ابوالکلام آزاد کی قرآنی بصیرت کا عظیم الشان شاہکار اور بے مثال کارنامہ ہے ۔اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور توحید وایمان باللہ پر علم وتحقیق، معرفت ومحبت کے جو اسرار وحکم شرح وبسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں ۔متقدمین اور متاخرین کی کتابوں میں ایک جگہ یہ سارے معارف توحید نظر نہیں آتے ۔مولانا آزاد نے قرآن کریم کی اس بنیادی سورۃ کے تمام مباحث کو کمال جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے ۔اور اس سورۃ کی اہمیت اور خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں:

یہ قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے۔اس لیے ''فاتحۃ الکتاب'' کے نام سے پکاری جاتی ہے۔جو بات زیادہ اہم ہوتی ہے قدرتی طور پر پہلی اور نمایاں جگہ پاتی ہے۔یہ سورت قرآن مجید کی تمام سورتوں میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔اس لیے قدرتی طور پر اس کی موزوں جگہ قرآن کے پہلے صفحے ہی ہیں۔چنانچہ خود قرآن نے اس کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا ہے جس سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ﴾

''اے پیغمبر! یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تمہیں سات دہرائی جانے والی چیزیں عطا فرمائیں اور قرآن عظیم۔'' (۱۵۔۸۷)

احادیث وآثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں سات دہرائی جانے والی چیزوں سے مقصود یہی سورت ہے۔کیونکہ یہ سات آیتوں کا مجموعہ ہے اور ہمیشہ نماز میں دہرائی جاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس سورت کو ''السبع المثانی'' بھی کہتے ہیں۔(صحیح بخاری)

احادیث وآثار میں اس کے دوسرے نام بھی آتے ہیں۔جن سے ان کی خصوصیت کا پتہ چلتا ہے۔مثلاً ام القرآن، الکافیہ، الکنز، اساس القرآن۔(موطا)

عربی میں ''ام'' کا اطلاق تمام ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت رکھتی ہوں، یا بہت سی چیزوں میں مقدم اور نمایاں ہوں یا پھر کوئی ایسی اوپر کی چیز ہو جس کے نیچے میں اس کے بہت سے توابع ہوں۔چنانچہ سر کے درمیانی حصے کو ''ام الرأس'' کہتے ہیں کیونکہ وہ دماغ کا مرکز ہے۔فوج کے جھنڈے کو ''ام'' کہتے ہیں کیونکہ تمام فوج اس کے نیچے جمع ہوتی ہے۔مکہ کو ام القریٰ کہتے تھے کیونکہ خانہ کعبہ اور حج کی وجہ سے عرب کی تمام آبادیوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی۔اس سورۃ کو ام القرآن کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایک ایسی سورت ہے جس میں مطالب قرآنی کی جامعیت اور مرکزیت ہے۔یا جو قرآن کی تمام سورتوں میں اپنی نمایاں اور مقدم جگہ رکھتی ہے۔

اساس القرآن کے معنی ہیں قرآن کی بنیاد۔الکافیہ کے معنی ہیں ایسی چیز جو کفایت

کرنے والی ہو۔ الکنز خزانہ کو کہتے ہیں۔

علاوہ بریں ایک سے زیادہ حدیثیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کے یہ اوصاف عہد نبوت میں عام طور پر مشہور تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابی بن کعبؓ کو یہ سورت تلقین کی۔ اور فرمایا: ''اس کے مثل کوئی سورت نہیں۔'' ایک دوسری روایت میں ہے کہ اسے سب سے بڑی سورت اور سب سے بہتر سورت بھی فرمایا ہے۔

(ترجمان القرآن جلد اول مطبوعہ سندھ ساگر اکیڈمی ص ۹۳، ۹۴)

اس کے بعد مولانا لکھتے ہیں:

فاتحہ کے مطالب سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کی تمام سورتوں میں دین حق کے جو مقاصد تفصیلاً بیان کیے گئے ہیں۔ اس سورت میں انہیں بہ شکل اجمال بیان کیا گیا ہے۔ اگر ایک شخص قرآن سے اور کچھ نہ پڑھ سکے صرف اس سورت کے مطالب ذہن نشین کر لے۔ جب بھی وہ دین حق اور خدا پرستی کے بنیادی مقاصد معلوم کر لے گا اور یہی قرآن کی تمام تفصیلات کا ماحصل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان کے لیے اس سورۃ کا سیکھنا اور پڑھنا ناگزیر ہوا۔ اور نماز کی دعا اس کے سوا کوئی نہ ہو سکی کہ "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" (صحیحین)

اور اسی لیے صحابہ کرامؓ اسے ''سورۃ الصلوٰۃ'' کے نام سے پکارتے تھے یعنی وہ سورت جس کے بغیر نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔ ایک انسان اس سے زیادہ قرآن مجید میں سے جس قدر پڑھے اور سیکھے، مزید معرفت و بصیرت کا ذریعہ ہوگا لیکن اس سے کم کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

(ترجمان القرآن جلد اول ص ۹۴، ۹۵)

مالک یوم الدین

مولانا آزاد نے سورۃ فاتحہ کی آیت مالک یوم الدین کی تفسیر میں ''توحید فی الصفات'' اور ''مقام نبوت کی حد بندی'' پر بڑے عمدہ الفاظ میں بحث فرمائی ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

توحید فی الصفات

مولانا آزاد لکھتے ہیں:

لیکن قرآن نے توحید فی الصفات کا ایک ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی لغزشوں کے تمام دروازے بند ہوگئے۔اس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی راہیں بھی بند کر دیں۔اور یہی اس باب میں اس کی خصوصیت ہے۔

وہ کہتا ہے کہ ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا ہی کی ذات ہے۔پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔''وہ کہتا ہے'' یہ اس کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلب کاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کرلیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کرلیا۔وہ کہتا ہے دعا، استعانت، رکوع، سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل، اور اسی طرح کے تمام عبادات گزارانہ اور نیاز مندانہ اعمال وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں۔پس اگر ان اعمال میں تم نے کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کرلیا تو خدا کے رشتہ معبودیت کی یگانگی باقی نہ رہی، اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں، اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمھارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے، وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے بھی پیدا کرلیا تو تم نے اسے خدا کا ندیعنی شریک ٹھہرالیا۔اور توحید کا اعتقاد درہم برہم ہوگیا۔

یہی وجہ ہے کہ سورۃ فاتحہ میں ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنَ﴾ کی تلقین کی گئی۔ اس میں اول تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔پھر دونوں کی جگہ مفعول کو مقدم کیا جو مفید حصر ہے۔یعنی ''صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں'' اس کے علاوہ تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور رد شرک پر زور دیا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی سورت بلکہ کوئی صفحہ اس سے خالی ہو۔

(ترجمان القرآن جلد اول مطبوعہ سندھ ساگر اکیڈمی ص ۳۴۰)

مقام نبوت کی حد بندی

سب سے زیادہ اہم مسئلہ مقام نبوت کی حد بندی کا تھا۔یعنی معلم کی شخصیت کو اس کی اصلی جگہ میں محدود کر دینا تاکہ شخصیت پرستی کا ہمیشہ کے لیے سد باب ہو جائے۔اس بارے میں قرآن نے جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں جابجا پیغمبر اسلام ﷺ کی بشریت اور بندگی پر زور دیا ہے محتاج بیان نہیں۔ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے۔ اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ جو قرار دیا ہے۔وہ سب کو معلوم ہے۔اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ " یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد ﷺ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔'' اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ کی بندگی اور درجہ رسالت کا بھی اعتراف کیا گیا ہے۔غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں کیا گیا۔صرف اس لیے کہ پیغمبر اسلام کی بندگی اور درجہ رسالت کا اعتقاد اسلام کی اصل اساس بن جائے۔اور اس کا کوئی موقع باقی نہ رہے کہ عبدیت کی جگہ معبودیت کا اور رسالت کی جگہ اوتار کا تخیل پیدا ہو۔ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اس معاملہ کا تحفظ کیا کیا جا سکتا تھا۔کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خدا کی توحید کی طرح پیغمبر اسلام ﷺ کی بندگی کا بھی اقرار نہ کرے۔یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں پیغمبر اسلام ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہوئے۔لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں کبھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوا۔ابھی ان کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے برسر منبر اعلان کر دیا تھا: من کان منکم یعبدمحمدا فان محمدا قدمات ومن کان منکم یعبدالله فان الله حی لا یموت " جو کوئی تم میں محمد ﷺ کی پرستش کرتا تھا۔اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمد ﷺ نے وفات پائی۔اور جو کوئی تم میں سے اللہ کی پرستش کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اس کے لیے موت نہیں۔''

(ترجمان القرآن جلد اول ص ۲۴۱)

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْم

سورۃ فاتحہ کی اس آیت اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْم میں قرآن کی دعوت، تفریق بین الرسل، خدا کی سچائی، اس کی عالمگیر بخشش کا بیان ہے ان کے ساتھ ساتھ المعروف اور المنکر اور الاسلام جیسے عنوانات کے تحت مولانا آزاد درج ذیل الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

قرآن کی دعوت

قرآنی دعوت کی پہلی بنیاد یہی ہے کہ تمام ادیان حق کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے۔ وہ سب سچائی کی تعلیم دینے والے تھے اور سب نے ایک اصل قانون کی تعلیم دی۔ خدا کے رسولوں میں بہ اعتبار تصدیق، تفرقہ و امتیاز قرآن کے نزدیک بہت بڑی گمراہی ہے۔ ہر راست باز انسان کا یہ شیوہ ہونا چاہیے کہ وہ کہے سچائی جہاں کہیں بھی ظاہر ہوئی اور جس کی زبان سے بھی ظاہر ہوئی سچائی ہے اور اس پر ایمان ہے۔ خدا ایک ہے اس کی سچائی ایک ہے لیکن سچائی کا پیغام بہت سی زبانوں نے پہنچایا۔ اگر ایک کی تصدیق کرتے ہو دوسرے کا انکار، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک حقیقت کو مانتے بھی ہو اور رد بھی کرتے ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا ماننا ماننا ہی نہیں بلکہ بُری قسم کا انکار ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی بات بھی قرآن کے صفحوں پر اس درجہ نمایاں نہیں ہے جس قدر یہ بات ہے۔ اس نے بار بار صاف اور قطعی لفظوں میں اس حقیقت کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ کسی نئی مذہبی گروہ بندی کی دعوت لے کر نہیں آیا بلکہ چاہتا ہے کہ تمام مذہبی گروہ بندیوں کی جنگ و نزاع سے دنیا کو نجات دلا دے۔ سب کو اسی ایک راہ پر جمع کر دے جو سب کی مشترک اور متفقہ راہ ہے۔

وہ بار بار کہتا ہے جس راہ کی میں دعوت ہوں وہ کوئی نئی راہ نہیں ہے اور نہ سچائی کی راہ نئی ہوسکتی ہے۔ یہ وہی راہ ہے جو اول روز سے موجود ہے اور تمام مذاہب کے داعیوں نے اسی بات کی طرف بلایا ہے۔

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوحًا وَّالَّذِيْ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَالَّذِيْ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى اَنْ اَقِيْمُوْا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا﴾ (۴۲-۱۳)

''اور دیکھو! اس نے تمہارے لیے دین کی وہی راہ ٹھہرائی ہے جس کی وصیت نوح (علیہ السلام) کو کی گئی تھی۔ اور جس پر چلنے کا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو حکم دیا تھا۔ ان سب کی تعلیم یہی تھی کہ الدین (یعنی خدا کا ایک ہی دین) قائم رکھو۔ اور اس راہ میں الگ الگ نہ ہو جاؤ۔''

سورۃ نساء میں ہے:

﴿اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ﴾ (۴-۱۶۳، ۱۶۴)

''اے پیغمبر! میں نے تمہیں اسی طرح اپنی وحی سے مخاطب کیا ہے جس طرح نوح (علیہ السلام) کو کیا تھا۔ اور ان تمام نبیوں کو کیا تھا جو نوح کے بعد ہوئے۔ نیز جس طرح ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اولاد یعقوب عیسیٰ، ایوب، یونس ہارون، سلیمان وغیرھم کو مخاطب کیا اور داؤد کو زبور عطا کی۔ علاوہ بریں وہ رسول جن میں سے بعض کا حال ہم تمہیں پہلے سنا چکے اور بعض ایسے ہیں جن کا حال تمہیں نہیں سنایا۔''

سورۃ انعام میں پچھلے رسولوں کا ذکر کر کے پیغمبر اسلام (ﷺ) کو مخاطب کیا ہے اور کہا ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ﴾ (۶-۹)

''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے راہ حق دکھائی۔ پس (اے پیغمبر) تم بھی انہیں

کی ہدایت کی پیروی کرو۔‘‘

(ترجمان القرآن جلد اول ص ۳۹۶)

تفریق بین الرسل

قرآن نے اس آیت میں اور نیز متعدد موقعوں پر ’’تفریق بین الرسل‘‘ کو ایک بہت بڑی گمراہی قرار دیا ہے۔ اور سچائی کی راہ یہ بتائی ہے کہ تفریق بین الرسل سے انکار کیا جائے۔ تفریق بین الرسل کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے رسولوں میں بہ اعتبار تصدیق تفرقہ وامتیاز کرنا۔ یعنی ایسا سمجھنا کہ ان میں فلاں سچا تھا اور فلاں سچا نہ تھا۔ یا کسی ایک کی تصدیق کرنی، باقی سب کا انکار کر دینا یا سب کی تصدیق کرنی کسی ایک کا انکار کر دینا۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر راست باز انسان کا جو خدا کے سچے دین پر چلنا چاہتا ہے۔ فرض ہے کہ بلا کسی امتیاز کے تمام رسولوں، تمام کتابوں، تمام مذہبی دعوتوں پر ایمان لائے۔ اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کرے۔ اس کا شیوہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ کہے سچائی جہاں کہیں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اور جس کی زبان پر بھی ظاہر ہوتی ہے سچائی ہے۔ اور میرا اس پر ایمان ہے۔

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ (۲۔۲۸۵)

’’اللہ کا رسولؐ اس (کلام حق) پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے۔ اور وہ لوگ بھی جو ایمان لائے ہیں یہ سب اللہ پر اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں (ان کے ایمان کا دستور العمل یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں) ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کو دوسرے سے جدا نہیں کرتے۔ (کہ کسی کو مانیں، کسی کو نہ مانیں) انھوں نے کہا! خدایا ہم نے تیرا پیام سنا اور تیری فرمانبرداری کی۔ ہمیں تیری مغفرت نصیب ہو ہم سب کو بالآخر تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔‘‘

وہ کہتا ہے خدا ایک ہے، اس کی سچائی ایک ہے۔ لیکن سچائی کا پیغام بہت سی زبانوں

نے پہنچایا ہے پھر اگر تم کسی ایک پیغام بر کی تصدیق کرتے ہو۔ دوسرے کا انکار کر دیتے ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک ہی حقیقت کو ایک جگہ مان لیتے ہو، دوسری جگہ ٹھکرا دیتے ہو، یا ایک ہی بات کو مانتے بھی ہو، رد بھی کرتے ہو، ظاہر ہے کہ ایسا ماننا، ماننا نہیں بلکہ ایک زیادہ بُری قسم کا انکار ہے۔

خدا کی سچائی اس کی عالمگیر بخشش ہے

وہ کہتا ہے خدا کی سچائی اس کی ساری باتوں کی طرح اس کی عالمگیر بخشش ہے وہ نہ تو کسی خاص زمانے سے وابستہ کی جاسکتی ہے نہ کسی خاص نسل وقوم سے اور نہ کسی خاص مذہبی گروہ بندی سے، تم نے اپنے لیے طرح طرح کی قومیں اور جغرافیائی اور نسلی حد بندیاں بنالی ہیں۔ لیکن تم خدا کی سچائی کے لیے کوئی ایسا امتیاز نہیں گھڑ سکتے۔ اس کی نہ قومیت ہے نہ نسل ہے نہ جغرافیائی حد بندی ہے نہ جماعتی حلقہ بندی وہ خدا کے سورج کی طرح ہر جگہ چمکتی اور نوع انسانی کے ہر فرد کو روشنی بخشتی ہے۔ اگر تم خدا کی سچائی کی ڈھونڈ میں ہو تو اسے کسی ایک گوشے میں نہ ڈھونڈو۔ وہ ہر جگہ نمودار ہوئی ہے۔ اور ہر عہد میں اپنا ظہور رکھتی ہے۔ تمہیں زمانوں کا، قوموں کا، وطنوں کا، زبانوں کا، اور ہر طرح کی گروہ بندیوں کا پرستار نہیں ہونا چاہیے۔ صرف خدا کا اور اس کی عالمگیر سچائی کا پرستار ہونا چاہیے۔ اس کی سچائی جہاں کہیں بھی آئی ہو اور جس بھیس میں آئی ہو تمہاری متاع ہے۔ اور تم اس کے وارث ہو۔

(ترجمان القرآن جلد اول ص ۳۹۸، ۴۰۰)

المعروف اور المنکر

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نیکی کے لیے ''معروف'' اور برائی کے لیے ''المنکر'' کے لفظ اختیار کیے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

معروف عرف سے ہے جس کے معنی پہچاننے کے ہیں۔ پس معروف وہ بات ہوئی جو جانی پہچانی بات ہے۔ منکر کے معنی انکار کرنے کے ہیں۔ یعنی ایسی بات جس سے عام طور پر انکار کیا گیا ہو۔ پس قرآن نے نیکی اور برائی کے لیے یہ الفاظ اس کے لیے اختیار کیے کہ وہ

کہتا ہے۔ دنیا میں عقائد وافکار کا کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے اچھے ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ اور کچھ باتیں ایسی ہیں کہ جن کے برے ہونے پر سب متفق ہیں۔ مثلاً اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ دیانتداری اچھی بات ہے بددیانتی برائی ہے۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ ماں باپ کی خدمت، ہمسایہ سے حسن سلوک، مسکینوں کی خبر گیری، مظلوم کی دادرسی، انسان کے اچھے اعمال ہیں۔ اور ظلم اور بدسلوکی برے اعمال ہیں۔ گویا یہ وہ باتیں ہوئیں جن کی اچھائی عام طور پر جانی بوجھی ہوتی ہے۔ اور جن کے خلاف جانا عام طور پر قابل انکار واعتراض ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب، دنیا کے تمام اخلاق، دنیا کی تمام حکومتیں، دنیا کی تمام جماعتیں، دوسری باتوں میں کتنا ہی اختلاف رکھتی ہوں، لیکن جہاں تک ان اعمال کا تعلق ہے سب ہم آہنگ، ہم رائے ہیں۔

قرآن کہتا ہے یہ اعمال جن کی اچھائی عام طور پر نوع انسانی کی جانی بوجھی ہوتی ہے۔ دین الٰہی کے مطلوبہ اعمال ہیں۔ اسی طرح وہ اعمال جن سے عام طور پر انکار کیا گیا ہے اور جن کی برائی پر تمام مذاہب متفق ہیں۔ دین الٰہی کے ممنوعہ اعمال ہیں۔ یہ بات چونکہ دین کی اصلی حقیقت تھی اس لیے اس میں اختلاف نہ ہوسکا۔ اور مذہبی گروہوں کی بے شمار گمراہیوں اور حقیقت فراموشیوں پر بھی ہمیشہ معلوم و مسلم رہی۔ ان تمام اعمال کی اچھائی اور برائی پر نوع انسانی کے تمام عہدوں، تمام مذہبوں اور تمام قوموں کا عالمگیر اتفاق، ان کی فطری اصلیت پر ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ پس جہاں تک اعمال کا تعلق ہے میں انہیں باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہوں جن کی اچھائی عام طور پر جانی بوجھی ہوئی ہے۔ اور انہیں باتوں سے روکتا ہوں جن سے عام طور پر نوع انسانی نے انکار کیا ہے۔ یعنی میں معروف کا حکم دیتا ہوں، منکر سے روکتا ہوں۔ پس جب میری دعوت کا یہ حال ہے تو پھر کسی انسان کو بھی جسے راستبازی سے اختلاف نہیں کیوں مجھ سے اختلاف ہو۔

(ترجمان القرآن جلد اول ص ۲۰۶)

الاسلام

اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین ایک ہی ہے اور وہ ''الاسلام'' ہے۔

مولانا فرماتے ہیں:

خدا کا ٹھہرایا ہوا دین جو کچھ ہے یہی ہے اس کے سوا جو کچھ بنا لیا گیا ہے وہ انسانی گروہ بندیوں کی گمراہیاں ہیں۔ پس اگر تم خدا پرستی اور عمل صالح کی اصل پر جو تم سب کے یہاں اصل دین ہے جمع ہو جاؤ۔ اور خود ساختہ گمراہیوں سے باز آ جاؤ تو میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں اس سے زیادہ اور کیا چاہتا ہوں۔

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ (آل عمران: ۱۹، ۲۰)

''اللہ کے نزدیک دین ایک ہی ہے اور وہ ''الاسلام'' ہے اور جو یہ اہل کتاب نے اختلاف کیا ہے (اور وہ ایک دین پر مجتمع رہنے کی جگہ یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندیوں میں بٹ گئے) تو یہ اس لیے ہوا، اگرچہ علم وحقیقت کی راہ ان پر کھل چکی تھی لیکن آپس کی ضد اور سرکشی سے اختلاف میں پڑ گئے۔ اور (یاد رکھو) جو کوئی اللہ کی آیتوں سے انکار کرتا ہے تو اللہ (کا قانون مکافات بھی) حساب لینے میں سست رفتار نہیں۔ پھر اگر یہ لوگ تم سے اس بارے میں جھگڑا کریں، تو تم کہو میری اور میرے پیرووں کی راہ تو یہ ہے کہ اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینا۔ اور ہم نے سر جھکا دیا ہے پھر اہل کتاب سے اور ان پڑھ لوگوں سے (یعنی مشرکین عرب سے) پوچھو تم بھی اللہ کے آگے جھکتے ہو یا نہیں۔ (یعنی ساری باتیں جھگڑے کی چھوڑو یہ بتاؤ تمہیں خدا پرستی منظور ہے یا نہیں۔ اگر وہ جھک گئے تو سارا جھگڑا ختم ہو گیا اور) انھوں نے راہ پالی۔ اور اگر وہ روگردانی کریں تو تمہارے ذمہ جو کچھ ہے وہ پیام حق پہنچا دینا ہے۔

اور اللہ کی نظروں سے بندوں کا حال پوشیدہ نہیں۔"

اس نے دین کے لیے "الاسلام" کا لفظ اسی لیے اختیار کیا ہے کہ اسلام کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرمانبرداری کرنے کے ہیں۔ وہ کہتا ہے دین کی حقیت یہی ہے کہ خدا نے جو قانون سعادت انسان کے لیے ٹھہرایا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے وہ کہتا ہے کہ یہ کچھ انسان ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام کائنات ہستی اسی اصل پر قائم ہے سب کے بقاء وقیام کے لیے خدا نے کوئی نہ کوئی قانون عمل ٹھہرا دیا ہے۔ اور سب اسی کی اطاعت کررہے ہیں۔ اگر ایک لمحے کے لیے بھی روگردانی کریں تو کارخانہ ہستی درہم برہم ہو جائے:

﴿اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ﴾ (۳-۸۳)

"پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں اللہ کا ٹھہرایا ہوا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین ڈھونڈ نکالیں حالانکہ آسمان اور زمین میں جو کوئی بھی ہے سب چارو ناچار اسی کے (ٹھہرائے ہوئے قانون عمل کے) آگے جھکے ہوئے ہیں۔ اور (بالآخر) سب کو اسی طرف لوٹنا ہے۔"

وہ جب کہتا ہے اسلام کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول نہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دین حقیقی کے سوا جو ایک ہی ہے، اور تمام رسولوں کی مشترک تعلیم ہے انسانی ساخت کی کوئی گروہ بندی مقبول نہیں۔ سورۃ آل عمران میں جہاں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ دین حقیقی کی راہ تمام مذہبی رہنماؤں کی تصدیق اور پیروی کی راہ ہے۔ وہیں متصلاً یہ بھی کہہ دیا ہے:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (۳-۸۵)

"اور جو کوئی اسلام کے سوا دوسرا دین چاہے گا تو یاد رکھو اس کی راہ کبھی قبول نہ کی جائے گی۔ اور وہ آخرت کے دن دیکھے گا کہ تباہ ہونے والوں میں سے ہے۔"

اور اسی لیے وہ تمام پیروان دعوت کو بار بار تنبیہ کرتا ہے کہ دین میں تفرقہ اور گروہ بندی سے بچیں۔ اور اسی گمراہی میں مبتلا نہ ہوجائیں جس سے قرآن نے نجات دلائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری دعوت نے تمام انسانوں کو جو مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے دشمن ہورہے تھے۔ خدا پرستی کی راہ میں اس طرح جوڑ دیا کہ ایک دوسرے کے جان نثار بھائی بن گئے۔ ایک یہودی جو پہلے حضرت مسیح کا نام سنتے ہی نفرت سے بھر جاتا تھا۔ ایک عیسائی جو ہر یہودی کے خون کا پیاسا تھا۔ ایک مجوسی جس کے نزدیک تمام غیر مجوسی ناپاک تھے۔ ایک عرب جو اپنے سوا سب کو انسانی شرف ومحاسن سے تہی دست سمجھتا تھا۔ ایک صابی جو یقین کرتا تھا کہ دنیا کی قدیم سچائی صرف اسی کے حصے میں آئی ہے، ان سب کو دعوت قرآنی نے ایک صف میں کھڑا کردیا ہے اور اب یہ سب ایک دوسرے سے نفرت کرنے کی جگہ ایک دوسرے کے مذہبی رہنماؤں کی تصدیق کرتے، اور سب کی بتائی ہوئی متفقہ ہدایت پر گامزن ہیں:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (۳، ۱۰۳)

"اور دیکھو سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو۔ اور جدا جدا نہ ہو۔ اللہ نے تم پر جو فضل وکرم کیا ہے۔ اسے یاد کرو، تمہارا حال یہ تھا کہ ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں باہم دگر الفت پیدا کردی پھر ایسا ہوا کہ انعام الٰہی سے بھائی بھائی ہوگئے۔ اور دیکھو تمہارا حال یہ تھا کہ گویا آگ سے بھرا ہوا گڑھا ہے اور اس کے کنارے کھڑے ہو لیکن اللہ نے تمہیں بچا لیا۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی کارفرمائیوں کی نشانیاں تم پر واضح کرتا ہے تاکہ ہدایت پاؤ۔"

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ

الْبَيِّنَاتِ وَاُوْلٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (۳۔۱۰۵)

''اور دیکھو ان لوگوں کی سی چال اختیار نہ کرنا جو (ایک دین پر قائم رہنے کی جگہ) جدا جدا ہو گئے۔اور اختلاف میں پڑ گئے باوجودیکہ روشن دلیلیں ان کے سامنے آچکی تھیں۔یاد رکھو یہی لوگ ہیں جن کے لیے (کامیابی وفلاح کی جگہ) بڑا (بھاری) عذاب ہے۔''

﴿وَ اَنَّ هٰـذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (۶۔۱۵۳)

''اور دیکھو یہ میری راہ ہے بالکل سیدھی راہ۔پس ایک راہ پر چلو،طرح طرح کی راہوں کے پیچھے نہ پڑ جاؤ کہ وہ تمہیں خدا کے راستے سے ہٹا کر جدا جدا کر دیں گی۔یہ بات ہے جس کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تاکہ تم اس کی نافرمانی سے بچو۔''

(ترجمان القرآن جلد اول ص ۴۰۸ تا ۴۱۱)

صراط مستقیم

صراط مستقیم کی تشریح مولانا نے ان الفاظ میں کی ہے۔فرماتے ہیں:

سورۃ فاتحہ میں جس دعا کی تلقین کی گئی ہے وہ صراط مستقیم پر چلنے کی طلب گاہی ہے۔ صراط کے معنی راہ کے ہیں۔اور مستقیم کے معنی سیدھا ہونے کے۔پس صراط مستقیم ایسی راہ ہوئی جو سیدھی ہو کسی طرح کا پیچ وخم نہ ہو، پھر اس راہ کی پہچان یہ بتلائی کہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ (یعنی ان لوگوں کی راہ پر جن پر خدا کا انعام ہوا۔ان کی راہ نہیں جو مغضوب ہوئے نہ ان کی جو گمراہ ہوئے۔

انعام یافتہ انسان کون ہیں جن کی راہ سیدھی راہ ہوئی قرآن نے جا بجا واضح کیا ہے کہ خدا کے تمام رسول اور راست باز انسان جو دنیا کے مختلف عہدوں اور گوشوں میں گزر چکے ہیں۔انعام یافتہ انسان ہیں۔اور انہیں کی راہ صراط مستقیم ہے:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ

مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ (٤-٦٩)

''اور جس کسی نے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی۔ تو بلاشبہ وہ ان لوگوں کا ساتھی ہوا جن پر اللہ نے انجام کیا ہے۔ یہ انعام یافتہ جماعت نبیوں کی ہے، صدیقوں کی ہے، شہدا کی ہے، نیک عمل انسانوں کی ہے اور جس کے ساتھی ایسے لوگ ہوں گے تو کیا ہی اچھی اس کی رفاقت ہے۔''

اس آیت میں بالترتیب چار جماعتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور انہیں انعام یافتہ قرار دیا گیا ہے۔ انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین۔

''انبیاء'' سے مقصود خدا کی سچائی کے تمام پیغام بر ہیں جو نوع انسانی کی ہدایت کے لیے پیدا ہوئے۔

''صدیق'' سے مقصود ایسے انسان ہیں جو کامل معنوں میں سچے ہوں۔ یعنی سچائی کے سانچے میں کچھ اس طرح ڈھلے ہوں کہ سچائی کے خلاف کوئی بات ان کے دماغ میں اتر ہی نہ سکے۔

''شہداء'' کے معنی گواہ کے ہیں یعنی ایسے انسان جو اپنے قول وفعل سے حق وصداقت کی شہادت بلند کرنے والے ہوں۔

''صالحین'' سے مقصود وہ تمام انسان ہیں جو نیک عمل کی راہ میں استقامت رکھیں اور برائی کی راہوں سے کنارہ کش ہوں۔

پس معلوم ہوا انعام یافتہ انسانوں سے مقصود دنیا کے تمام رسول اور داعیان حق ہیں۔ جو قرآن کے نزول سے پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ اور تمام راست باز انسان ہیں جو نوع انسانی میں گزر چکے تھے۔ اس میں نہ تو کسی خاص نسل وقوم کی خصوصیت رکھی گئی ہے نہ کسی خاص مذہب اور اس کے پیروؤں کی۔ دنیا کے تمام نبی، تمام صدیق، تمام شہداء حق، تمام صالح انسان، خواہ کسی ملک وقوم میں ہوئے ہوں۔ قرآن کے نزدیک ''انعام یافتہ'' انسان ہیں۔ اور انہیں کی راہ ''صراط مستقیم'' ہے۔

خدا کے ان تمام رسولوں اور نوع انسانی کے راست باز افراد کی راہ کون سی راہ تھی۔ وہی راہ جسے قرآن دین حقیقی کی راہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں جس قدر بھی سچائی کے داعی آئے سب نے یہی تعلیم دی کہ ﴿اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (۴۲۔۱۳) خدا کا ایک ہی دین قائم رکھو، اور اس راہ میں جدا جدا نہ ہو جاؤ یہی راہ سچائی کی سیدھی راہ ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جا بجا ''الدین'' کو صراط مستقیم سے بھی تعبیر کیا ہے۔ سورۃ شوریٰ میں پیغمبر اسلام ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے! تم صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والے ہو، اور صراط مستقیم ہی صراط اللہ ہے۔ یعنی اللہ کی ٹھہرائی ہوئی راہِ سعادت:

﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ اَلَآ اِلَی اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ ﴾

(۴۲۔۵۲۔۵۳)

''اور اے پیغمبر! بلاشبہ تم صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والے ہو۔ صراط اللہ یعنی اللہ کی راہ کی طرف وہ اللہ کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب کا اسی کا ہے۔ ہاں یاد رکھو (کائنات خلقت کے) تمام کاموں کا مرجع اسی کی ذات ہے۔''

اسی طرح وہ جا بجا کہتا ہے کہ خدا کے تمام رسولوں کی دعوت صراط مستقیم کی دعوت تھی۔ سورۃ نحل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت ہے ﴿وَهَدٰهُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ (۱۶۔۱۲۱) ''خدا نے اسے صراط مستقیم دکھا دی۔'' سورۃ زخرف میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زبانی سنتے ہیں۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ﴾ (۴۳، ۶۴) ''اللہ میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے۔ بس اسی کی بندگی کرو یہی صراط مستقیم ہے۔ سورۃ الانعام میں پہلے حضرت نوح اور ابراہیم کا ذکر کیا۔ پھر سلسلہ ابراہیمی کے متعدد نبیوں کا جو تورات کی مشہور شخصیتیں ہیں اس کے بعد کہا: ﴿وَاجْتَبَیْنٰهُمْ وَهَدَیْنٰهُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ (۶۔۸۸) ''ان سب کو ہم نے صراط مستقیم دکھا دی۔''

اصل یہ ہے کہ خدا کے عالمگیر دین کی حقیقت ظاہر کرنے کے لیے صراط مستقیم سے بہتر تعبیر نہیں ہوسکتی تھی۔ تم کسی خاص مقام تک پہنچنے کے لیے کتنی ہی راہیں نکال لو، لیکن سیدھی راہ ہمیشہ ایک ہی ہوگی۔ اور اسی پر چل کر ہر مسافر منزل مقصود تک بحفاظت وامن پہنچ سکے گا۔ علاوہ بریں سیدھی راہ ہی ہمیشہ شاہراہ عام کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ تمام مسافر خواہ کسی گوشے کے رہنے والے ہوں لیکن سب مل جل کر سیدھی راہ اختیار کریں، اور کبھی یہ نہ کریں گے کہ الگ الگ ٹولیاں بنا کر ٹیڑھی ترچھی راہوں میں متفرق ہوجائیں۔ قرآن کہتا ہے ٹھیک اسی طرح دین کی سیدھی راہ بھی ایک ہی ہے بہت سی نہیں ہوسکتیں۔ اور اول دن سے موجود ہے۔ ہر عہد، ہر قوم، ہر ملک اسی پر چل کر منزل مقصود تک پہنچا ہے۔ بعد کو پیروان مذاہب نے ایسا کیا کہ بہت سی ٹیڑھی ترچھی راہیں نکال لیں اور ایک راہ پر متفق رہنے کی جگہ الگ الگ ٹولیاں بنا کر متفرق ہوگئے، وہ کہتا ہے اب اگر تم چاہتے ہو کہ منزل مقصود کا سراغ پاؤ، تو چاہیے کہ اسی سیدھی راہ پر اکٹھے ہوجاؤ۔

چنانچہ یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے جب صراط مستقیم کی اس تفسیر پر نظر ڈالی جائے۔ جو پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمائی ہے:

''عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنی انگلی سے ایک لکیر کھینچی۔ اور فرمایا یوں سمجھو کہ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا راستہ ہے بالکل سیدھا۔ اس کے بعد اس لکیر کے دونوں طرف بہت سی ترچھی لکیریں کھینچ دیں۔ اور فرمایا یہ طرح طرح کے راستے ہیں جو بنا لیے گئے ہیں اور ان میں کوئی راستہ نہیں جس کی طرف بلانے کے لیے ایک شیطان موجود نہ ہو۔ پھر یہ آیت پڑھی:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾

(٦-١٥٤)

''اور دیکھو یہ میری راہ ہے بالکل سیدھی راہ۔ پس اِسی ایک راہ پر چلو، طرح طرح کی راہوں کے پیچھے نہ پڑ جاؤ کہ وہ تمہیں خدا کے راستے سے ہٹا کر

جدا جدا کردیں گی۔ یہ بات ہے جس کا خدا تمہیں حکم دیتا ہے تا کہ تم اس کی نافرمانی سے بچو۔" (سنن نسائی)

آخر میں مولانا لکھتے ہیں کہ:

صراط مستقیم پر چلنے والے کی طلب زندگی کی تمام راہوں میں درستگی وصحت کی راہ پر چلنے کی طلب ہوئی، اور اسی لیے سعی وعمل کے ہر گوشے میں انعام یافتہ گروہ وہی ہوسکتا ہے جس کی راہ صراط مستقیم ہو۔ (ترجمان القرآن جلد اول ص ۴۱۹ تا ۴۲۲، ۴۲۵)

سورۃ الفاتحہ کی تفسیر مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ لکھتے ہیں کہ:

"مولانا آزاد نے سورۃ فاتحہ کی جو تفسیر لکھی ہے وہ کس قدر اہم ہے اس میں مولانا کی وہبت اور انداز خطابت عروج پر ہے۔ بلاشبہ وہ مولانا آزاد کا شاہکار ہے۔ مولانا آزاد کا ذہن وفکر امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیم علیہ الرحمہ سے شروع ہی سے بہت متاثر تھا۔ ان دونوں ائمہ سلف کے افکار کا مولانا آزاد کے دماغ پر بڑا غلبہ تھا۔ مولانا آزاد کا جو اپنا ذاتی عظیم الشان کتب خانہ تھا میں نے وہ کتب خانہ خود دیکھا ہے۔ اس میں علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیمؒ کی تقریباً تمام تصانیف موجود تھیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے سورۃ والتین اور سورۃ العصر کی بڑی جامع اور بڑی عجیب وغریب تفسیر کی ہے۔ مولانا آزاد کے سامنے ان اکابرین کے تمام مباحث تھے جن سے مولانا کافی متأثر تھے۔ لہٰذا سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں مولانا آزاد نے اللہ کی ربوبیت، اس کی رحمت اور اس کی ہدایت پر جو بحثیں کیں ہیں اگر آپ علامہ ابن تیمیہؒ کی تفسیر محولہ بالا کو دیکھیں تو ان کے مباحث کا سررشتہ آپ کو ان کے یہاں مل جائے گا۔ لیکن مولانا آزاد کا اپنا خاص اسلوب نگارش ہے جو دل کو موہ لیتا ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے ذہن وقلب پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم از سعید احمد اکبر آبادی ص ۵۷)

سورۃ فاتحہ سے متعلق جو میں نے مولانا کے مباحث اور نوٹس اوپر درج کیے ہیں۔وہ ترجمان القرآن مطبوعہ سندھ ساگر اکیڈمی لاہور سن اشاعت فروری ۱۹۶۷ء سے لیے گئے ہیں۔ صفحات کے نمبر بھی اسی کتاب کے ہیں۔(عراقی)

مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت کے بعض دوسرے مباحث

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں کئی جگہ علمی دینی اور تحقیقی وتاریخی نکات بیان کیے ہیں۔اور یہ نکات مولانا کے علمی تبحر،فکروتدبر اور فہم وبصیرت کا ایک عظیم شاہکار ہیں۔ان میں چندایک نکات اوران پر مولانا کے تفسیری حواشی درج ذیل ہیں۔

قانون الٰہی

قرآن کے پہلے پارے میں ایک آیت دودفعہ دہرائی گئی ہے۔اوروہ آیت نمبر ۱۳۴،اور نمبر ۱۴۱ یعنی

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَاكَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (البقرة ١٣٤، ١٤١)

''(بہرحال) یہ ایک امت تھی جوگزرچکی اس کے لیے وہ تھا جواس نے اپنے عمل سے کمایا تمہارے لیے وہ ہوگا جوتم اپنے عمل سے کماؤ گے تم سے اس کی پوچھ گچھ نہیں ہوگی کہ ان لوگوں کے اعمال کیسے تھے۔''

اس آیت کی تفسیر میں مولانا فرماتے ہیں کہ:

قانون الٰہی یہ ہے کہ ہرفرداور جماعت کووہی پیش آتا ہے جواس نے اپنے عمل سے کمایا ہے نہ توایک کی نیکی دوسرے کو بچاسکتی ہے نہ ایک کی بدعملی کے لیے دوسرا جوابدہ ہوسکتا ہے۔

انسان کے لیے قدامت پرستی کا جھنڈا بڑا ہی سخت پھندا ہے اس کے پیچ سے وہ نکل نہیں سکتا وہ ہمیشہ ماضی کے افسانوں میں گم رہے گا۔اور ہر پرانے طورطریقے کوتقدیس کی نظر سے دیکھے گا۔ہندو ہزاروں برس سے مہابھارت اور پرانوں کے افسانوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔مسلمانوں کے دوفرقے آج تک اس نزاع سے فارغ نہیں ہوئے کہ تیرہ

سو برس پہلے سقیفہ (بنی ساعدہ) میں خلافت کا جو انتخاب ہوا تھا۔ وہ صحیح تھا یا غلط، لیکن قرآن کہتا ہے کہ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا۔ اب اس کے پیچھے پڑے رہنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ تم اپنی خبر لو، ان کے اعمال ان کے لیے تھے، تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں۔

(ترجمان القرآن جلد اول ص ۲۸۵)

صبر اور نماز

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (البقرہ:۱۵۳)

"مسلمانو! صبر اور نماز کی معنوی قوتوں سے سہارا پکڑو یقین کرو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

اس آیت کی تفسیر مولانا یوں فرماتے ہیں:

کتاب وحکمت کی تعلیم، شخصی نبوت کی پیغمبرانہ تربیت، مرکز ہدایت کا قیام، نیک ترین امت ہونے کا نصب العین، یہی وہ بنیادی عناصر تھے، جن کی موجودہ امت کی نشوونما کے لیے ضرورت تھی۔ جب یہ تمام مراتب ظہور میں آ گئے تو اب ضروری ہوا کہ پیروان دعوت قرآنی کو مخاطب کیا جائے۔ اور سرگرم عمل ہونے کی دعوت دی جائے۔ فاذکرونی اذکرکم سے یہ مخاطبہ شروع ہوتا ہے۔

اور چونکہ سرگرم عمل ہونے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ راہ عمل کی مشکلیں اور آزمائشیں پیش آئیں۔ اس لیے دعوت عمل کے ساتھ ہی صبر واستقامت اور جاں فروشی وقربانی کی بھی دعوت دے دی گئی۔ اور واضح کر دیا گیا کہ اس راہ میں آزمائشوں سے گزرنا ناگزیر ہے۔ ساتھ ہی ان اصول ومہمات کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا جن میں ثابت قدم ہو جانے کے بعد گمراہی وناکامی سے قدم محفوظ ہو جا سکتے ہیں۔

صبر اور نماز کی قوتوں سے مدد لو، صبر کی حقیقت یہ ہے کہ مشکلات ومصائب کے جھیلنے اور نفسانی خواہشوں سے مغلوب نہ ہونے کی قوت پیدا ہو جائے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ

اللہ کے ذکر وفکر سے روح کو تقویت ملتی ہے۔جس جماعت میں یہ دونوں قوتیں پیدا ہو جائیں گی وہ کبھی ناکام نہیں ہوسکتی۔

راہ حق میں موت، موت نہیں ہے۔سرتاسر زندگی وہدایت ہے۔پس موت کے خوف سے اپنے دلوں کو پاک صاف کرلو۔ (ترجمان القرآن جلداول ص۲۹۰،۲۹۱)

آیۃ الکرسی

”ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔وہ الحی ہے یعنی زندہ ہے اس کی زندگی کے لیے فنا وزوال نہیں۔القیوم ہے یعنی ہر چیز اس کے حکم سے قائم ہے۔وہ اپنے قیام کے لیے کسی کا محتاج نہیں۔اس کی آنکھ کے لیے نہ تو اونگھ ہے اور نہ دماغ کے لیے نیند، آسمان وزمین جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور اسی کے حکم سے ہے۔کون ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر کسی کی شفاعت کے لیے زبان کھولے۔جو کچھ اس کے سامنے ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ پیچھے ہے وہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں یا انسان اس کے علم سے کسی بات کا بھی احاطہ نہیں کرسکتا۔مگر یہ کہ جتنی بات کا علم وہ انسان کو دینا چاہے اور دے دے۔اس کا تخت حکومت آسمان وزمین کے تمام پھیلاؤ پر چھایا ہوا ہے۔اور اس کی نگرانی وحفاظت میں اس کے لیے کوئی تھکاوٹ نہیں۔اس کی ذات بڑی ہی بلند مرتبہ ہے۔“

آیۃ الکرسی پر مولانا کا نوٹ ملاحظہ فرمایئے:

خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔وہ مالک الملک ہے، حی وقیوم ہے۔اس کی حکمت سے کوئی گوشہ باہر نہیں۔اس کے علم کے لیے کوئی شے مخفی اور اوجھل نہیں، وہ غفلت سے منزہ اور نسیان سے پاک ہے۔جس ہستی کی صفتیں ایسی ہوں اس کے سامنے کسی کی سعی وسفارش کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے اور اس کے احکام وقوانین کے نفاذ میں کون ہے جو دخل دینے کی جرأت کرسکتا ہے۔

(ترجمان القرآن جلداول ص۳۲۵)

لا اکراہ فی الدین

﴿لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ (البقرہ:۲۵۵)

''دین کے بارے میں کسی قسم کا جبر نہیں (کیونکہ وہ دل کے اعتقاد سے تعلق رکھتا ہے۔اور جبر وتشدد سے اعتقاد پیدا نہیں کیا جا سکتا۔''

اس آیت کے متعلق مولانا فرماتے ہیں:

اس اصل عظیم کا اعلان کر دیں کہ دین واعتقاد کے مقابلے میں کسی طرح کا جبر واستکراہ جائز نہیں۔دین کی راہ دل کے اعتقاد ویقین کی راہ ہے۔اور اعتقاد، دعوت موعظت سے پیدا ہو سکتا ہے نہ کہ جبر واستکراہ سے۔

احکام جہاد کے بعد یہ ذکر اس لیے کیا گیا تا کہ واضح ہو جائے کہ جنگ کی اجازت ظلم وتشدد کے انسداد کے لیے دی گئی ہے نہ کہ دین کی اشاعت کے لیے، دین کی اشاعت کا ذریعہ ایک ہی ہے اور وہ دعوت ہے۔

قریش کا فتنہ کیا تھا، یہ تھا کہ ظلم وتشدد کے ذریعے دین واعتقاد کا فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے اس کے خلاف جنگ کا حکم دیا۔پس جس بات کے خلاف اس نے جنگ کا حکم دیا ہے خود اس کا مرتکب کیوں کر ہو سکتا ہے۔

سچائی روشنی ہے اگر تاریکی چھائی ہوئی ہے تو صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ روشنی موجود ہو جائے، اگر روشنی نمایاں ہوگئی، تو پھر روشنی کو روشنی دکھانے کے لیے اور کسی بات کی ضرورت نہیں، روشنی جس طرف بھی رخ کرے گی تاریکی خود بخود دور ہو جائے گی۔

(ترجمان القرآن جلد اول ص ۳۲۵، ۳۲۶)

تقویٰ کی تشریح

سورۃ بقرہ کے آخری نوٹوں میں ایک مقام پر تقویٰ کی تشریح کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

زندگی کی تمام باتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ دو طرح کے انسان پائے جاتے ہیں۔بعض

طبیعتیں محتاط ہوتی ہیں، بعض بے پروا ہوتی ہیں۔جن کی طبیعت محتاط ہوتی ہے وہ ہر بات میں سمجھ بوجھ کر قدم اٹھاتے ہیں، اچھے برے، نفع ونقصان، نشیب وفراز کا خیال رکھتے ہیں۔ جس بات میں برائی پاتے ہیں، چھوڑ دیتے ہیں، جس میں اچھائی دیکھتے ہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ برخلاف اس کے جو لوگ بے پروا ہوتے ہیں ان کی طبیعتیں بے لگام اور چھوٹ ہوتی ہیں، جو راہ دکھائی دے گی چل پڑیں گے، جس کام کا خیال آ گیا کر بیٹھیں گے، جو غذا سامنے آ گئی کھا لیں گے، جس پر بات پر اڑنا چاہیں گے اڑ بیٹھیں گے، اچھائی برائی، نفع ونقصان، دلیل اور توجہ، کسی بات کی بھی انہیں پروا نہیں ہوتی۔

جس حالت کو ہم نے یہاں ''احتیاط'' سے تعبیر کیا ہے اس کو قرآن تقویٰ سے تعبیر کرتا ہے۔متقی یعنی ایسا آدمی جو اپنے فکر وعمل میں بے پروا نہیں ہوتا، ہر بات کو درستگی کے ساتھ سمجھنے اور کرنے کی کھٹک رکھتا ہے، برائی اور نقصان سے بچنا چاہتا ہے، اور اچھائی اور فائدہ کی جستجو رکھتا ہے۔قرآن کہتا ہے ایسے ہی لوگ تعلیم حق سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔اور کامیاب ہو سکتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے۔انھوں نے کہا، کیا تم کبھی ایسے راستے میں نہیں چلے جس میں کانٹے ہوں، فرمایا ہاں، کہا اس حالت میں تم نے کیا کیا، فرمایا، میں نے کوشش کی کہ کانٹوں سے بچ کر نکل جاؤں۔ کہا، یہی تقویٰ کی حقیقت ہے۔

(ترجمان القرآن جلد اول ص ۳۳۷، ۳۳۸)

مسئلہ توحید اقوام عالم میں مانا ہوا ہے

﴿قُلْ يَـٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران :٦٣)

''(اے پیغمبر) (تم یہود ونصاریٰ سے) کہہ دو کہ اہل کتاب! اختلاف ونزاع

کی ساری باتیں چھوڑ دو، اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے تمہارے دونوں کے لیے یکساں طور پر مسلّم ہے۔ یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، کسی کی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں، ہم سے ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے گویا خدا کو چھوڑ کر اسے اپنا پروردگار بنالیا ہے۔ پھر اگر یہ لوگ اس بات سے روگردانی کریں تو تم کہہ دو گواہ رہنا کہ (انکار تمہاری طرف سے ہے) اور ہم خدا کے ماننے والے ہیں۔''

اس آیت میں اہل کتاب سے اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں سے خطاب ہے۔ کلمہ پوری بات کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ بات سراپا عدل وحق ہے اور تمام قوموں میں مانی ہوئی ہے کہ اللہ کے سوا کسی مخلوق کی عبادت حرام ہے۔ اور اللہ کی ذات وصفات اور افعال میں کسی کو شریک ٹھہرانا بھی بڑا بھاری گناہ ہے۔

رب بنانا یہ ہے کہ اللہ کی نافرمانی میں کوئی کسی کی اطاعت کرے یا کوئی کسی کو سجدہ کرے، کسی کی بات کو قرآن وحدیث پر مقدم کرنا یا صریح نصوص پر قیاس ورائے اور اجتہاد کو مقدم کرنا، یا رعایا کا بادشاہ کو اور مریدوں کا پیروں کو سجدہ کرنا، اور اس کا سجدہ تعظیمی نام رکھنا، اس آیت کی رو سے منع اور شرک ہے۔ (تفسیر سراج المنیر جلد اول ص ۲۲۸)

مولانا کا اس آیت پر نوٹ ملاحظہ فرمائیں۔ (اہل کتاب سے خطاب)

اگر تمہاری مخالفت محض تعصب ونفسانیت کی وجہ سے نہیں ہے اور دین حق پرستی کی کچھ طلب باقی ہے تو اختلاف ونزاع کی ساری باتیں چھوڑ دیں۔ اور توحید وخدا پرستی کی ان بنیادی صداقتوں پر متفق ہو جائیں وہ صداقتیں جو تمہارے یہاں بھی مسلم ہیں، اگرچہ عملاً فراموش کر دی گئی ہیں یعنی:

۱۔ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

۲۔ جو کچھ اس کے لیے ہے۔ اس میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کیا جائے۔

۳۔ کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنے لیے ایسا مقدس اور معصوم نہ بنالے گویا اسے خدا بنالیا ہے۔ (ترجمان القرآن جلد اول ص ۳۵۵،۳۵۴)

علماء ومشائخ کو پروردگار بنانا

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰھًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ سُبْحٰنَہٗ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ﴾ (التوبہ: ۳۱)

’’ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء ومشائخ کو پروردگار بنالیا ہے اور مریم کے بیٹے مسیح کو بھی، حالانکہ انہیں جو کچھ حکم دیا گیا تھا وہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک خدا کی بندگی کرو، کوئی معبود نہیں مگر وہی، اس کی پاکی ہے اس کے ساجھے سے جو یہ اس کی ذات میں لگا رہے ہیں۔‘‘

مولانا آزاد اس آیت (۳۱) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

آیت (۳۱) میں اس گمراہی کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہود ونصاریٰ کی تمام فکری وعملی گمراہیوں کا سرچشمہ تھی۔ یعنی انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء ومشائخ کو پروردگار بنالیا ہے۔ پروردگار بنالینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ انہیں رب السموات والارض کہتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح کسی نے کسی کو رب نہیں بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے فقیہوں کو اور عیسائیوں نے اپنے پوپ اور اس کے مقرر کیے ہوئے پادریوں کو، دین کے بارے میں جو منصب دے دیا ہے اور اپنے زاہدوں اور درویشوں کی نسبت جیسا کچھ اعتقاد رکھتے ہیں وہ فی الحقیقت انہیں مثل پروردگار کے بنالینا ہے۔

چنانچہ خود پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کا یہی مطلب قرار دیا ہے۔ عدی بن حاتم جو پہلے عیسائی تھے کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جب برآۃ کی یہ آیت پڑھی تو میں نے عرض کیا ہم انہیں پوجتے نہیں، آپ نے کہا کیا ایسا نہیں ہے کہ جس بات کو وہ حرام ٹھہرادیتے ہیں تم حرام سمجھ لیتے ہو، جس بات کو حلال کردیتے ہیں حلال مان لیتے ہو۔ عرض کیا ہاں، فرمایا! یہی انہیں پوجنا ہے۔ (ترمذی والبیہقی فی السنن) اس سے معلوم ہوا کہ اپنے پیشواؤں کو تشریع دینی کا حق دے دینا، یعنی اس بات کا حق دے دینا، کہ جو کچھ اپنی خواہش اور رائے سے ٹھہرادیں اس کو بلاچوں وچرا تقلید واطاعت کرنی چاہیے۔ قرآن کے نزدیک انہیں رب

بنالینا ہے ۔ کیونکہ اس بات کا حق اللہ کے سوا اور اللہ کی وحی کے مبلغ کے سوا اور کسی کونہیں۔پس جب دوسروں کوبھی یہ حق دے دیا گیا تو گویا وہ خدائی میں شریک کر لیے گئے ۔

عیسائیوں میں ایک انسان بھی ایسا نہیں ہوا جس نے پوپ اوراس کے مقرر کیے ہوئے فادرز کو خدا سمجھا ہو۔اور نہ یہودیوں نے کبھی اپنے راہبوں کو ایسا سمجھا۔لیکن ان کا عمل یہی رہا۔گویا حق و باطل ،حلال وحرام ،عذاب وثواب ،اور جنت ودوزخ کی تقسیم کا سارا اختیار انہیں کے فیصلہ میں ہے ۔ جو حلال کر دیں حلال ہے جو حرام کر دیں حرام ہے ۔ جسے چاہیں بخشش کا پروانہ دے دیں ۔ جسے چاہیں محروم ومردود کر دیں ۔ جنت کی کنجی بھی انہیں کے ہاتھ میں ہے۔دوزخ کا داروغہ بھی انہیں کے زیر حکم ،اور ایسے مقدس ہیں کہ کوئی بات ان کی غلط نہیں ہوسکتی اور اللہ نے انہیں ایسا با اختیار کر دیا ہے کہ ان کے حکم سے کوئی بات باہر نہیں ۔

ما شئت الا ماشائت الاقدار

فاحکم فانت الواحد القهار

اس گمراہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

۱۔ خدا کی کتاب جو اس غرض سے نازل کی گئی تھی کہ لوگ اسے پڑھیں اور اس پر عمل کریں ، یک قلم بے اثر وبے کار ہوگئی ۔ کیونکہ اس کی جگہ انسانوں کی رایوں اور فیصلوں نے لے لی۔

۲۔ ہدایت کا مرکز عملاً خدا کا حکم نہ رہا، انسانوں کا حکم ہوگیا۔

۳۔ دینی پیشواؤں کا ایک گروہ پیدا ہوگیا کہ جو لوگوں کو اندھا بہرہ بنا کر جس طرح چاہتا اپنے اغراض کے لیے کام میں لاتا۔

۴۔ انسانوں کی عقلی ترقی کی تمام راہیں بند ہوگئیں ۔ کیونکہ جب لوگوں نے اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینا چھوڑ دیا۔ اوراپنے بنائے ہوئے پیشواؤں کا حکم بادلیل ماننے لگے کہ یہی معنی تقلید کے ہیں تو ظاہر ہے کہ پھر عقل کی نشوونما اور ترقی کے لیے کون سی راہ باقی رہ گئی ہے۔

۵۔ توہم پرستی اور جہل وکوری کا دروازہ کھل گیا۔ کیونکہ جب اعتقاد اور عمل کا دارومدار

چند انسانوں کی رایوں پر آٹھہرا، اور دوسروں کو اس کا حق نہ رہا، کہ اپنی عقل وبینش سے کام لیں۔ تو ظاہر ہے کہ عقل وبینش کی جگہ جہل وتوہم ہی پھیلے گا۔ اور جو خرافات کسی ٹھہرائے ہوئے پیشوا کی زبان سے نکل جائے گی تو لوگوں کے لیے دلیل وحجت کا کام دے گی۔

۶۔ دینی پیشوا اچھا انسان ہونے کی جگہ بے پناہ دیوتا بن گئے، اور ان کی ساری باتوں نے تقدیس وپاکی کا جامہ پہن لیا۔ کیونکہ جب انہیں پیروؤں کے لیے حکم تشریعی کی غیر مشروط طاقت مل گئی اور اپنے احکام واعمال میں یک قلم غیر مسئول ہو گئے تو پھر نفس انسانی کی شرارتیں ان سے جو کچھ بھی کرائیں کم ہے۔

یورپ کے اس عہد کی تاریخ پر نظر ڈالو، جسے مؤرخ ازمنہ وسطیٰ کے نام سے پکارتے ہیں۔ بلکہ اس عہد کی بھی جو نشاۃِ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے تمہیں ان نتائج کی ساری نظیریں اور مثالیں قدم قدم پر ملنے لگیں گی۔ صرف پوپ کے منصب کی نسلاً بعد نسل تاریخ ہی دیکھ لی جائے اس کے لیے کفایت کرے گی۔

قرآن نے جس وقت یہ صدا بلند کی، عیسائی دنیا تیار نہ تھی کہ اس کا جواب دیتی، لیکن بالآخر اس سے اعراض نہ کر سکی۔ تو اس وقت قرآن کی اس دعوت حق کو عیسائیوں نے نہیں سمجھا۔ لیکن یہ تخم ریزی برگ وبار لائے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ صلیبی لڑائیوں میں جب یورپ کے عیسائیوں کو مسلمانوں سے ملنے اور اسلام کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو اس کے اثرات کام کرنے لگے۔ اور بالآخر لوتھر نے اصلاح کنیسہ کی دعوت بلند کی۔ لوتھر اور کلیسا میں بناء نزاع یہ تھی کہ حق کا معیار کیا ہے۔ کتاب اللہ یا پوپ کا اجتہاد؟ اور کیا خدا کی کتاب اس لیے ہے کہ پڑھی جائے اور سمجھی جائے، یا اس لیے کہ سب کچھ پوپ پر چھوڑ دیا جائے۔ نزاع کی ابتداء نجات کے مسئلے سے ہوئی تھی۔ یعنی نجات کا دارومدار ایمان پر ہے یا پوپ کی سند مغفرت پر۔ ظاہر ہے کہ یہ حرف بہ حرف اسی صدائے حق کی بازگشت تھی: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔

آج یہ واقعہ دنیا کے تاریخی حقائق میں سے سمجھا جاتا ہے کہ یورپ کی تمام ذہنی اور عملی

ترقیوں کا دور اصلاح کنیسہ کی دعوت سے شروع ہوا۔ یہ سچ ہے لیکن اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ اصلاح کنیسہ کی بنیاد اس دن پڑی تھی جس دن اللہ کے رسولؐ نے نجران کے بشپ کو دعوت اصلاح دی تھی:

﴿ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (۳۔۶۳)

اور اسی دن جس دن سورۂ برأت کی یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

اگر چھٹی صدی عیسوی کے عیسائی جہل وتعصب نے اس دعوت سے انکار نہ کیا ہوتا تو وہ تمام تاریک صدیاں ظہور میں نہ آتیں جن کی وحشت انگیز سرگزشتیں تاریخ کو قلمبند کرنی پڑیں۔ اور ازمنۂ مظلمہ کے نام سے پکاری گئیں تو یقیناً یورپ کے علم وعقلیت کی تاریخ چودھویں کی جگہ ساتویں صدی سے شروع ہوجاتی۔

یہ سرگزشت تو عیسائی دنیا کی ہے جسے اس دعوت حق نے مخاطب کیا تھا۔ لیکن خود مسلمانوں کا کیا حال ہوا جنہیں اس دعوت کی تبلیغ سپرد کی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ وہ خود بھی اس گمراہی سے نہ بچ سکے۔ اور انھوں نے تشریع دینی کا حق کتاب وسنت کی جگہ انسانوں کی رایوں کے حوالے کردیا۔ اعتقاداً نہیں عملاً، اور سوال یہاں عمل ہی کا ہے نہ کہ اعتقاد کا، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تمام مفاسد ظہور میں آگئے جن کا دروازہ قرآن نے بند کرنا چاہا تھا۔ اور سب سے بڑا فساد یہ پیدا ہوا کہ صدیوں سے ان کی عقلی ترقی یک قلم رک گئی۔ اور تقلید نے علم وبصیرت کی راہوں سے انہیں دور کردیا۔ حتی کہ اب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ ایک طرف مسلمانوں کی معاشرتی واجتماعی زندگی مختل ہورہی ہے، کیونکہ اس کی ضرورتوں کے مطابق احکام فقہ نہیں ملتے۔ اور شریعت کو فقہ کے مذاہب مدونہ ہی میں منحصر سمجھ لیا گیا ہے۔ دوسری طرف تمام اسلامی حکومتوں نے قوانین شرعیہ پر عمل درآمد ترک کردیا ہے۔ اور اس کی جگہ یورپ کے دیوانی وفوجداری قوانین اختیار کرنے لگے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے دیکھا کہ دفاتر فقہ وقت کے انتظامی ومعاشرتی مقتضیات کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اور کوئی نہیں جو انہیں

بتلائے کہ اللہ کی شریعت کا دامن اس نقص سے پاک ہے اور اگر وہ کتاب وسنت کی طرف رجوع کرتے تو انہیں اس زمانے کے لیے بھی ایسے ہی اصلح واوفق قوانین مل جاتے جس طرح پچھلے عہدوں کے لیے مل چکے ہیں۔

(ترجمان القرآن جلد اول ص ۱۲۴۔۱۲۵)

دعوت حق کا طریقہ

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ۝﴾ (النحل: ۱۲۵)

''اے پیغمبر (ﷺ) اپنے پروردگار کی طرف لوگوں کو بلاؤ اس طرح حکمت کی باتیں بیان کرو، اور مخالفوں سے بحث ونزاع کرو، تو (وہ بھی) ایسے طریقے پر کہ حسن وخوبی کا طریقہ ہو، تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا ہے۔ اور وہی جانتا ہے کہ کون راہ راست پر ہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں مولانا دعوت حق کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دعوت حق کا طریقہ کیا ہے۔ فرمایا سرتاسر حکمت اور موعظہ حسنہ ہے۔

حکمت ''یعنی دانائی کی باتیں'' ''موعظہ حسنہ'' یعنی پند ونصیحت کی باتیں جو حسن وخوبی کے ساتھ کی جائیں۔ اس کے بعد فرمایا ''وجادلهم بالتی هی احسن'' اور اگر بحث ونزاع کرنی پڑے تو کر سکتے ہو لیکن ایسی ہی بحث ونزاع جو نہایت اچھے طریقہ پر ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعوت حق کا طریقہ حکمت وموعظہ حسنہ کا طریقہ ہے۔ اور بحث ونزاع کی اجازت صرف اس صورت میں ہے کہ احسن طریقہ پر ہو پس ہر بحث ونزاع جو احسن طریقہ پر نہ ہو، دعوت حق کا طریقہ نہ ہوگی۔

احسن طریقہ سے مقصود کیا ہے یہ کہ مقصود طلب حق ہو، اپنی بات کی پچ نہ ہو، مخالفت کے اندر یقین پیدا کرنا ہو، اسے باتوں سے ہرانا نہ ہو، اگر وہ چپ ہوگیا اور دل کا کانٹا نہ نکلا تو بحث سے کیا فائدہ ہوا، ایسا اسلوب، ایسا طریق خطاب، ایسا لب ولہجہ، اس طرح کے

الفاظ اختیار نہ کیے جائیں جو مخالف کے دل کو دکھ پہنچانے والے ہوں، یا اسے سننے والوں کی نظروں میں ذلیل ورسوا کرنے والے ہوں۔ کیونکہ اگر بحث سے مقصود دعوت حق ہے تو مخالف کے دل کو نرمی ومحبت سے حق کی طرف متوجہ کرنا چاہیے۔ نہ یہ کہ صدمہ پہنچانا، ضد میں لانا اور جوشِ نفرت سے بھر دینا۔ بدقسمتی سے دُنیا میں طلب حق کی راہ بھی محض جدل ونزاع کی راہ بن گئی ہے، ہم اپنے دنیوی اغراض ومقاصد کے لیے لڑنے جھگڑنے کے عادی ہیں۔ جب کوئی ایسا جھگڑا پیش آجاتا ہے تو صرف اپنی جیت کے لیے لڑتے ہیں۔ اس خیال سے نہیں لڑتے کہ حق وانصاف کیا ہے۔ اکثر اوقات خود ہمارا ضمیر گواہی دیتا ہے کہ ہم برسر حق نہیں ہیں۔ اور انصاف مخالف کے ساتھ ہے لیکن چونکہ اپنا مطلب کسی نہ کسی طرح حاصل کرنا ہوتا ہے اس لیے کبھی اعتراف حقیقت کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ حق اور انصاف ہم سے جس قدر الگ ہو جاتا ہے بحث ونزاع کی سرگرمی اتنی ہی زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ اگر ہمارا مقصد سب سے زیادہ کمزور ہوگا تو ہم خیال کریں گے کہ ہماری بحث ونزاع کی سرگرمی سب سے زیادہ ہونی چاہیے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ کم از کم دین کے معاملے میں ہم ایسا نہ کرتے۔ دنیوی سیادت میں کچھ نہ کچھ لینا دینا ہوتا ہے۔ اس سے غرض پرست آدمی اپنی بات کو سچ کرتا ہی رہے گا۔ لیکن دین کی راہ لین دین کی راہ نہیں ہے، سچ کو سچ مان لینے کی راہ ہے، اور جونہی ہم نے کسی بات کو سچ نہ سمجھ کر بھی ثابت کرنا چاہا، دین کی راہ نہ رہی، عین اس کی ضد ہوگئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے سچائی کے کام کرنے کو بھی جھوٹ کا کاروبار بنا دیا ہے۔ ہم دین کے بارے میں ٹھیک اسی طرح جھگڑتے ہیں جس طرح دنیا کے معاملات میں، ہم جب کبھی کسی سے بحث کریں گے تو ہمارے وہم وگمان میں بھی یہ خیال نہیں گزرے گا کہ اس راہ میں اصل مقصود طلب حق ہے۔ اور جونہی حق سامنے آجائے ہمارا فرض ہے کہ اعتراف کرلیں بلکہ بحث کریں گے ہی اس لیے کہ اپنی بات اپنے مخالف فریق سے بات منوانی ہے۔ اور خواہ کچھ ہو فریق مخالف کو ہرانا ہے۔ اگر دیکھیں گے کہ حق اور معقولیت ہمارے ساتھ نہیں ہے تو پھر غیر متعلقہ باتوں پر زور دینے لگیں گے، بدزبانی پر اتر آئیں گے۔ مارنے مرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے اور

پھر کہیں گے کہ ہم جیت گئے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ جدل کا طریقہ ہے "دعوت" کا طریقہ نہیں ہے۔ اور دین کی راہ، دعوت کی راہ ہے جدل کی نہیں ہے۔ اگر جدل کرنا ہی پڑے تو صرف اسی حالت میں کیا جاسکتا ہے کہ احسن طریقہ پر ہو، یعنی راست بازی، دیانت، شیریں زبانی، اور شائستگی کے ساتھ کیا جائے۔ آگے چل کر سورۂ عنکبوت میں بھی تمہیں یہی حکم ملے گا: ﴿لَا تُجَادِلُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (٤٦)" اور نہ بحث کرو اہل کتاب سے مگر ایسے طریقہ سے جو سب سے اچھا ہو۔"

اس کے بعد فرمایا:

﴿وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَ لَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ۝﴾ (النحل: ١٢٦)

"اور مخالفوں کی سختی کے جواب میں سختی کرو، تو چاہیے کہ ویسی ہی اور اتنی ہی کرو، جیسے تمہارے ساتھ کی گئی ہے۔ اگر تم نے صبر کیا (یعنی جھیل گئے اور سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا) تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کے لیے صبر ہی بہتر ہے۔"

اگر مخالف ناحق کوشش میں سرگرم ہے اور سختی و زیادتی پر اتر آیا ہے تو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تم بھی آپے سے باہر ہو جاؤ۔ ایسا کرنا راست بازی کا طریقہ نہ ہوگا، ایک برائی کے جواب میں دوسری برائی کا ارتکاب ہوگا۔ جو ممکن ہے کہ پہلی سے بھی زیادہ سخت برائی ہو جائے۔ بہتری تو اس میں ہے کہ سختی کا جواب سختی سے نہ دو، جھیل جاؤ، پروا نہ کرو، بخش دو، اسی میں تمہاری اصلی جیت ہے۔ لیکن اگر طبیعت پر قابو نہیں پاتے اور سختی کا جواب سختی ہی سے دینا چاہتے ہو، تو پھر انصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے، جتنی اور جیسی سختی تمہارے ساتھ کی گئی ہے ویسی ہی اور اتنی ہی تم بھی کرلو۔ اس سے آگے نہ بڑھو، ذرا بھی بڑھے تو یہ ظلم ہوگا۔ اور ظلم راستی کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا۔

غور کرو! قرآن کا محض ایک لفظ، محض ایک ترکیب کس طرح مفاسد و مسائل کے فیصلے کر دیا کرتی ہے۔ پہلے تصفیہ امر کا حکم دیا گیا تھا۔ ادع الی سبیل ربك پس چاہیے تھا کہ

یہاں بھی بدلہ لینے کا حکم دیا جاتا۔اگر تمہارے ساتھ سختی کی گئی ہے تو تم بھی ویسی ہی سختی کرو،مگر ایسا نہیں فرمایا بلکہ کہا وان عاقبتم اگر ایسا ہو کہ تم مخالف کی سختی کے جواب میں سختی کرنا چاہو،تو چاہیے کہ حد سے نہ بڑھو،اس سے معلوم ہوا کہ سختی کے جواب میں سختی کا حکم نہیں ہے محض اجازت ہے۔اگر ایک آدمی وہ مقام حاصل نہیں کرسکتا جو اس بارے میں بہتری اور خوبی کا اصلی مقام ہے۔جھیل جانا اور بخش دینا،تو پھر اسے بدلے کی اجازت دے دی گئی ہے۔لیکن اجازت کو بمثل ماعوقبتم سے مقید کردیا ہے۔تاکہ زیادتی کا دروازہ بکلی بند ہو جائے۔اب دو ہی راہیں کھلی رہ گئیں۔عزیمت تو اس میں ہوئی کہ جھیل جاؤ اور بخش دو۔رخصت اس کی ہوئی کہ جتنی سختی کی گئی ہے اتنی ہی تم بھی کرلو،اس کے آگے قدم نہیں بڑھا سکتے۔ (ترجمان القرآن جلد دوم ص ۳۴۴ تا ۳۴۵)

نوٹ:......اس مقالہ میں ترجمان القرآن کے صفحات کے جو حوالے دیے گئے ہیں جلد اول مکتبہ سعیدیہ ناظم آباد نمبر۲ کراچی اور جلد دوم بھی مکتبہ سعیدیہ کراچی کی شائع کردہ ہے۔

(عراقی)

دو تاریخی و تحقیقی شاہکار

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں سورہ کہف کی تفسیر میں اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے بارے میں تاریخی و تحقیقی حقائق بیان فرمائے ہیں۔مولانا کی اس تاریخی تحقیق کو اہل علم نے بہت پسند کیا ہے اور بہت زیادہ تعریف کی ہے۔اور برصغیر (پاک و ہند) کے مفسرین نے مولانا کی اس تحقیق سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔

اصحابِ کہف

اصحاب کہف اور الرقیم پر مولانا نے آیات قرآنی،اقوال مفسرین سے روشنی ڈالتے ہوئے،توراۃ،انجیل،اور بعض انگریزی کتابوں سے اصحاب کہف اور الرقیم کی تفسیر کی ہے۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ:

”قرآن نے جس طرح اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے

کہ اس واقعہ کی عرب میں شہرت تھی۔لوگ اس کے بارے میں بحثیں کیا کرتے تھے۔اور اسے ایک نہایت ہی عجیب وغریب بات تصور کرتے تھے۔"

(ترجمان القرآن جلد دوم ص ۳۹۲)

مولانا لکھتے ہیں:

یہ چند نوجوان تھے جنہوں نے سچائی کی راہ میں دنیا کی راحتوں سے منہ موڑا۔اور ایک خاص غار میں پناہ گزیں ہو گئے۔ان کے پیچھے ظلم وستم کی قوتیں تھیں۔سامنے غار کی تاریکی ووحشت،تاہم وہ ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے،انھوں نے کہا۔خدایا تیری رحمت کا آسرا ہے۔ اور تیری ہی چارہ سازی پر بھروسہ،چنانچہ کئی سال تک وہ وہیں رہے اور اس طرح رہے کہ دنیا کی صداؤں کی طرف سے ان کے کان بالکل بند تھے۔پھر ہم نے ان کو اٹھا کھڑا کیا تاکہ واضح ہو جائے۔ان دونوں جماعتوں میں کون سا گروہ تھا جس نے اس عرصہ میں نتائج عمل کا بہتر اندازہ کیا ہے۔یعنی صورت حال نے دو جماعتیں پیدا کر دی تھیں۔ایک اصحاب کہف تھے۔ایک ان کے مخالف،ایک نے حق کی پیروی کی دوسرے نے ظلم وتشدد پر کمر باندھی۔ یہ چند برسوں کی مدت دونوں جماعتوں پر گزری تھی۔اس پر بھی جو غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی۔اور اس پر بھی جس نے غار میں پناہ لینے کے لیے انہیں مجبور کیا،اب یہ دیکھنا تھا کہ دونوں میں سے کس نے کمایا ہے اور کس نے کھویا ہے،کون ان دونوں میں بہتر اندازہ شناس تھا۔

ظالم جماعت کی ظلم میں عمر بہت تھوڑی تھی اور بالآخر وہی راہ فتح مند ہونے والی تھی جو اصحاب کہف نے اختیار کی تھی۔کیونکہ بالآخر مسیحی دعوت تمام ملک میں پھیل گئی اور جب کچھ عرصہ کے بعد وہ غار سے نکلے اور ایک آدمی کو آبادی میں بھیجا،تو اب مسیحی ہونا کوئی قابل جرم نہیں رہا تھا۔

صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان پرستاران حق کی استقامت ہی تھی جس نے دعوت حق کو فتح مند کیا۔اگر وہ مظالم سے تنگ آکر اتباع حق سے دستبردار ہو جاتے تو یقیناً یہ انقلاب ظہور میں نہ آتا۔

(ترجمان القرآن جلد دوم ص ۳۹۴)

مولانا آزاد کی اصحاب کہف اور الرقیم کے بارے میں تحقیق سے متعلق مولانا سعید احمد

اکبر آبادی لکھتے ہیں کہ:

''قرآن مجید میں جہاں اصحاب کہف کا ذکر آتا ہے تو وہاں دو چیزیں بہت اہم ہیں۔ ایک تو یہ جس کہف کا قرآن میں ذکر آتا ہے وہ کہاں پر واقع ہے۔ قرآن نے محض کہف کو کہف کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ اس کی ایک خصوصیت بتائی ہے کہ یہ کہف اس طرح واقع تھا کہ وہاں دھوپ نہیں آتی تھی۔ اس کی پوزیشن اس طور پر تھی، دوسری یہ کہ وہاں رقیم کا لفظ آیا ہے۔ اب یہاں رقیم سے کیا مراد ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ بعض اصحاب نے یہاں تک لکھ دیا کہ اصحاب کے ساتھ جو کتا تھا اس کا نام رقیم تھا۔ یہ کتنی لغو اور بے سروپا بات ہے۔ اب یہ تحقیق کرنا ہے کہ کہف کہاں تھا اور رقیم سے مراد کیا ہے۔ چونکہ مستشرقین قرآن مجید میں بیان کردہ ایسے واقعات کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ سنی سنائی باتیں اور داستانیں پیغمبر اسلام نے قرآن مجید میں درج کر دیں۔ ان کی تاریخی حقیقت کوئی نہیں ہے۔ تو مولانا آزاد نے اس کا بڑا اہتمام کیا کہ قرآن مجید میں تاریخی واقعات کے متعلق جو کچھ بھی آیا ہے اسے اپنی تحقیق کے ذریعے مکمل طور پر ثابت کریں تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ہو کہ یہ محض ہوائی باتیں ہیں۔ اس بناء پر مولانا آزاد نے کہف کے متعلق بڑی تحقیق کی ہے۔ انھوں نے آثار قدیمہ کی بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا اور اپنا یہ نظریہ قائم کیا کہ اردن میں عمان کے پاس جو پہاڑیاں ہیں۔ ان میں بے شمار کہف یعنی غار پائے جاتے ہیں۔ ان میں ایک کہف (غار) ایسا ہے جو بالکل اسی کہف کا مصداق ہے۔ جس کا قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ پھر جہاں تک رقیم کا تعلق ہے تو مولانا نے اپنی تحقیق کے نتیجہ میں لکھا ہے کہ فلاں زمانہ میں ایک پادری کو ایک ذریعہ سے ایک غار میں مٹکا میں رکھے ہوئے کچھ کاغذات ملے تھے۔ مولانا نے ان کاغذات کی دستیابی کی داستان لکھی ہے۔ آپ اس کو پڑھیں۔ مولانا آزاد کا کمال اصل میں یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیقات اس وقت لکھی تھیں جب کہ

کہف اور رقیم کے متعلق تحقیق کا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔

اللہ کا شکر ہے کہ اب یہ تحقیقات مکمل ہوگئی ہیں اور مولانا آزاد کے ان نظریات کے مطابق ہیں جو مولانا نے اپنے دقیق اور تحقیقی مطالعہ سے قائم کیے تھے۔ مولانا آزاد کا یہ تحقیقی کام وہ چیز ہے کہ جو انتہائی قابل ستائش ہے پھر اس پہلو ہی سے نہیں بلکہ اور بھی بے شمار پہلوؤں سے مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن انتہائی قابل قدر خصوصیات کی حامل ہے۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم از سعید احمد اکبر آبادی ص ۵۸)

ذوالقرنین کی شخصیت اور اس کی تاریخی تحقیق

مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن مجید کی ایک تاریخی شخصیت کی بھی تحقیق کی ہے اور وہ شخصیت ذوالقرنین کی ہے۔ مولانا نے اس مسئلہ پر بڑی دقیق بحث کی ہے۔ اور بڑی تفصیلی بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ ذوالقرنین سکندر مقدونی ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ وہ ایران کا ایک نیک خصلت بادشاہ کیخسر و تھا۔ ذوالقرنین کے متعلق تحقیق مولانا آزاد کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

برصغیر (پاک وہند) کے مفسرین نے مولانا کی ذوالقرنین کی تحقیق سے بہت زیادہ استفادہ کیا۔ اور اس پر مولانا نے جو لکھا ہے اس کو اپنی تفسیروں میں نقل کیا ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ انھوں نے اس مسئلہ میں مولانا کی تحقیق کی کاوش کا حوالہ دینے سے گریز کیا ہے۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی لکھتے ہیں کہ:

ذوالقرنین کی تعیین اور تشخیص میں ۱۵سو برس کا تمام تفسیری لٹریچر مختلف احتمالات اور اندازے پیش کرنے پر اکتفا کرتا رہا ہے۔

اور اگر کسی کو ترجیح دی گئی ہے تو وہ علامہ ابن کثیر دمشقیؒ (وفات ۷۷۴ھ/۱۳۷۲ء) کی تحقیق ہے۔ جس میں ذوالقرنین وہ سکندر ہے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی معاصرت حاصل ہے۔

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ نے بھی شارح بخاری علامہ عینی کے حوالہ سے اسی رائے کو تسلیم کیا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس تحقیق سے گریز کیا ہے۔اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ۱۹۲۵ء میں علامہ ابن کثیرؒ ہی کی رائے کو ترجیح دی ہے۔اور یاجوج ماجوج کے بارے میں یہ عجیب بات لکھی کہ میرا خیال ہے یاجوج ماجوج کی قوم عام انسانوں اور جنات کے درمیان ایک برزخی مخلوق ہے۔

مولانا محمد علی لاہوری نے اپنی تفسیر بیان القرآن (۱۹۲۲ء) میں تمام قدیم توجیہات سے ہٹ کر دانیال نبی کے خواب پر توجہ کی۔اور بائیبل کے اشارہ سے فارس کے شہنشاہ دارائے اول کو قرآن کا ذوالقرنین بتایا۔دارائے اول سائرس کا دادا تھا۔اور یاجوج ماجوج کو عیسائی قومیں قرار دیا۔

قدیم تحقیقات سے ہٹ کر فارسی حکمران دارائے اول کی طرف یہ پہلا تحقیقی اشارہ تھا۔اس اشارہ کی مکمل تحقیق اور نشاندہی تک پہنچانے کا سہرا مولانا آزاد کے سر ہے۔

مولانا آزاد نے ۱۹۳۲ء میں ترجمان القرآن جلد دوم میں صدیوں سے اشتباہ واحتمال میں پڑے ہوئے اس تاریخی مسئلہ کی مکمل تحقیق کی۔

اورعلوم جدیدہ اور اثری تحقیقات پر مشتمل تمام تحقیقی مواد کا بغور مطالعہ کیا اور تیس (۳۰) صفحات پر فیصلہ کن بحث کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ذوالقرنین قرآنی آیات کے مطابق فارس کا شہنشاہ سائرس ہے۔اور یاجوج ماجوج منگولی قبائل ہیں۔

تیس (۳۰) صفحات پر پھیلی ہوئی بحث کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ مولانا آزاد نے قرآن کریم کے اس تاریخی مسئلہ کو اشتباہ اور احتمالات سے نکال کر قطعیت اور یقین کی روشنی میں لانے کے لیے قدیم مذہبی کتابوں اور جدید اثری تحقیقات پر مشتمل انگلش لٹریچر کی پوری پوری الماریاں کھنگالی ہیں۔

مولانا آزاد کی یہ تحقیق قول فیصل قرار پائی۔اور ترجمان القرآن کے بعد جس قدر تفسیریں اور تاریخیں وجود میں آئیں۔سب میں ترجمان القرآن کی تحقیق کو تسلیم کیا گیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی قصص القرآن ۴۱۔۴۲ء میں لکھی گئی۔مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی تفہیم القرآن ۱۹۵۱ء میں سامنے آئی۔اور ان دونوں حضرات نے ترجمان

القرآن کی تحقیق کو تسلیم کیا۔

۱۹۷۲ء میں پاکستان کے مفتی اعظم مولانا شفیع صاحب کی ''معارف القرآن'' چھپی اور مفتی صاحب نے ترجمان القرآن ہی کی تحقیق کو قصص القرآن کے حوالہ سے قبول کیا۔

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب اس مسئلہ میں لکھتے ہیں:

''یہ مسئلہ قدیم زمانے سے اب تک مختلف فیہ رہا ہے کہ ذوالقرنین جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے کون تھا۔ قدیم زمانہ میں بالعموم مفسرین کا میلان سکندر کی طرف تھا۔ لیکن قرآن میں جو صفات وخصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ مشکل ہی سے سکندر پر چسپاں ہوتی ہیں۔

جدید زمانہ میں تاریخی معلومات کی بناء پر مفسرین کا میلان زیادہ تر ایران کے فرمانروا خورس (خسرو یا سائرس) کی طرف ہے۔ اور یہ نسبتاً زیادہ قرین قیاس ہے۔''

(مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت ص ۲۰۸ تا ۲۱۰)

۱۹۸۰ء میں مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر تدبر قرآن وجود میں آئی۔ اور اصلاحی صاحب نے بھی ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج کی تحقیق کے بارے میں ترجمان القرآن کے دلائل ومباحث کا خلاصہ پیش کرنے پر اکتفا کیا۔ اس سے آگے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

لیکن تعجب ہے کہ ان بڑے بڑے مصنفین نے اس تحقیقی مسئلہ میں مولانا آزاد کی تحقیقی کاوش کا حوالہ دینے سے گریز کیا ہے۔ اور یہ بات علمی دنیا میں پسندیدہ نہیں سمجھی جاتی۔

(مولانا ابوالکلام آزاد کی قرآنی بصیرت ص ۲۰۸ تا ۲۱۰)

ذوالقرنین کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

اس سورۃ (کہف) میں تیسرا واقعہ جو بیان کیا گیا ہے وہ ذوالقرنین کا ہے کیونکہ لوگوں نے اس بارے میں سوال کیا تھا۔ تمام مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ سوال یہودیوں کی جانب سے تھا۔ اگرچہ غالباً مشرکین مکہ کی زبانی ہو کیونکہ سورۃ مکی ہے۔

قرآن نے ذوالقرنین کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے اس پر بہ حیثیت مجموعی نظر

ڈالی جائے تو حسب ذیل امور سامنے آتے ہیں:

۱۔ جس شخص کی نسبت پوچھا گیا وہ یہودیوں میں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا۔یعنی ذوالقرنین کا لقب خود قرآن نے تجویز کیا ہے یا پوچھنے والوں کا مجوزہ ہے کیونکہ فرمایا ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ﴾ (۸۳)

۲۔ اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اسے حکمرانی عطا فرمائی تھی اور ہر طرح کا ساز وسامان جو ایک حکمران کے لیے ہوسکتا تھا۔اس کے لیے فراہم ہوگیا تھا۔

۳۔ اس کی بڑی مہمیں تین تھیں ۔ پہلے مغربی ممالک فتح کیے ، پھر مشرقی پھر ایک ایسے مقام تک فتح کرتا چلا گیا جہاں پہاڑی درہ تھا۔اور اس کے دوسری طرف سے یاجوج ماجوج آکر لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔

۴۔ اس نے وہاں ایک نہایت مستحکم سد تعمیر کردی اور یاجوج ماجوج کی راہ بند ہوگئی۔

۵۔ وہ ایک عادل حکمران تھا۔ جب وہ مغرب کی طرف فتح کرتا ہوا دور تک چلا گیا تو ایک قوم جس نے خیال کیا کہ دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح ذوالقرنین بھی ظلم وتشدد کرے گا لیکن ذوالقرنین نے اعلان کیا کہ بے گناہوں کے لیے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔جو لوگ نیک عملی کی راہ چلیں گے ان کے لیے ویسا ہی اجر بھی ہوگا۔البتہ ڈرنا انہیں چاہیے جو جرم وبدعملی کا ارتکاب کرتے ہیں۔(۸۵)

۶۔ وہ خدا پرست اور راست باز انسان تھا اور آخرت کی زندگی پر یقین رکھتا تھا۔(۸۷) و (۹۸)

۷۔ وہ نفس پرست بادشاہوں کی طرح طامع اور حریص نہ تھا۔جب ایک قوم نے کہا، یاجوج ماجوج ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک سد تعمیر کردیں ہم خراج دیں گے۔اس نے کہا:﴿مَا مَكَّنِّي فِيْهِ رَبِّ خَيْرٌ﴾(الکهف: ۹۵) جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہی میرے لیے بہتر ہے میں تمہارے خراج کا طامع نہیں ۔ یعنی میں خراج کی طمع سے یہ کام نہیں کروں گا۔اپنا فرض سمجھ کر انجام دوں گا۔(ترجمان القرآن جلد دوم ص ۳۹۹)

قرآن کا ذوالقرنین ''سکندر مقدونی'' نہیں ہوسکتا۔ نہ تو وہ خدا پرست تھا، اور نہ مفتوح لوگوں کے لیے فیاض تھا، اور نہ اس نے کوئی سد بنائی۔

(ترجمان القرآن جلد دوم ص ۴۰۰)

سلف اور صحابہ سے جو تفسیر منقول ہے وہ یہی ہے کہ ذوالقرنین نبی تھا اور متاخرین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد حافظ ابن کثیر بھی اسی تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔

(ترجمان القرآن جلد دوم ص ۴۲۰)

باقیات ترجمان القرآن

باقیات ترجمان القرآن کے نام سے دو مجموعے شائع ہوئے۔

ایک مجموعہ مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے مرتب کیا۔ اور شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کیا۔ صفحات ۱۱۰، سن اشاعت طبع اول ۱۹۶۱ء۔

دوسرا مجموعہ سید اصغر بخاری نے مرتب کیا۔ اور مکتبہ اشاعت ادب انارکلی لاہور نے شائع کیا۔ صفحات ۱۴۴، سن اشاعت ندارد۔

مولانا غلام رسول مہر نے آغاز میں ۶۰ صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ اور اس کے بعد سورۃ نور تا سورۃ اخلاص آیات کا ترجمہ مع تفسیر وتشریح جو تمام تر مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریرات وتصریحات سے مرتب کیا ہے۔

﴿اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى﴾ (سورة الليل)

''بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم رہنمائی کریں اور یقیناً آخرت اور دنیا دونوں ہمارے ہی لیے ہے۔''

مولانا کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں:

''قرآن کا عام اسلوب بیان یہ ہے کہ خدا کے ٹھہرائے ہوئے قوانین واسباب سے جو نتائج پیدا ہوئے ہیں انہیں براہ راست خدا کی طرف نسبت دیتا ہے۔ مثلاً اس کا ایک قانون یہ ہے کہ جو لوگ سمجھ سے کام لینے کی جگہ اندھی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کی عقلیں ماری جاتی ہیں۔ قرآن اس حالت کو

یوں تعبیر کرے گا کہ خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی یعنی یہ صورت حال خدا کے ٹھہرائے ہوئے قانون کا قدرتی نتیجہ ہے۔''

(باقیات ترجمان القرآن ص ۱۰۶)

سید اصغر بخاری کے مرتب کردہ باقیات ترجمان القرآن میں ۱۴ صفحات کا دیباچہ ہے اس کے بعد ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے قدیم مضامین اور مولانا ابوالکلام آزاد کی دیگر تحریرات سے مرتب شدہ وہ سورتیں ہیں جو ترجمان القرآن جلد سوم کا حصہ ہیں۔ اور جو تمام تر مولاناؒ کے ترجمہ وتصریحات پر مشتمل ہیں۔

﴿وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ o اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ o﴾ (العصر)

''(قسم ہے اس عصر انقلاب اور دور تغیرات کی جو پچھلے دور کو ختم کرتا ہے اور نئے دور کی بنیاد رکھتا ہے کہ نوع انسانی کے لیے دنیا میں نقصان وہلاکت کے سوا کچھ نہیں۔ مگر ہاں وہ نفوس قدسیہ جو قوانین الٰہیہ پر ایمان لائے اور اعمال صالحہ اختیار کیے، ایک دوسرے کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے سے دین حق کی وصیت کرتے رہے۔ نیز صبر واستقامت کی بھی انھوں نے تعلیم دی۔''

مولانا کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں:

اسلام ایک مکمل مذہب کے تمام اجزاء کا مجموعہ ہے۔ اس لیے اس نے عقائد وعبادات کے سلسلے میں اخلاق کو بھی نمایاں جگہ دی۔ لیکن خاص طور پر جن اخلاق حسنہ کی تعلیم دی وہ تمام تر فوجی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے صبر وتوکل اور عزم واستقلال کی ہر موقع پر تعلیم دی۔ اور یہی چیزیں ہیں جن کے ذریعے سے کوئی فوج میدان جنگ میں ثابت قدم رہ سکتی ہے۔ اسلام دنیا میں حق وصداقت کی اشاعت کے لیے آیا۔ حق وصداقت کا میدان صرف جہاد کے ذریعے فتح ہوسکتا تھا۔ صبر جہاد کی حقیقت کے لیے اصل شرط ہے پس اس نے (اسلام نے) ہمیشہ حق وصبر کو لازم وملزوم قرار دیا۔

(باقیات ترجمان القرآن مرتبہ سید اصغر بخاری ص ۱۴۳)

قرآن نے ایمان اور اہل ایمان کی نسبت جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بات بھی اس قدر نمایاں نہیں جس قدر یہ کہ خوف اور غم دونوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ حقیقت یہی ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا ،اس کی شقاوت کی سرگزشت انہی دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے ،خوف اور دکھ: جونہی ان دو باتوں سے رہائی مل گئی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آ گئیں ۔قرآن نے یہ حقیقت دوسرے پیرائے میں بھی بیان کی ہے۔ مثلاً سورۃ العصر اسی حقیقت کا اعلان ہے۔

(باقیات ترجمان القرآن مرتبہ غلام رسول مہر ص ۱۰۹)

باب نمبر ۶

مولانا ابوالکلام آزاد کا تصور حدیث

مولانا ابوالکلام آزاد عبقری تھے۔ اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ علم ان کے لیے تھا یا وہ علم کے لیے تھے۔ انھوں نے علم حاصل کیا یا علم نے ان کو حاصل کیا۔ علم نے ان پر حکمرانی کی یا وہ علم پر حکمرانی کرتے رہے۔ وہ علم کے فاتح تھے یا مفتوح۔

مولانا آزاد یگانہ روزگار عالم تھے۔ اور بنیادی طور پر عالم بے بدل تھے۔ تمام علوم اسلامیہ پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ گویا آپ علوم اسلامیہ کا بحر زخار تھے۔ مولانا کے بارے میں بعض حضرات نے یہ شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ کا حدیث کے بارے میں نظریہ سلف صالحین کے نظریہ کے مطابق نہیں تھا۔ یہ صرف ان کے مخالفین کا ایک لایعنی پروپیگنڈہ ہے۔ اگر مولانا کی تصانیف اور خاص کر ان کی تفسیر ترجمان القرآن کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مولانا حدیث کے بارے میں وہی نظریہ رکھتے تھے جو سلف صالحین کا تھا۔

مولانا غلام رسول مہر مرحوم مولانا کی خدمت حدیث کے بارے میں اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''مولانا کی پوری حیات دعوت ایسی مثالوں سے معمور ہے یہاں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں جن کی زندگیاں علم حدیث پڑھانے میں بسر ہوئیں۔ اور انھوں نے اس وسیع سرزمین میں یہ علم ازسرنو زندہ کیا جو دین کے اہم مآخذ میں سے ہے۔ لیکن نئے تعلیم یافتہ طبقہ میں حدیث کی عظمت واہمیت پیدا کرنے کا جو اہم کام مولانا نے انجام دیا، اس میں کوئی ان کا شریک وسہیم نہیں۔ ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کی جلدوں میں سیکڑوں مضمون مل جائیں گے، جو حدیث کی شرح

کے حامل ہیں۔اور یہ شروح ایسے دل آویز انداز میں کی گئی ہیں کہ پڑھتے ہی ہر شخص کے دل میں اتر جاتی ہیں۔لیکن قدر ناشناسی کی عجوبہ گری ملاحظہ ہو کہ اسی شخصیت پر اس سلسلے میں تشکیک کا الزام لگایا جاتا ہے۔مولانا آج اس دنیا میں موجود نہیں۔لیکن ہوتے بھی تو اس کے سوا کیا کہتے:

نیشکر آں چناں نخورد کس زدست دوست
کازا دکاں زدست مبارز سناں خورند

اور سب کو چھوڑ دیجیے۔ترجمان ہی کو دیکھ لیجیے۔مسلسل ومتواتر احادیث کے حوالے موجود ہیں۔ان سے اپنے پیش کردہ مطالب کی توثیق کی گئی ہے۔کہیں بخاریؒ کا حوالہ ہے کہیں مسلمؒ کا۔اور کہیں اصحاب سنن کا۔کیا یہ حدیث میں تشکیک کا ثبوت ہے، کیا اسے راہ تشکیک پیدا کرنے سے تعبیر کیا جائے گا۔حدیث سے عشق ومحبت مسلم سہی۔لیکن اس کا یہ طریقہ نہیں کہ جوش غیرت کا یہ سرمایہ اپنوں پر ہی صرف کردیا جائے۔اور مولانا محمد علی مرحوم کے ایجاد کردہ محاورے کے مطابق ''پورس کے ہاتھی'' بن کر اپنی ہی صفوں کو پامال کر ڈالا جائے۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ غلام رسول مہر ص ۲۴۲، ۲۴۳)

مولانا کو حدیث سے بہت زیادہ شغف تھا۔۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی نعمانی کی وفات پر کلکتہ میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا تھا۔اس جلسہ میں مولانا شبلی کی حیات علمی وادبی اور اس میں تدوین علوم کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا:

''نہ صرف عظمت موضوع ونفس مضمون کے لحاظ سے بلکہ طرز تصنیف وترتیب، ضبط مطالب، اور حسن تقسیم وتنظیم کے لحاظ سے بھی تاریخ اسلام میں بہترین کتاب صحیح بخاری لکھی گئی ہے۔اور کوئی اسلامی تصنیف اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ امام بخاری کے بعد بقیہ اصحاب صحاح، جامعین سنن ومعاجم ومسانید نے نئے نئے اسلوب مطالب پیدا کیے۔مگر کوئی کتاب صحیح بخاری تک نہ پہنچ سکی۔اور یہ میں محض حدیث کی قدیم خوش اعتقادی کی بناء پر نہیں کہہ رہا بلکہ یقین کیجیے اس

فن تصنیف کو پیش نظر رکھ کر جو ترقی یافتہ علمی زبانوں میں آج پایا جاتا ہے میں نے علی وجہ البصیرۃ'' یہ رائے قائم کی ہے۔

(البلاغ ۱۷۔۲۴ دسمبر ۱۹۱۵ء)

یہ اس جلیل القدر ہستی کا اعلان صحیح بخاری کے متعلق ہے اور آج کا نہیں ۹۲ سال پیشتر کا اعلان ہے اور یہ رائے مولانا نے ترقی یافتہ زبانوں کے مروجہ فن تصنیف کی بناء پر قائم کی تھی۔

مولانا کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر مسلمان اپنے دینی و دنیاوی معاملات میں قرآن وحدیث پر عمل پیرا ہو جائیں تو کامیابی و کامرانی ان کے قدم چومے گی۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''اگر آج بھی مسلمان من حیث الاجتماع کتاب اللہ اور حدیث رسول ﷺ کو حرز جان بنالیں اور ان دونوں پر خلوص نیت اور خلوصِ دل سے عمل کرنے کا عہد کرلیں تو نہ صرف ان کی غلامی اور کمتری کی زنجیریں کٹ جائیں بلکہ ساری دنیا کی سلطنتیں ان کے قدم چومنے میں فخر محسوس کریں اور ان کی زندگی پر ملائکہ بھی رشک کرنے لگیں۔''

(سیرت آزاد ص ۵۶)

مولانا عبدالمجید سوہدروی اپنی کتاب سیرت آزاد میں لکھتے ہیں کہ ایک بار ایک مجلس میں حدیث وسنت کے بارے میں استفسار ہوا کہ حدیث وسنت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

مولانا نے جواب میں فرمایا:

''آپ پوچھتے ہیں کہ احادیث کے بارے میں میرا کیا عقیدہ ہے، میں آپ کو اس کا کیا جواب دوں۔ یہ سوال آپ اس شخص سے کہہ رہے ہیں جو اپنی تحریرات میں نہ صرف حدیث کو حجت اور واجب العمل ثابت کر چکا ہے بلکہ جس کو اس فہم کی توفیق ملی ہے کہ ﴿ویعلمهم الكتاب والحكمة﴾

میں ''حکمت'' سے مقصود سنت ہے۔اور جس نے جابجا (حضرت) مقدامؓ کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ:

(الا انی اوتیت القرآن ومثله معه ، یوشك رجل شبعان علی اریکته یقول علیکم بعض القرآن فما وجدتم فیه من حلال فاحلوه وما وجدتم فیه من حرام فحرموه)

اتنا ہی نہیں بلکہ جس کی تمام قلمی جدوجہد یکسر دعوت اتباع کتاب وسنت پر مبنی رہی ہے ،اور جس کے عقیدہ میں کتاب کا ہر وہ اتباع ، اتباع ہی نہیں جو سنت کے اتباع سے خالی ہو۔

(سیرت آزاد ص ۵۱، ۵۷)

مولانا سوہدروی مرحوم مولانا آزاد کی اس تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''مولانا کی یہ نگارشات خود ان کے اعلیٰ کردار کی مظہر ہیں اور وہ یہی ہے کہ جہاں آپ اللہ تعالیٰ اور اس کے مقدس کلام کے سچے عاشق تھے وہاں آپ رسول اللہ ﷺ اور حضور ﷺ کے ارشادات مبارکہ کے بھی شیدائی صادق تھے اور کتاب وسنت کی محبت واطاعت ہی کو حقیقی اسلام سمجھتے تھے۔''

(سیرت آزاد ص ۵۸)

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے حافظہ کی غیر معمولی نعمت سے نوازا تھا۔حدیث کا حوالہ اور اس کے مرفوع یا ضعیف وغیرہ ہونے پر ان کو مکمل دسترس حاصل تھی ۔ایک آدمی نے بذریعہ خط مولانا سے دریافت کیا کہ:

''حدیث لاتسبوا الدھر فان الدھر ھو اللہ ۔سند کے لحاظ سے کیسی حدیث ہے۔مولانا نے جواب میں لکھا:

یہ حدیث ضعیف ہے نیز اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زمانہ خدا ہے بلکہ یہ ہے کہ زمانے میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی مشیت سے ہوتا ہے۔لہٰذا اسے برا نہ کہو۔''

(افادات آزاد ص ۵۰)

مولانا کو حدیث کی شرح پر عبور حاصل تھا۔ ''حدیث غربت'' کی شرح کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''یہ ایک سو صفحہ سے زائد میں ختم ہوئی ہے۔شرح حال غربت ثانیہ، وتفصیل اسباب غربت و بحث و تحقیق احادیث متن کے باب میں انشاء اللہ جامع و مانع ہوگی۔اگر اشاعت سے پہلے نظر ثانی کا موقع ملا تو بعض مطالب بڑھا دیے جائیں گے جو بسبب عدم موجودگی کتب بالفعل سرانجام نہ پا سکے۔''

(تذکرہ ص۲۵۴)

مولانا ابوالکلام آزاد شرعی مسائل میں حدیث کو حجت تسلیم کرتے تھے۔جس سلسلہ میں ضیاء الحسن فاروقی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

''سرسید نے حدیث پر کئی مضامین لکھے اور انھوں نے درایت کے اصول پر اتنا زور دیا کہ راویوں کی سند و ثقاہت کا روایتی مرتبہ مجروح ہوتا محسوس ہوا۔یہ وہی رجحان تھا جس نے عقل و نقل کی تطبیق کو لازم قرار دیا تھا۔اس رجحان میں خطرہ یہ تھا کہ شرعی مسائل میں حجیت حدیث کی حیثیت کم ہوجاتی۔لیکن مولانا آزاد نے اس معاملہ میں بھی ایک متوازن راہ اختیار کی۔اس سلسلے میں ہمیں جو کچھ ان کی تحریروں میں ملتا ہے اسی بنیاد پر یہ بات کہی جارہی ہے۔ان کا مقدمہ تفسیر اور البیان دونوں ضائع ہوگئے اور چھپ نہ سکے۔جس میں مولانا نے وعدہ کے مطابق حدیث کے موضوع پر کھل کر لکھا ہوگا۔یا لکھنے کا ارادہ کیا ہوگا۔ہمارا خیال ہے کہ مولانا اس معاملے میں سرسید سے متفق ہوں گے کہ حدیث بے سند یا ضعیف یا مشتبہ کو حدیث نہ سمجھا جائے۔اور مذہبی باتوں میں اسے داخل نہ کیا جائے۔اور یہی مسلک سبھی فقہائے مجتہدین کا تھا۔البتہ مولانا نے مسلم معاشرہ میں حدیث کی ایجابی اہمیت پر زور دیا۔اور ان کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ دعوت اسلام کی معرفت کے لیے قرآن کریم اور پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی دونوں کا مطالعہ اور دونوں میں غور و فکر ضروری ہے۔حدیث کی روایتی حیثیت ذرا بھی کم ہوئی تو حدیث کے سلسلے میں تشکیک راہ پا سکتی ہے۔

اور پھر اسلامی تعلیمات کے فہم کا ایک بنیادی وسیلہ کمزور ہو کر رہ جائے گا۔

''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں مولانا نے حجیت حدیث کے قیام وثبات کے لیے احادیث کی شرحیں دلآویز انداز میں بیان کیں۔ اور برملا کہا کہ روایت حدیث کی صحت کی تصدیق اگر عقل سے نہ ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ روایت یکسر غلط ہے یا موضوع ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے یہ بھی لکھا کہ یہی وہ سرحد ہے جہاں باوجود اتحاد مقصد واصول مجھے آج کل کے مصلحین مذہب سے الگ ہونا پڑتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ جس حدیث اور جس روایت کو اپنے خودساختہ معیار عقلی سے ذرا سا الگ پاتے ہیں۔ معاً اس سے انکار کر دینے کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر انہیں علوم دینیہ کے حصول کا موقع ملا ہوتا اور علم دین پر نظر ہوتی تو وہ دیکھتے کہ اس مقصد کو اصول فن کے ساتھ چل کر بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ کیا ضرورت ہے کہ ان روایات کی تغلیط محض اس وجہ سے کر دی جائے کہ وہ عقل میں نہیں آتیں۔''

مولانا آزاد حدیث کی اصح الکتب صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی صحت کو تسلیم کرتے تھے۔ اور ان کتابوں کے بارے میں کسی قسم کے شک وشبہ کے قائل نہیں تھے۔ ضیاء الحسن فاروقی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا کے نزدیک قرآن کے بعد دین کی ان کتابوں میں جو انسانوں کی ترتیب دی ہوئی ہیں سب سے زیادہ صحیح کتاب جامع بخاری اور جامع مسلم ہے۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از ضیاء الحسن فاروقی ص ۸۹ تا ۹۱)

باب نمبر ۷

مولانا ابوالکلام آزاد کی مذہبی فکر

مولانا ابوالکلام آزاد ایک نادرِ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔اور ایسے گونا گوں اوصاف ومحاسن کسی ایک وجود میں جمع نہیں ہوتے ہیں۔انھوں نے زندگی کے اتنے بڑے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا جن کا حصر مشکل ہے۔اوران میں سے کسی ایک دائرے میں ایسی بلندی حاصل کر لینا بڑے سے بڑے انسان کے لیے بھی دائمی فخر کا سامان ہوسکتا ہے۔

مولانا کا تعلق عظیم المرتبت انسانوں کی اس آخری صف سے تھا۔اور ایسے انسان زمانے کے دور گزر جانے کے بعد ہی عرصہ شہود پر جلوہ آراء ہوتے ہیں۔

مولانا آزاد عدیم المثال عالم ،یگانہ روزگار مفسر قرآن ،بلند مرتبہ محدث ،علم وفن کے امام ومجتہد ،عالی مرتبت مؤرخ اور محقق ،ذہانت وذکاوت ،فہم وفراست ،اور تدبر وتفکر میں بے مثال تھے۔علم وفضل ،حقائق دین ،فلسفہ وحکمت ،شعروادب ،تصنیف وتالیف ،تقریر وخطابت اخبار نویسی وصحیفہ نگاری ،سیاست وملک داری ،غرض کون سا دائرہ اور کون سا حلقہ ہے جس میں ان کی یگانگی ابتداء ہی سے سب کے نزدیک ثابت ومسلم نہ تھی۔اور آج تک اس کی تصدیق وتوثیق نہ ہوتی رہی۔

مولانا کا خاندان شروع ہی سے مذہبی تھا۔اس میں اچھے اچھے علماء وفضلاء پیدا ہوتے رہے۔جیسا کہ ان کی کتاب ''تذکرہ'' سے ظاہر ہوتا ہے۔مولانا آزاد کی ولادت مکہ معظّمہ میں ہوئی۔اور ان کی ابتدائی تعلیم بھی مکہ معظّمہ میں ہوئی ،مولانا نے علوم اسلامیہ کی تحصیل اپنے والد مولانا خیرالدین اور دوسرے اساتذہ سے گھر ہی میں کی۔انھوں نے کسی مدرسہ میں باضابطہ تعلیم پاکر کوئی سند حاصل نہیں کی تھی۔مولانا پر ایک دفعہ اعتراض ہوا تھا کہ آپ

کسی مدرسے کے فارغ التحصیل نہیں ہیں۔اس لیے آپ باضابطہ سند یافتہ عالم نہیں ہیں تو مولانا نے اس کا یہ جواب دیا کہ:

''آپ پوچھتے ہیں کہ مشرق ومغرب کے کن دارالعلوموں میں ادنیٰ یا اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔گزارش ہے کہ الحمدللہ کسی میں نہیں۔البتہ رب المغربین اور رب المشرقین کی اس درسگاہ میں فیض یاب ہوا جس نے اپنی نسبت کہا ہے کہ بے شک اللہ کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور ہدایت اور ہر بات کو بیان کرنے والی ایک کتاب آئی ہے۔اللہ اس سے سلامتی کے راستوں کی اس شخص کو ہدایت کرتا ہے جو اس کی رضامندی پر چلتا ہے،اور ان کو اپنے حکم کے ذریعہ جہل وضلالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی بخشتا ہے۔اور مختصر یہ کہ صراط مستقیم پر چلاتا ہے۔اور جب اس درسگاہ الٰہی کا دروازہ مجھ پر کھل گیا تو تمام کاغذ کی سند دینے والے انسانی دارالعلوموں سے بے نیاز ہو گیا ہوں۔''

(الہلال ۲۳ستمبر۱۹۱۲ء)

مولانا عربی،فارسی اور اُردو زبانوں پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔انھوں نے کم سنی ہی میں قلم سنبھالا۔انھوں نے سب سے پہلے علامہ جلال الدین سیوطی کے ایک رسالہ جس کا موضوع احکام جمعہ تھا، کا ترجمہ کیا۔اس کا نام ''نوراللمعہ فی فضائل الجمعہ'' تھا۔اس کے علاوہ علامہ سیوطی کے ایک دوسرے رسالہ انیس الحبیب فی خصائل الحبیب کا بھی ترجمہ کیا۔جو ''خصائص محمدیہ'' کے نام سے شائع ہوا۔

مذہبی علوم کے ساتھ مولانا شعروادب سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔چنانچہ آپ نے اپنے ذوق شعری کی تکمیل کے لیے ۱۸۹۹ء میں ''نیرنگ عالم'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔مگر یہ رسالہ صرف ۸ ماہ تک جاری رہ سکا۔۱۹۰۰ء میں ہفتہ وار ''المصباح'' کے نام سے ایک اخبار نکالا۔جو صرف ۴ ماہ تک جاری رہا۔۱۹۰۳ء میں اپنی ادارت میں ''لسان الصدق'' نکالا۔اس کا مقصد اول اصلاح معاشرت،اور دوسرا مقصد ترقی اردو،اور تیسرا مقصد علمی ذوق کی اشاعت اور چوتھا تنقید تھا۔

۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی نعمانی کے رسالہ ماہنامہ ''الندوہ'' لکھنو سے وابستہ ہوئے ۔اس وقت مولانا کی عمر ۱۷ برس تھی ۔مولانا اس رسالہ سے اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک منسلک رہے ۔انھوں نے اس رسالہ میں ۶ ماہ میں کئی ایک علمی و دینی مضامین لکھے ۔اور اس وقت ملک میں مولانا کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

مولانا سیّد صباح الدین عبدالرحمان لکھتے ہیں کہ:

''یہ امر واقعہ ہے کہ وہ ملک میں ایک ماہر اہل علم، قابل قدر عالم اور پر زور صاحب قلم کی حیثیت سے پہلی بار ''الندوہ'' ہی کے ذریعہ سے روشناس ہوئے ۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از خلیق انجم ص ۲۹۱)

جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا نے کلکتہ سے ہفتہ وار ''الہلال'' جاری کیا ۔اس وقت مولانا کی عمر ۲۴ برس سے زیادہ نہ تھی ۔مگر اس وقت تک ان کی عبقریت کی وجہ سے ان کی مذہبی، سیاسی، ادبی اور علمی بصیرت کی شہرت بدر کامل بن گئی ۔الہلال مسلمانوں کی ملی غیرت، ایمانی حرارت اور مذہبی محبت کا بہت بڑا محاذ بن گیا۔مولانا نے اپنی تحریروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ایمانی حرارت اور ملی محبت کو عقل و بصیرت عطا کی ۔مولانا سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن ''الہلال'' کی تحریروں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اس جریدہ سے ان کے ادب وانشاء کا جو رنگ اُبھرا وہ کسی اور اہل قلم کو نصیب نہ ہوا۔اس میں ان کے سینے کا داغ کاغذ کے صفحات پر لالہ بن کر نمودار ہوا۔ ان کی تحریروں میں کبھی دہکتی ہوئی آگ اور کڑکتی ہوئی بجلی دکھائی دیتی ہے۔کبھی ان میں شوکت بیان اور جوش وخروش کا سیلاب امنڈتا ہوا نظر آتا ہے، کبھی انداز نو کی جھنکار، اور للکار سنائی دیتی ہے ۔وہ کبھی تحریروں کے موتی لٹاتے رہے اور کبھی پھول برساتے رہے ۔اور تعجب یہ ہے کہ وہ اپنے عالمانہ فکر و نظر کی وجہ سے ان تحریروں کو قرآنی آیتوں سے سنوار کر کے پیرایۂ بیان کو بلیغ اور مؤثر بناتے تھے ۔اور ان پر بلاغت قرآنی کا اتنا اثر تھا کہ ان کا بس چلتا تو اس ساری بلاغت کو اردو ادب میں منتقل کر دیتے ۔ان کی خوبی یہ تھی کہ کوئی چھوٹی سی بھی

تحریر لکھتے تو اس میں قرآنی آیت اس طرح لے آتے جیسے کوئی ادیب یا انشاء پرداز کوئی اچھا سا شعر اپنی تحریر میں استعمال کر جاتا ہے۔ان کی تحریر میں ایک ہی خیال کا اعادہ ہوتا۔ پُرشکوہ الفاظ اور فقروں کی چمک دمک کی تکرار بھی ہوتی۔ یہ بات عالم ہونے کی حیثیت سے قرآن حکیم سے سیکھی جس میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ ''ہم آیتوں کو کس کس طرح پھیر پھیر کر مختلف صورتوں اور مختلف اسالیب ونتائج کے ساتھ بیان کرتے ہیں تا کہ لوگ سمجھیں اور عقل وبصیرت حاصل کریں۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از خلیق انجم ص ۲۹۲)

مذہبی فکر

مولانا کا مذہبی فکر بہت زیادہ پختہ تھا۔مارچ ۱۹۴۰ء کے اجلاس کانگریس منعقدہ رام گڑھ میں اپنے صدارتی خطبہ میں واشگاف الفاظ میں ارشاد فرمایا:

''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی ۱۳۰۰ برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے۔اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔''

(خطبات آزاد ص ۲۹۷)

تقلید سے نفرت

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیرالدین بہت بڑے پیر تھے۔اوران کے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔مولانا خیرالدین ان کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے۔لیکن آپ اس کے لیے رضامند نہ ہوئے۔مولانا خیرالدین کے انتقال کے بعد لاکھوں مرید مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے تھے۔لیکن مولانا ابوالکلام آزاد اس پر راضی نہ ہوئے۔ اس لیے کہ مولانا تقلید کی زنجیریں توڑ کر خالص توحید سے اپنا رشتہ جوڑ چکے تھے۔

مولانا تقلید سے سخت نفرت کرتے تھے۔اپنی ایک بامعنی تحریر میں لکھتے ہیں کہ:

''جس حال میں رہے نقشِ ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا۔اور شیوہ تقلید وروش عام سے پرہیز۔جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے کبھی دوسرے کے نقش قدم کی تلاش نہ ہوئی۔اپنی راہ خود نکالی اور دوسروں کے لیے اپنا قدم رہنما چھوڑا۔''

غبار خاطر کے خط نمبر ۱۱ میں مولانا لکھتے ہیں:

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہوگیا تھا۔اور شک وشبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سے سنائی دے رہی ہیں ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیے۔اور علم ومعرفت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔یہ چبھن عمر کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقائد وافکار کی وہ تمام بنیادیں جو خاندان، تعلیم اور گردوپیش نے چنی تھیں بہ یک دفعہ متزلزل ہوگئیں اور وہ وقت آیا کہ اس ہلتی ہوئی دیوار کو خود اپنے ہاتھوں ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چننی پڑیں:

ہیچ گہ ذوق طلب از جستجو بازم نہ داشت
دانہ می چیدیم درآں روزے کہ خرمن داشتم

میری تعلیم خاندان کے موروثی عقائد کے خلاف نہ تھی کہ اس راہ سے کوئی

کشمکش پیدا ہوتی۔ وہ سرتا سر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جو مؤثرات نسل اور خاندان نے مہیا کر دیے تھے تعلیم نے انہیں اور تیز کرنا چاہا۔ اور گرد و پیش نے انہیں اور زیادہ سہارے دیے۔ تاہم یہ کیا بات ہے کہ شک کا سب سے پہلا کانٹا جو خود بخود دل میں چبھا وہ اسی تقلید کے خلاف تھا۔ اور میں نہیں جانتا کہ کیوں۔ مگر بار بار یہی سوال سامنے ابھرنے لگا تھا کہ اعتقاد کی بنیاد علم ونظر پر ہونی چاہیے۔ تقلید اور توارث پر کیوں ہو، یہ گویا دیوار کی بنیادی اینٹوں کا ہل جانا تھا۔ کیونکہ موروثی اور روایتی عقائد کی پوری دیوار صرف تقلید ہی کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ جب بنیادیں ہل گئیں تو پھر دیوار کب کھڑی رہ سکتی تھی۔ لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اب کوئی سہارا اس گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا نہیں سکتا:

ازاں کہ پیروی خلق گمرہی آرد
نمی رویم برا ہے کہ کارواں رفتہ است

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں:

شک کی یہی چبھن تھی جو تمام آنے والے یقینوں کے لیے دلیل راہ بنی۔ بلاشبہ اس نے پچھلے سرمایوں کے حصول کی لگن بھی لگا دی تھی۔ اور بالآخر اس کی رہنمائی تھی جس نے یقین اور طمانیت کی منزل مقصود تک پہنچا دیا۔ گویا جس علت نے بیمار کیا تھا وہی بالآخر داروئے شفا بھی ثابت ہوئی۔“

(غبار خاطر طبع دہلی ص ۹۹ تا ۱۰۱)

مولانا کی اس تحریر سے روز روشن کی طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ نے کس صفائی اور خوبصورتی سے اندھی پیروی اور کورانہ تقلید کے خلاف نبرد آزمائی کی ہے۔ اور کس اچھوتے انداز میں اپنے غیر مقلد ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

مولانا آزاد تقلید کے سخت مخالف تھے۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی اپنے ایک مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''سرسید اور مولانا آزاد دونوں تقلید کے سخت خلاف تھے کہ وہ تقلید کے بے لچک قانون کو مسلمانوں میں اصلاح وتجدید کے کام کی راہ کا سب سے بڑا روڑا سمجھتے تھے۔ یہاں یہ بحث دُور اَز کار ہوگی کہ مسلم معاشرے میں تقلید کا قانون کب اور کیوں رائج ہوا۔ بس ہمیں اس تاریخی حقیقت کو دیانتداری سے مان لینا چاہیے کہ ۱۳ویں صدی سے لے کر ۱۸ویں صدی کے وسط تک مسلم معاشرے ذہنی جمود اور تہذیبی انحطاط میں مقید رہے۔ اس عرصہ میں عرب دنیا میں یہ جو ابن تیمیہ ؒ اور محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان میں شاہ ولی اللہ نے اپنے اپنے طور پر اصلاح وتجدید کی کوششیں کیں تو انہیں ہم مستثنیات میں کہہ سکتے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے مسلم معاشروں میں تقلید اور جمود ہی کی حکمرانی رہی۔

۱۹ویں صدی میں سید احمد شہید ؒ اور شاہ اسماعیل شہید ؒ اور پھر سرسید نے اسے ایک تحریک کی شکل دے دی۔ چنانچہ ان کے اصلاحی پروگرام میں مجموعی اعتبار سے تقلیدی مذہب کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ انھوں نے بار بار اور صاف صاف یہ بات کہی کہ ''اگر لوگ تقلید کو نہ چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن وحدیث سے حاصل ہوتی ہے نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔ اسی خواہش نے مجھ کو برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پروانہیں کرتا۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از ضیاء الحسن فاروقی ص ۹۱۔۹۲)

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی فکر وعمل کے ہر گوشہ میں کورانہ تقلید کی تباہ کاریوں کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''یہ تقلید ہی ہے جس نے علم وبصیرت کی راہوں سے تمہیں دور کر دیا ہے۔ حتی کہ اب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ تمہاری معاشرتی اور اجتماعی زندگی مختل ہو رہی ہے۔ کیونکہ اس کی ضرورتوں کے مطابق احکام فقہ نہیں ملتے اور شریعت

کو فقہ کے مذاہب مدونہ ہی میں منحصر سمجھ لیا گیا ہے۔''

(ترجمان القرآن جلد سوم مطبوعہ ساہتیہ اکیڈمی دہلی ص ۴۰۱)

مولانا مسلمانوں کو قرآن وحدیث سے روشنی حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:

''قرآن کا مطالبہ غور وفکر کرنے کا ہے نہ کہ تقلید کرنے کا۔ بس جو شخص قرآن کے مطالب میں غور وفکر نہیں کرتا۔ وہ اس کا مطالبہ پورا نہیں کرتا۔ اور پھر جب قرآن کے لیے کہ وحی الٰہی ہے تدبر ضروری ہوا تو کیوں کر یہ بات جائز ہو سکتی ہے کہ کسی مجتہد اور امام کی تحقیق میں تدبر ضروری نہ ہو۔ اور اہل علم کے لیے ضروری ہو کہ ازروئے تقلید سر اطاعت خم کر دیں۔''

(ترجمان القرآن جلد چہارم مطبوعہ ساہتیہ اکیڈمی دہلی ص ۹۰۹)

بدعات کی تردید

مولانا ابوالکلام آزاد از بسکہ صرف کتاب اللہ اور حدیث نبوی سے تمسک رکھتے تھے۔ بدعات اور محدثات سے انہیں سخت نفرت تھی۔ بدعات کے مرتکب افراد سے میل جول رکھنا ناپسند کرتے تھے۔ اور بدعات ومحدثات سے نہ صرف اپنی ذات کو محفوظ رکھتے تھے بلکہ مسلمانوں میں اس کا ایک شمہ تک بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

دہلی میں اہلحدیث کانفرنس ہوئی اور اس کی صدارت مولانا آزاد نے فرمائی۔ آپ نے اپنی صدارتی تقریر میں ارشاد فرمایا:

''برادران عزیز! آپ اس اسلام کے علمبردار ہیں جس کو حق تعالیٰ نے اپنا محبوب اور پسندیدہ دین بنا کر تمام اہل عالم کی رہنمائی کے لیے بھیجا۔ اور حضرت محمد ﷺ کو جس کا آخری پیغام رساں بنایا۔ پس اسلام کا یہ اولین تقاضا ہے کہ آپ سے توحید کا اقرار کرائے اور آپ کو بدعات ومحدثات سے دور رکھے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ ایک حدیث کی رو سے جو شخص دین میں نئی راہیں نکالتا اور نئے احکام ومسائل تراشتا ہے وہ اسلام سے دور ہٹ کر مردود

بن جاتا ہے۔اور جس کو ''لیس منا'' کا وعید صاف بتاتا ہے کہ اس مردود و بدعتی کا کوئی تعلق نہ اسلام سے قائم رہتا ہے اور نہ اسلام کے آخری پیامبر حضرت محمد ﷺ سے۔ پس بدعت کی نئی راہیں تلاش کرنے والوں کو یہ سوچ لینا چاہیے کہ جب وہ خدائے عظیم، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور اسلام ہی سے بے تعلق ہو گئے تو دنیا اور آخرت میں ان کا مسکن کہاں بنے گا۔ دوزخ اور ہاویہ جس کے شعلوں سے شیطان سرکش نے بھی پناہ مانگی ہے۔اور جس کے تصور سے سخت سنگ و پہاڑ بھی لرزا ٹھتے ہیں۔

(سیرت آزاد ص ۲۹)

یوں بھی دیکھنا چاہیے کہ جس شخص کی ساری عمر قرآن مجید کی تفہیم و تدریس اور تفسیر و توضیح میں گزری ہو، جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ حدیث و سنت کی مدافعت، نصرت و حمایت اور درس و تدریس میں صرف کیا ہو۔ وہ کیونکر برداشت کرسکتا تھا کہ بدعت اور ضلالت اس کے قریب آئے۔ اور اسے کیوں کر گوارا تھا کہ اسلام کو ماننے والے توحید و سنت کا سرمایہ رکھنے کے باوصف بدعات اور محدثات کا شکار ہو جائیں اور اپنے دین، ایمان اور اعتقاد کو تباہ کر ڈالیں۔

جن ایام میں مولانا اخبار ''وکیل'' امرتسر سے وابستہ تھے ان دنوں اُن کی ملاقاتیں شیخ الاسلام مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ سے بھی ہوا کرتی تھیں۔اور توحید و سنت کے یہ دونوں علمبردار احیاء و بقائے کتاب و سنت کے متعلق مشاورت فرمایا کرتے تھے۔

''مولانا عبدالمجید سوہدروی مرحوم لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ مولانا ثناء اللہ مرحوم کی فرمائش پر مولانا آزاد نے ''اہلحدیث امرتسر'' کے لیے ایک مقالہ تحریر فرمایا جو بدعات کی تردید میں شمشیر قاطع کا حکم رکھتا تھا۔

اس مقالہ میں مولانا ابوالکلام آزاد ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''تم یہ سوچو کہ اگر تم نے لاہور سے دہلی جانا ہو لیکن تم کو کراچی جانے والی گاڑی میں بٹھا دیا جائے اور وہاں جا کر تم بھٹکنے لگو، دربدر ٹھوکریں کھاؤ، اور منزل مقصود

ہاتھ نہ آئے تو تمہیں کس قدر دکھ ہوگا اور تم ایک ایسی تکلیف محسوس کرو گے جس سے تمہارا جسم ودل نہ صرف پریشان ، بلکہ زخمی ہو جائے گا۔لیکن میں حیران ہوں کہ یہ جسمانی گمراہی تو تمہیں اذیت کا احساس دلاتی ہے مگر تم صدیوں سے جس بدترین ضلالت میں مبتلا ہو اور اصلی راہ چھوڑ کر نقلی راستہ اختیار کیے بیٹھے ہو۔اس روحانی گمراہی کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔اور تم محدثات کا جادہ ضلالت ترک کر کے اُس منزل کی طرف کیوں گامزن نہیں ہوتے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تیار کی ہے۔اور خدا کے محبوب حضرت محمد ﷺ نے جس کی تمہیں رہبری فرمائی ہے۔دیکھو تم مسلمان ہو، قرآن اور سنت کے حامل مسلمان! کنتم خیر امۃ تمہاری شان میں کہا گیا ہے۔تم اس منزل پر اپنی زندگی بسر کرو اور اس کی حفاظت کے لیے مرمٹو جس کا اسم گرامی خدا کی زبان میں کتاب وحکمت ہے۔

(سیرت آزاد ص۳۲)

مولانا البلاغ میں لکھتے ہیں کہ:

''لوگ مجھ سے حقیقی اسلام کی تعریف پوچھتے ہیں، میں اس کے سوا اور کیا کہوں کہ اللہ کی کتاب اور اس کے نبیؐ کی سنت کا اتباع اور جملہ محدثات وضلالت سے محترز رہنا اصل اسلام ہے۔''

بہرکیف کتاب وسنت کے تارکین کو مولانا آزاد کی نگارشات کا ہر لفظ دعوت غور وفکر دے رہا ہے۔اللہ تعالیٰ شرک وبدعت کی دلدل میں پھنسے ہوئے بھائیوں کو سمجھنے کی صلاحیت دے تاکہ وہ حقیقی منزل کو پالینے کے لیے جادہ پیما ہوسکیں۔

باب نمبر ۸

مولانا ابوالکلام آزاد کی انشاء پردازی

مولانا ابوالکلام آزاد اُن برگزیدہ نفوس میں سے تھے جن کو ندرت ذوق وفکر اور قدرتی بخشائش کی فراوانی نے صف عالم سے الگ دور اور مستثنیٰ قرار دے دیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسی ذہانت وذکاوت اور نرالے اسلوب کا صاحب قلم اور آتش بیان صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر مرحوم لکھتے ہیں کہ:

"عظیم الشان انسانوں کے مقامات ومدارج ہیں جو اِس بناء پر متعین ہوتے ہیں کہ زمانی اور مکانی اعتبار سے ان کے دائرہ اثر ورسوخ کی کیا کیفیت رہی۔ بعض افراد خاص اسباب کی بناء پر شہرت پالیتے ہیں۔ اور ان میں مقام شہرت پر قائم رہنے کے جوہر موجود ہوتے۔ بعض کو قدرت عزت واحترام کی اوج گاہوں پر پہنچا دیتی ہے۔ لیکن وہ اپنے مخصوص ماحول سے باہر کوئی قابل ذکر حیثیت حاصل نہیں کر پاتے۔ نیز ان کی قدروں کو زمانی اعتبار سے پائیداری نصیب نہیں ہوتی۔ بعض اوقات یہ خاکدان تیرہ وتار ایسی شخصیتوں کی جلوہ گری سے بھی زیب وزینت پاتا ہے جو زمان ومکان کی لوح قلب پر اپنی عظمت کے گہرے نقوش ثبت کر جاتی ہیں۔ گردشِ لیل ونہار سے وہ نقوش مدہم نہیں ہوتے بلکہ زیادہ اُبھرتے رہتے ہیں۔ مولانا کا تعلق عظیم المرتبت انسانوں کی اسی آخری صف سے تھا اور ایسے انسان زمانے کے دور گزر جانے کے بعد ہی عرصہ شہود پر جلوہ آراء ہوتے ہیں۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ غلام رسول مہر ص ۱۴۸)

انشاء پردازی میں مرزا غالب، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، مولانا حالی،

اور مولانا شبلی نے جو مقام و مرتبہ حاصل کیا ہے۔ برصغیر (پاک و ہند) کی ادبی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے انشاء پردازی میں جو مقام و مرتبہ حاصل کیا اُس کو بھی سب نے تسلیم کیا۔ اس لیے حسرت موہانی کو یہ کہنا پڑا:

جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

ادبی نقطہ نظر سے مولانا کی ادبی زندگی کے تین ادوار ہیں:

ا۔ پہلا دور اجرائے ''الہلال'' (۱۹۱۲ء) تک ہے۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب مولانا آزاد ''الندوہ'' لکھنو اور ''وکیل'' امرتسر کے ایڈیٹر تھے۔ اس زمانے میں ان کے مختلف موضوعات پر مضامین ہیں جو ملک کے بیشتر علمی، دینی، اور ادبی رسائل میں شائع ہوئے اور ان کے علاوہ ان کی تصنیف ''حیات سرمد'' ہے جو مولانا نے ۲۲ سال کی عمر میں لکھی تھی۔ اس کتاب کے بارے میں خواجہ حسن نظامی نے لکھا تھا کہ:

''باعتبار ظاہر اُردو زبان میں اس سے اعلیٰ اور شاندار الفاظ آج تک کوئی جمع نہیں کرسکا۔ اور باعتبار معانی یہ سرمد کی زندگی و موت کی بحث نہیں معلوم ہوتی بلکہ مقامات درویشی پر ایک مستانہ اور البیلا خطبہ نظر آتا ہے۔''

بقول پروفیسر رفیع انور مولانا آزاد کا یہ ادبی دور صحیح معنوں میں ان کی ادبی زندگی میں زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

۲۔ مولانا کی ادبی زندگی کا دوسرا دور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۲ تک کا ہے۔ اس زمانے میں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے مجلّات، تذکرہ، قول فیصل، مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب آپ کی تصانیف ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب مولانا ابوالکلام اپنی بے پناہ ادب آفرینی اور تبحر علمی کی بدولت ایک ہی وقت میں اردو زبان کے حریف شکن ادیب اور اسلامی ہند کے امام اور سربرآوردہ لیڈر بن گئے۔

۳۔ تیسرا دور ۱۹۲۷ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں دوبارہ الہلال اور مولانا کی تفسیر ترجمان القرآن اور اجلاس کانگرس رام گڑھ منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء کا خطبہ صدارت ہے۔ اگر

سیاسی اختلاف سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ خطبہ اردو ادب کا بہترین سرمایہ ہے۔

(مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ سلمان شاہ جہان پوری ص ۱۲۹)

مولانا کی نثر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت مربوط ہوتی ہے اگر ایک لفظ اپنی جگہ سے ادھر ادھر ہو جائے تو ساری فصاحت خاک میں مل جائے۔ بڑے بڑے انشاء پردازوں کی تحریروں میں حذف واضافہ اور تغیر وتبدل سے بعض اوقات بہت حسن وخوبی پیدا کی جاسکتی ہے۔ لیکن مولانا کی تحریروں میں الفاظ کی نشست وبرخاست ہی کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ ردوبدل سے سوائے قباحت اور بدنمائی کے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔

مولانا ابوالکلام آزاد میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو اپنے مخصوص انداز میں کمال صحت اور روانی کے ساتھ لکھتے تھے۔ اور واقعات کی تفصیل بیان کرنے سے قطعاً نہیں گھبراتے تھے۔

مولانا نے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں بڑے معرکتہ الآراء مضامین لکھے اور یہ مضامین عموماً قلم برداشتہ ہوتے تھے۔ ان مضامین میں کسی قسم کا سقم نہیں ہوتا تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر عابد رضا بیدار لکھتے ہیں کہ:

> ''جذباتی قسم کا اسلوب بیان جس میں خطابت کی شان نظر آتی تھی۔ جملوں اور لفظوں کے تو وہ بادشاہ تھے۔ اور محض ترتیب کا ہیر پھیر ہے۔ اپنی تحریروں میں وہ گرمی پیدا کر دیتے تھے جس کی آنچ مدھم ہوتے ہوئے بھی پڑھنے والے کے شعور کو بے بس کر جاتی تھی۔
>
> پیراگراف، کالم یا مضمون کو کسی قرآنی آیت، کسی فارسی یا اُردو یا کبھی کبھی کسی عربی شعر پر ختم کر کے اب تک کے پیدا کردہ تاثر کو کئی گنا لطیف اور جاندار بنا جاتے۔ ایک نئی پر جوش تحریک کے ساتھ لکھنے کا یہ اسلوب اُردو نثر کو ایک نئی دین تھی جس میں جان تھی۔ شگفتگی تھی کہ الفاظ رنگین سے ٹپکی پڑتی تھی، مردانہ وقار تھا اور فتح کر لینے کا انداز، چھا جانے والی ادا۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از خلیق انجم ص ۳۲۸)

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں کہ:

''مولانا آزاد کے عہد کا ادبی مزاج ان ہی اثرات کے ساتھ پروان چڑھا مگر مولانا آزاد اپنے عہد کے سب سے نمایاں اور فعال ادیب تھے۔اس لیے ان کی تحریروں میں ان کے عہد کی اس کیفیت کا انعکاس سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔مگر اس کے باوجود وہ خود کو سب سے بلند رکھنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از خلیق انجم ص ۳۳۶)

مولانا کی انشاء پردازی کے متعلق پروفیسر رفیع انور نے بہت عمدہ الفاظ میں تبصرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''انشاء پردازی کا ایک اور کمال یہ ہوتا ہے کہ موضوع زیر بحث کا کوئی پہلو تشنہ تکمیل نہ رہ جائے۔صرف الفاظ کی رنگینی اور تراکیب کی ندرت سے ہی کام نہ لیا جائے بلکہ مستحکم اور قاطع وساطع دلائل وبراہین لائے جائیں تاکہ پڑھنے والے کے ذہن میں شک وشبہ کے واسطے کوئی گنجائش نہ رہے۔مولانا ابوالکلام آزاد اس صفت میں بھی قادر الکلام ہیں۔وہ موضوع زیر بحث کو پہلے اس طرح پھیلا دیتے ہیں کہ اس کا ہر پہلو قارئین کے سامنے نمایاں ہو جائے پھر ہر بات کو جی کھول کر بیان کرتے ہیں۔اور تمام مباحث کو ایک ایک کر کے سمیٹتے جاتے ہیں۔شوکت الفاظ اور ندرت تراکیب کے ساتھ ساتھ اس طرح کے قوی اور مضبوط دلائل لاتے ہیں کہ ہر بات قاری کے دل میں اتر جاتی ہے۔اور آخر تک پہنچتے پہنچتے اس کے دماغ میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہیں چھوڑتے۔سنگ لاخ۔۔ سنگ لاخ وادی میں ان۔کے قلم کی رنگینی کو لغزش نہیں ہوتی نہ دلائل کی مضبوطی میں فرق آتا ہے۔''

مولانا کی تحریروں کی ایک واضح خوبی جوش تاثیر ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اور یہ نتیجہ ہے اس خلوص کا جس سے مولانا کی تمام تحریریں مملو ہیں یعنی جو کچھ وہ لکھتے ہیں وہ ان کے دل کی آواز ہوتی ہے:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

(مولانا ابوالکلام آزاد از ابوسلمان شاہ جہان پوری ص ۱۳۴)

مولانا کی تحریروں میں ایک خاص دلکشی اور امتیازی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ اور ان کا اسلوب بیان منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ مولانا کی ایک تحریر ملاحظہ فرمائیں۔ لکھتے ہیں:

''خود صحبت آزمایان شبینہ کا بیان ہے کہ یہ بادہ گساری رات کے دو بجے تک جاری رہتی تھی۔ اللہ ! اللہ! جاڑے کی راتیں اور پچھلے پہر کی پُر اسرار صحبتیں، آپ الزام واعتراض کی فکر میں ہیں۔ اور رات کے دو بجے کے لفظ سے نہیں معلوم کیسے کیسے خیالات میرے دل میں گزر رہے ہیں۔

رات کی تاریکی، پچھلا پہر، رندان شاطر وکہنہ مشق کا ہجوم اور بعض نوجوان ونوآموز مدعیان حریت اور پھر شغل مے پرستی کا یہ عالم، اب کیا کہوں کہ کیا کہنا چاہتا ہوں۔

پھر:

چند دل کے ٹکڑے ہیں، جن کو صفحوں پر بچھانا چاہتا ہوں، کیونکر بچھاؤں، چند آنسو ہیں جن کو کاغذ پر پھیلانا چاہتا ہوں۔ کیونکر پھیلاؤں؟ آہ! لفظوں کو کہاں سے لاؤں جو دلوں میں ناسور پیدا کردیں۔ آہ! اپنے دل کے زخموں کو کیونکر دکھاؤں کہ اوروں کے دل بھی زخمی ہوجائیں۔ موت دونوں کو آتی ہے سپاہی کو میدان جنگ میں اور مجرم کو سولی کے تختے پر، پہلی عزت کی وہ موت ہے جس پر ذلت کی ہزاروں زندگیاں قربان۔ اور دوسری ذلت کی وہ موت

ہے جس کے بعد انسانی روح کے لیے اور کوئی ذلت نہیں۔ اگر یورپ نے ہم سے آخری انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا ہے تو کاش ہمارے سینے میں گولی لگتی، ہمارے گلے میں پھندا نہ ڈالا جاتا۔''

کس قدر سلیس اور معنی خیز تحریر ہے۔ یقین اور ایمان کی پختگی قدم قدم پر نظر آرہی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں نے بڑے بڑوں کے ذہنوں میں انقلاب برپا کردیا۔ انھوں نے ایک جامد مسلم معاشرے میں رہتے ہوئے خیالات کو بدل دیا۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے فرمایا:

''ہم سب اصلی کام بھولے ہوئے تھے ابوالکلام نے یاد دلا دیا۔''

مولانا محمد علی جوہر نے فرمایا:

''میں نے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی۔''

سجاد انصاری نے اپنی کتاب ''محشر خیال'' میں لکھا ہے:

''میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا تھا تو ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی، یا اقبال کی نظم۔ میرے نزدیک اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد حقیقی معنوں میں فوق البشر ہیں۔''

مولانا آزاد کی انشاء پردازی کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ:

''ابوالکلام کی ذات جامع صفات، جامع جہات، جامع حیثیات ہے ان سب میں بالا ترین حیثیت ان کے ادیب وانشاء پرداز ہونے کی ہے۔ ان کی سیاست میں قیل وقال کی گنجائش ہے، ان کے علوم دین میں گفتگو چل سکتی ہے اور چل چکی ہے لیکن کم ہی ایسا ہوا ان کی ادبی عظمت تسلیم نہ کی گئی ہو۔''

(اُردو کا ادیب اعظم ص ۱۱)

نثر نگاری وانشاء پردازی میں مولانا ابوالکلام آزاد کا کوئی اور ہم پلہ نہیں ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے بالکل بجا فرمایا تھا:

جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا آزاد کی تحریروں نے خود ان کے دور پر اور اس کے بعد کے لوگوں پر بھی گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اور آئندہ بھی ان کی تحریریں اپنا جادو جگاتی رہیں گی۔ یہ نگارشات ہماری ادبی، علمی اور فکری زندگی کا پرشکوہ اور گراں قدر تاریخی ورثہ ہیں۔ پھر مولانا آزاد کی نثر سچ پوچھئے تو ان کے ساتھ ختم ہوگئی۔ کیونکہ ان پر ان کی شخصیت کی گہری چھاپ تھی۔ جس کو کوئی اور پھر سے وجود میں نہیں لاسکتا۔ اس قسم کی نثر کو پروان چڑھانے والی فضا بھی مولانا آزاد کے عہد کے ساتھ ختم ہوگئی۔ آج کے دور میں اسے پھر سے ڈھونڈ لائے یا درد کرنے کی خواہش ادبی تاریخ کے عوامل سے بے خبری اور اس کی تقلید کی کوشش نقالی سے زیادہ حیثیت کی نہیں ہوگی۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از خلیق انجم ص ۳۳۶، ۳۳۷)

باب نمبر ۹

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی شاعری

مولانا ابوالکلام آزاد کو قدرت نے فکر ونظر کی بے شمار دولتوں ،علم وفضل کی بے مثال نعمتوں اور بہت سے اخلاقی کمالات سے نوازا تھا۔مذہب ،علوم وفنون ،حکمت وفلسفہ،ادب وانشاء،شاعری ،غرض کوئی وادی ایسی نہیں جس کی نئی راہیں مبداء فیاض نے ان کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں ،اور ہر آن ولحظہ نئی نئی بخششوں سے ان کا دامن کسب فیض مالا مال نہ ہوا ہو۔

مولانا ابوالکلام آزادا کا شمار ایسی عظیم ہستیوں میں ہوتا ہے جو ہر حیثیت سے عظیم اور بلند وبالا ہوتی ہیں ۔اور اپنی زندگی کے ہر پہلو میں انفرادی حیثیت کی حامل ہوتی ہیں ۔مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ:

''ابوالکلام کی ذات جامع صفات، جامع جہات اور جامع حیثیات ہے۔''

اس بیان میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں اور نہ عقیدت مندی اور مدح سرائی ۔ بلکہ کمال حسن کا عقیدت مندانہ اعتراف ہے ۔مولانا کا تعلق ایک مذہبی خاندان سے تھا۔ایسے خاندانوں میں تعلیم بالعموم سراسر ہوتی ہے ۔جس میں عربی ،فارسی اور اردو کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے ۔مولانا بہت زیادہ ذہین تھے اور صحیح معنوں میں عبقری تھے ۔اللہ تعالٰی نے حافظہ کی غیر معمولی نعمت سے نوازا تھا۔ان کی تعلیم کا انتظام خصوصی طور پر کیا گیا تھا۔چنانچہ دس بارہ سال کی عمر میں انھوں نے عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل کر لیا تھا۔اور اسی دور میں ان کو شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔جیسا کہ خود ایک خط میں بنام مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں ۔

(یہ خط نقش آزاد میں صفحہ ۱۰۶ تا ۱۱۵ درج ہے ،خط نمبر ۵۲ ہے مگر یہاں خط کا صرف وہی حصہ درج کیا جاتا ہے جس کا تعلق شاعری سے ہے اور یہ خط ۳ دسمبر ۱۹۳۶ء کو کلکتہ سے لکھا گیا۔)

مولانا لکھتے ہیں کہ:

''اس طرح کے تذکروں میں خود اپنا حال بیان کرنے لگنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔لیکن محض دفع غرابت کے لیے لکھتا ہوں کہ خود میں نے اسی عمر (۱۲۔۱۳) میں شاعری شروع کردی تھی۔میری نثر نویسی کا آغاز بھی اِسی عمر میں ہوا ہے۔ غالباً ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء کی بات ہے بمبئی سے حکیم عبدالحمید فرخ نے جو ''پنچ بہادر'' نکالا کرتے تھے۔ایک گلدستہ ''ارمغان فرخ'' کے نام سے نکالا۔اور کلکتہ میں بعض شعراء اس کی ماہوار طرحوں پر مشاعرہ کرنے لگے ایک مرتبہ اس کی طرح یہ تھی:

پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

میں نے گیارہ شعر کی غزل لکھی۔تین شعر مزخرفات کے اب تک ذہن نے ضائع نہیں کیے:

نشتر بہ دل ہے کسی سخت جان کی
نکلی صدا تو فصد کھلے گی آسمان کی
گنبد ہے گرد بار تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی
آزاد بے خودی کے نشیب وفراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

یہ اشعار اب کس قدر لغو معلوم ہوتے ہیں لیکن اس وقت انھی لغویات نے لوگوں کو متحیر کردیا تھا۔آج بھی کہ چھتیس برس گزر چکے ہیں وہ اپنی خوشی پوری طرح محسوس کررہا ہوں جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی۔جب ''ارمغان فرخ'' میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام ایک رسالے میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔

اس زمانے میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خان شوخی رام پوری

کلکتہ میں مقیم تھے۔ انہیں کسی طرح یقین نہیں تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں میری ہی کہی ہوئی ہیں۔ ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دکان پر لے گیے۔ جس کی دکان مسجد سے متصل تھی۔ کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ میں بیمار ہوں وہ غزل کے لیے متقاضی ہے۔ چند شعر اسی وقت کہہ دو میں سمجھ گیا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے زمین بتلائی۔ یاد نہ ہو، شاد نہ ہو، میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دیے، کہنے لگے اشعار کی تعداد طاق ہوتی ہے میں نے ایک شعر اور کہہ دیا:

وعدہ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی، ان کو کبھی یاد نہ ہو

کہنے لگے ''صورت سے دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہیں لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی'' اس وقت سوچتا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کل کی بات ہے۔

پھر اسی زمانے میں نثر کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ مخزن نیا نیا نکلا تھا۔ اس میں چند تحریریں بھیجیں۔ لکھنو سے نوبت رائے نظر ''خدنگ نظر'' نکالتے تھے۔ اس میں اپنی غزلیں بھیجا کرتا تھا۔ انہیں آمادہ کیا کہ نثر کا ایک حصہ بھی شامل کردیں۔ اور اس کی ترتیب اپنے ذمہ لے لی۔ اسی زمانے میں مولوی محمد حسن مرحوم فتح پوری نے کلکتہ سے ''احسن الاخبار'' اور ''تحفہ احمدیہ'' نکالا۔ اس میں بالالتزام مضامین نویسی ہونے لگی۔ پھر خیال ہوا یہ کافی نہیں ہے۔ ایک رسالہ خود نکالنا چاہیے۔ چنانچہ ''لسان الصدق'' جاری کیا۔ یہ تمام معاملات ۱۹۰۳ء کے ہیں۔ اس وقت میری عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہ تھی۔

تعلیم سے پندرہ برس کی عمر میں فارغ ہوگیا تھا۔ اور چونکہ قدیم طریقہ یہ تھا کہ فراغت کے بعد کچھ عرصے تک درس دینا ضروری سمجھا جاتا تھا تاکہ جو کتابیں

پڑھی جا چکی ہیں وہ پڑھانے کے بعد اور زیادہ منجھ جائیں۔اس لیے والد مرحوم نے چند طلباء کی کفالت کر کے تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ان میں قندھار کے ایک خان صاحب تھے جن کی داڑھی میرے قد سے بھی دراز تھی۔

اسی زمانے میں تقریر کی طرف بھی طبیعت مائل ہوئی۔سب سے پہلی تقریر میں نے ۱۹۰۴ء میں کی۔اس وقت عمر پندرہ تک پہنچ چکی تھی۔غالباً دوسرے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں شریک ہوا تھا۔اور تقریر کی تھی،اس وقت سولہ برس کی عمر تھی۔

بہر حال مقصود یہ ہے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنا کوئی بہت زیادہ غیر معمولی بات نہیں ہے۔اگر اس عمر میں میں تک بندی کرنے لگا تو غالب جیسی شخصیت کے لیے جسے قدرت نے شاعری کے لیے پیدا کیا تھا یہ بات کیوں مستبعد تصور کی جائے۔''

(نقش آزاد ص ۱۰۷ تا ۱۰۹)

مولانا ابوالکلام آزاد نے جس زمانہ میں شاعری کا آغاز کیا اس وقت ہندوستان میں داغ اور ابر کا طوطی بول رہا تھا۔انہی کے انداز میں شعر کہنا کمال فن سمجھا جاتا تھا۔اپنی شاعری کے بارے میں مولانا آزاد اپنی کتاب ''آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی'' میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

''شاعری کا شوق مولوی عبدالواحد خان سہسرامی کی وجہ سے ہوا۔ان کی بہن میرے یہاں ملازم تھیں۔اسی تعلق سے آنا جانا ہوا،یہ شاعر بھی تھے،اس وقت میری عمر دس گیارہ سال برس سے زیادہ نہ تھی۔اس زمانہ میں کلکتہ میں ایک پرائیویٹ مشاعرہ ہوا تھا۔اس کا انتظام پٹنہ کے بادشاہ میاں نامی ایک رئیس نے کیا تھا۔تین طرحیں دی گئی تھیں اور تین دن تک مشاعرے ہوتے رہے۔ باہر سے جلال بھی آئے تھے۔عبدالواحد خان نے غزلیں سنائیں مجھ پر اس کا بہت بڑا اثر ہوا۔خود ہی شعر کہنے کا شوق ہوا۔اور روز بروز اس کا شوق اور

کاوش بڑھتی چلی گئی۔میری نثر نویسی کا آغاز بھی اسی عمر میں ہوا۔"

(آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی)

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی شاعری کے ذوق کی تکمیل کے لیے دو رسائل "نیرنگ عالم" اور "المصباح" جاری کیے تھے۔لیکن اس کے ساتھ آپ ملک کے دوسرے رسالوں میں بھی اپنا کلام بھیجا کرتے تھے۔ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں کہ مولانا آزاد جن رسائل میں اپنا کلام بھیجتے تھے وہ یہ ہیں۔

"صحن چمن ضلع بجنور، الپنچ پٹنہ، سفینہ نجات بمبئی اور ماہنامہ مخزن لاہور۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے ابتدائے شعر گوئی میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی تھی۔خود ہی نہایت کاوش سے شعر کہتے۔اور جب تک طبیعت مطمئن نہ ہوجاتی کانٹ چھانٹ کرتے رہتے تھے۔مولوی عبدالواحد خان سہسرامی سے انہیں بہت مدد ملتی تھی۔اور مولانا نے ان سے استفادہ کا اعتراف کیا ہے۔ان کے علاوہ مولانا نے امیر مینائی اور شوق نیموی سے بھی اصلاح لی ہے۔اور اپنے زمانہ قیام بمبئی میں امداد حسین ظہور میرٹھی سے بھی استفادہ کیا تھا۔

(مولانا ابوالکلام آزاد ابوسلمان شاہ جہان پوری ص ۲۰۸)

مولانا آزاد نے جب نثر نگاری شروع کی تو شعر گوئی سے ان کی رغبت کم ہوتی گئی۔ اور تین چار برس کے بعد شعر گوئی کا سلسلہ بند ہوگیا۔کیونکہ ان کی مصروفیت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا تخلص آزاد مولوی عبدالواحد خان نے تجویز کیا تھا۔

انتخاب کلام

اردو کلام

غزل

کیوں اسیر گیسوئے خم دار قاتل ہوگیا
ہائے کیا بیٹھے بٹھائے تجھ کو اے دل ہوگیا

کوئی نالاں ، کوئی گریاں کوئی بسمل ہوگیا
اس کے اٹھتے ہی دگر گوں رنگ محفل ہوگیا
انتظار اس گل کا اس درجہ کیا گلزار میں
نور آخر دیدۂ نرگس کا زائل ہوگیا
اس نے تلواریں لگائیں کچھ اس انداز سے
دل کا ہر ارمان خدائے دست قاتل ہوگیا
قیس مجنوں کا تصور بڑھ گیا جب نجد میں
ہر بگولہ دشت کا لیلیٰ کا محمل ہوگیا
یہ بھی قیدی ہوگیا آخر کمند زلف کا
لے اسیروں میں تیرے آزاد شامل ہوگیا

(مخزن اپریل ۱۹۰۳ء)

غزل

ان شوخ حسینوں کی ادا اور ہی کچھ ہے
ایسوں کی اداؤں میں مزا اور ہی کچھ ہے
یہ دل ہے مگر دل میں بسا اور ہی کچھ ہے
دل آئینہ ہے جلوہ نما اور ہی کچھ ہے
ہم آپ کی محفل میں نہ آنے کو نہ آتے
کچھ اور ہی سمجھتے تھے ہوا اور ہی کچھ ہے
بے خود بھی ہیں ، ہشیار بھی ہیں دیکھنے والے
ان مست نگاہوں کی ادا اور ہی کچھ ہے
آزاد ہوں اور گیسوئے پیچاں میں گرفتار
کہہ دو مجھے کیا تم نے سنا اور ہی کچھ ہے

(صباء آزاد نمبر)

رباعیات

سنتے ہیں رقیب سے ملاقاتیں ہیں
صحبت دن رات ہے مداراتیں ہیں
ہم کو نہیں اعتبار جو چاہے کہو
عاشق سے وہ منہ لگائے یہ باتیں ہیں

....

آفت ہے قصہ جوانی میرا
ظاہر ہے حال نوحہ خوانی میرا
اک جان کس طرح بچاؤں آزاد
دل کا دشمن ہے یارجانی میرا

....

تھا جوش خروش اتفاقی ساقی
اب زندہ دل کہاں باقی ساقی
میخانے نے روپ بدلا ایسا
مے کش، مے کش رہا نہ ساقی ساقی

(رسالہ مہر نیم روز مئی اگست ۱۹۵۸ء)

متفرق اشعار

اے دل ہزار نفع ہے سودائے عشق میں
جی کا زیاں تو ہے، یہ کچھ ایسا زیاں نہیں

....

چھوڑا نہ غم نے کچھ بھی میرے جسم زار میں
اک جان ہے سو وہ بھی تیرے اختیار میں

....

ٹھہری نہ خاک قیس بھی دم بھر مزار میں
پیدا ہوئے ہیں لاکھ بگولے غبار میں

....

دل دے کے فرض عشق تو ہم کر چکے ادا
جو کچھ ہوا، اب مشیت پروردگار میں

....

اس سے دوچند حسن پہ ان کو غرور ہے
جتنا نیاز وعجز ہے مجھ خاکسار میں
یوسف نہ تھا عزیز بہ چشم برادراں
اچھوں کی ہوگی قدر نہ اس روزگار میں
ہم کو کچھ بھی وصف کاکل بیاں نہ کرسکے
مضمون الجھ رہے ہیں قلم خشک بار میں

....

اے موت تو ہی آ کہ نہ آئیں گے وہ کبھی
آنکھیں ہیں ایک عمر سے وا انتظار میں
موقوف آرزو پہ ہیں سامان ہجر کے
پہلا سا طول اب نہیں شب ہائے تار میں
سودائے زلف ورخ میں غضب کا ہے انتشار
اب آگئے ہیں گردش لیل ونہار میں

....

وہ پوچھتے ہیں نزع میں کیسا مزاج ہے
اب کیا کہوں زبان نہیں اختیار میں

....

مٹ کر ہوں خاک سرمے کی مانند بھی اگر
پھر بھی کبھی سمائیں نہ ہم چشم یار میں

....

سب آرزوئیں دل کی نکالو شب وصال
دو چار بوسے بھلا آج کس شمار میں

....

کہنے لگے کہ آپ کی عنایت تو ٹھیک ہے
بے تاب مجھ کو دیکھ کے بوس وکنار میں
بجلی سی کوند جاتی ہے گھونگھٹ کی آڑ میں
کیا شوخیاں ہیں اس نگہِ شرمسار میں

....

دعوائے عاشقی پہ یہ کہنے لگا وہ بت
اللہ کی شان آپ بھی ہیں اس شمار میں
آزاد کو ہو اپنی تباہی کا کیا ملال
کس کو قیام ہستی ناپائیدار میں

....

فراق یار میں دل یا جگر کو دیکھتے ہیں
جدھر لگی ہے ہمیں چوٹ ادھر کو دیکھتے ہیں

....

تسلیاں شب فرقت میں دیں گے آخر کار
ابھی ترقی درد جگر کو دیکھتے ہیں

....

ہمارے درد کو جاتا ہے لا دوا کرکے
نگاہِ یاس سے ہم چارہ گر کو دیکھتے ہیں

....

پڑے لچک نہ کہیں راہ میں بوقت خرام
سنبھل سنبھل کے وہ اپنی کمر کو دیکھتے ہیں
غضب سے دیکھ کے غیروں کو وہ کنکھیوں سے
وہ پوچھتے ہیں کہو ہم کدھر کو دیکھتے ہیں
وہ خود ہی طالب دیدار ہوگئے آزاد
ہم آہ کے حسن اثر کو دیکھتے ہیں

....

کیوں طعنہ خویش و اقربا سہتے ہیں
ہے بات کوئی آپ چپ رہتے ہیں
ہے کسی کے خیال میں جناب آزاد
سنتے ہیں کسی کی اور نہ کچھ کہتے ہیں

....

کیوں ہے یہ خراب اور کیوں ہے یہ برا
چاہ اپنی ہے اور شوق اپنا اپنا
ہے وعظ کی لت اسے ہمیں شراب مدام
اس کو اس کا ہے شوق مجھ کو اس کا

نوٹ:...... مذکورہ بالا منتخب اشعار، غزلیں اور رباعیات مضمون ''ابوالکلام بحیثیت شاعر'' مندرجہ کتاب مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے، مصنفہ خلیق انجم اور مضمون مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کی شاعری از ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری سے نقل کیے گئے ہیں۔ (عراقی)

مولانا نے جو غزل ''ارمغان فرخ'' بمبئی کو بھیجی تھی جس کا طرح مصرع تھا:

پوچھی زمین کی ، تو کہی آسمان کی

جس کے تین شعر آپ مولانا کے خط میں پڑھ آئے ہیں۔اس کا ایک شعر اور ہے:

ہوں نرم دل کہ دوست کی مانند دریا
دشمن نے بھی جو اپنی مصیبت بیان کی

اس غزل کے بقیہ تین اشعار یہ ہیں:

یوں تو جہاں میں قاتل و جلاد ہیں بہت
تم فرد ظلم میں ہو قسم آسمان کی
بر لایئے کبھی نہ کبھی تو مرادِ دل
لے لیجیے دعائیں کسی بے زبان کی
خجلت کے مارے لعل ہوگیا سفید
ان کے لبوں پر دیکھ لی سرخی جو پان کی

(ارمغان فرخ جنوری ۱۸۹۹ء بحوالہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مصنفہ مولانا امداد صابری ص ۴۴)

فروری ۱۸۹۹ء کے ارمغان فرخ میں مولانا ابوالکلام کی ایک غزل سے درج ذیل چار منتخب شعر شائع ہوئے:

کشتہ ہے ان کی ترچھی نظر کی تمام خلق
حیرت ہے ایک تیر کا عالم شکار ہو
پیش خدا کھڑے ہیں وہ محشر میں بے نقاب
کیا ہی مزا ہو اب جو ہماری پکار ہو
کہتا ہے عاشقوں کو ستارے دکھا کے چراغ
سینہ نہ یوں کسی کا کبھی داغدار ہو

آزاد کی ترچھی نظر سے نہ خوف کر
یہ تیر وہ نہیں جو کلیجے کے پار ہو

(امام الہند ابوالکلام آزاد ص ۳۴)

فارسی کلام

رباعیات

نقاش چو نفس ساز انداز تو بود
دل دادہ صورت گری ناز تو بود
یک شب ہمہ صرف زلف مشکیں تو بود
یک روز تمام چہرہ پرداز تو بود

....

ساقی ساقی !بدہ بدہ جام بجام
عمر تو دراز بادا وقت تو بکام
ایں تشنہ لبی من وایں شور عطش
پُرکن ، پُرکن کہ کار من تمام است تمام

....

گر عیش طلب کنی زمستاں آموز
درد غم خواہی زتنگ دستاں آموز
مُردن خوش حق تست لیکن زاہد
خوش زیستن از بادہ پرستاں آموز

....

ساقی تو نگاہ کن بریں ابرو بہار
یک ساغرے بدہ وبیں لطف خمار

وقتیت کہ ماہ روئے بانازد ادا
یک زیر نظر باشد ویک زیر کنار

....

درد ہر زلف او نہ شد طبعم سیر
بر بالا روم کہ خود نہ بالادست نہ زیر
اے عمر برو بروکہ یاد تو زیاد
اے مرگ بیا بیاکہ یاد تو بخیر

(مولانا ابوالکلام آزاد از خلیق انجم ص ۴۹۷)

غزل

کنی زگریہ اگر منع چشم گریاں را
رواں بود کہ ندیدی شبان ہجراں را
توانم کہ کنم ضبط آہ وفغاں را
مگر علاج بگو چیست چشم گریاں را
کہ مست بے خبر انداخت ہوشیاراں را
دریں مشاعرہ مرغم نمی تواں فہمید
چہ طور گویم الٰہی بیاں پنہاں را
برو برو طبیبا چرا بمن آئی
بغیر مرگ دوا نیست درد ہجراں را

....

قطعہ تاریخ طبع تذکرہ صادقہ از مولوی عبدالرحیم صادق پوری:

چاپ کردند ایں کتاب نفیس
فکر شان را صد آفریں بادا

از لب ہاتف ایں ندا آید
سرمۂ چشم ، ناظریں بادا

....

۱۳۱۵ھ ۱۳۲۰ھ

مولانا ابوالکلام آزاد کے کلام میں نعت، غزل، قصیدہ، مثنوی، تاریخ وغیرہ اصناف سخن اردو اور فارسی دونوں میں ہے۔

باب نمبر ۱۰

مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح نگاری

مولانا ابوالکلام آزاد ایک نادر روز گار شخصیت کے مالک تھے ۔اور ایسے گونا گوں اوصاف ومحاسن کسی ایک وجود میں بہت کم ہی جمع ہوتے ہیں ۔انھوں نے زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا ہے جن کا حصر مشکل ہے ۔اور انہی میں سے کسی ایک دائرے میں بلندی حاصل کر لینا بڑے سے بڑے انسان کے لیے بھی دائمی فخر کا سامان ہوسکتا ہے۔علم وفضل ،حقائق دین ،تفسیر قرآن ،شعروادب ،تصنیف وتالیف ،تقریر وخطابت ، اخبار نویسی ،صحیفہ نگاری ،سیاست وملک داری میں ایسا مرتبہ ومقام آپ کو حاصل ہوا کہ جس کی مثال برصغیر (پاک وہند) کی تاریخ میں کم ہی ملے گی ۔

تاریخ نویسی اور سوانح نگاری میں مولانا آزاد کا مقام بہت بلند تھا۔سوانح نگاری کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ہر واقعہ کے لیے صاحب سوانح کے بیانات کو مقدم مانا جائے ۔اگر اس سے کسی جگہ بیان میں غلطی یا خطا سرزد ہوئی ہو تو محکم دلائل وشواہد کی بنیاد پر اختلاف کیا جائے ۔

مولانا سوانح نگاری میں صحیح اور مستند واقعات کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں ۔اور ان کی تحریروں میں کسی قسم کا سقم نہیں پایا جاتا۔مولانا نے سوانح نگاری پر جو کتابیں تالیف کیں ان میں سے زیادہ کتابیں طبع نہیں ہوسکیں ۔مولانا محمد مستقیم سلفی بناری نے اپنی کتاب ''جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات'' میں مولانا کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی فہرست درج کی ہے ۔ملاحظہ فرمائیں :

مطبوعہ

۱۔ تذکرہ

۲۔ آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی بروایت ملیح آبادی

۳۔ انسانیت موت کے دروازے پر

۴۔ شہید اعظم

۵۔ البیرونی اور جغرافیہ عالم

غیر مطبوعہ

۱۔ حیات سرمد

۲۔ سیرت شاہ ولی اللہ (الہلال ۲۲ جون ۱۹۲۷ء ص ۴)

۳۔ سیرت مجدد الف ثانی (تذکرہ ص ۲۴۱)

۴۔ سیرت امام احمد بن حنبل (تذکرہ ص ۱۸۲، ۱۸۷، ۱۸۸)

۵۔ سیرت امام ابن تیمیہؒ (تذکرہ ص ۱۸۲، ۱۸۷، ۱۸۸)

۶۔ حضرت یوسف علیہ السلام

۷۔ کلیم خاتمانی شروانی

۸۔ حافظ شیرازی

۹۔ عمر خیام

۱۰۔ ترجمہ تذکرہ آب حیات (آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی ص ۲۲۶)

۱۱۔ تاریخی شخصیتیں

۱۲۔ یہاں مولانا کی ۳ مطبوعہ کتابوں کا تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے۔

تذکرہ

بنیادی طور پر اس کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے اسلاف کا تذکرہ کیا ہے۔ جب وہ ۱۹۱۶ء میں رانچی (بہار) میں نظر بند تھے اس وقت مولانا کی عمر ۲۹ سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کتاب کے آغاز میں مولانا نے اپنے آبائی اور ننھالی خاندان کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ اور اپنے جدامجد شیخ جلال الدین کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس کے بعد شیر شاہی اور سلیم شاہی عہد کے اولیاء اللہ کے آلام ومصائب اور امام احمد بن حنبل، شیخ الاسلام

ابن تیمیہؒ، اور امامِ ربانی مجدد الف ثانی رحمھم اللہ اجمعین کے مصائب کا ذکر کیا ہے۔

''تذکرہ''، ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے مہتمم مرزا فضل الدین کے اصرار پر لکھی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ستمبر ۱۹۱۹ء میں البلاغ پریس کلکتہ سے شائع ہوا۔ بعد میں اس کے دو ایڈیشن نکلے۔

تذکرہ ہماری زبان وادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح سنگ میل نشان منزل کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ یہ حیرت انگیز کتاب بھی ہمیں بتاتی ہے کہ ہماری زبان وادب نے ترقی کی کتنی راہیں طے کرلیں۔ اور منزل تک پہنچنے میں کس قدر مراحل سے گزرنا باقی ہے۔

تذکرہ اردو ادب کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ اس میں افلاک اسلام کے تابندہ ستاروں کی ضیاباریاں ہیں۔ اس میں علماء حق وباطل کی کشمکش کی تصریحات ہیں۔ اس میں سرمایہ داری اور حق پرستی کی روایتی جنگ کی داستان ہے۔ اس میں آیات قرآنی اور فرمودات رسول ﷺ کی توضیحات ہیں۔ اس میں علمبرداران اسلام اور عاشقان رسول اکرم ﷺ کی بے مثل فداکاریوں کا بیان ہے۔ اس میں علوم وعرفان کی باران رحمت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں مضطرب انسانوں کی طمانیت قلب کا علاج بتایا گیا ہے۔

اس میں فیضان نبوت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس میں حکمت وفلسفہ، عقل وبصیرت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

''تذکرہ'' کے بارے میں برصغیر کے نادر علماء ادباء اور اربابِ علم وفضل نے تعریفی کلمات کہے ہیں۔ پروفیسر ضیاء احمد بدیوانی لکھتے ہیں کہ:

> ''تذکرہ کے اسلوب کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو شاید اس کو خطیبانہ کہنا مناسب ہو۔ کیونکہ اگرچہ وہ عالمانہ بھی ہے۔ ادیبانہ بھی اور شاعرانہ بھی۔ تاہم اس میں خطابت کی شان زیادہ نمایاں ہے۔ مولانا اپنے عہد کے نامور خطیب اور مقرر تھے۔ اور یہ رنگ ان کی تحریر میں جلوہ گر ہے۔ تذکرہ اردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ تذکرہ میں ایسی خصوصیات

ہیں کہ جو پورے طور پر مصنف کی بقائے دوام کی ضامن ہیں۔اس لیے ہماری زبان کے نامور شاعر وادیب نے عین حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔ جب کہا تھا کہ:

جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

(مولانا ابوالکلام آزاد۔ازافضل حق قرشی،ص ۴۴۰۔۴۴۱)

اردو ادب کے نامور نقاد اور نکتہ سنج ادیب حضرت مہدی الافادی،مولانا سید سلمان ندوی کو ایک خط میں ''تذکرہ'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ابوالکلام کے ذکر کے ساتھ ان کے تذکرہ کے متعلق ایک حرف نہیں ایک ادیب کی یہ بیگانہ وشی کہاں تک لائق درگزر ہو سکتی ہے۔مجھ کو تمام عمر اگر کسی پر رشک آیا ہے تو رانچی والے پر(مولانا اس وقت رانچی میں نظر بند تھے)۔''

''تذکرہ'' کے بارے میں شورش کاشمیری اپنی کتاب ''ابوالکلام آزاد'' میں لکھتے ہیں کہ:

''تذکرہ حقیقتاً کئی مباحث کا مخزن ہے۔اس میں مختلف سلسلوں اور ان نسلوں کے ماخذ ومصادر کی مختلف کڑیوں کی حکایت ہے۔جس میں بے شمار علمی،ادبی، عمرانی،سیاسی،تاریخی،دینی،فقہی اور اعتقادی مباحث آگئے ہیں۔تذکرہ میں کئی مقامات کی عبارتیں اس حد تک خطیبانہ ہیں گویا مولانا منبر پر ہجوم کے سامنے خطبہ دے رہے ہیں۔تذکرہ میں دعوت وترغیب کے سلسلہ میں علمائے سلف کی سعی وکوشش کا بھی ذکر ہے۔

تذکرہ کا لب لباب یہ ہے کہ اس میں عمل صالح اور اس کی متحرک ومظہر شخصیتوں کے سوانح ہیں۔بعض درباری فتنوں کی روئیداد ہے۔اس زمانہ میں درباری علماء کا مزاج تھا کہ وہ اوامر کی تلقین اور نواہی کی تکذیب کرنے والوں کے دشمن ہو جاتے تھے۔تذکرہ میں انہیں علماء کی فتنہ کاریوں کو بیان کیا گیا ہے۔

تذکرہ فی الجملہ مولانا کے حافظہ کا شہ پارہ ہے۔غرض جس ڈھب کی زندگی ان کا شعار اور ولولہ تھا تذکرہ اس کی جامع تصویر ہے۔ان کے سوانح وافکار کا مرقع ہے اور ان کی شخصیت کے عوامل وعناصر کی بالواسطہ دستاویز ہے۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد ص ۳۵۶، ۳۵۷)

تذکرہ کے بارے میں مالک رام لکھتے ہیں کہ:

''تذکرہ ''الہلال'' دور کی تصنیف ہے۔انداز اس کا بھی بالواسطہ طور پر دعوت ہی کا ہے۔اس کی زبان بھی عربی فارسی کے الفاظ سے بوجھل ہے۔اس میں بھی وہی بات میں بات کرنے کا رجحان، جولانی طبع اور دعوت وتبلیغ کا انداز ملتا ہے۔جو الہلال اور البلاغ کا مابہ الامتیاز بلکہ طرہ امتیاز تھا۔مگر یہاں وہ مے دو آتشہ ہوگئی ہے۔پوری کتاب کا یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان اکابر کا جانشین خیال کرتے ہیں جن کی عزیمت ودعوت کو وہ دنیا کے سامنے عموماً اور مسلمانوں کے سامنے خصوصاً بطور نمونہ پیش کر رہے ہیں۔تذکرہ کا غائر مطالعہ کرنے سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کے دل میں رہ رہ کر کوئی خیال کروٹیں لے رہا ہے۔''

(کچھ ابوالکلام کے بارے میں ص ۱۶۶)

ضیاء الحسن فاروقی تذکرہ کے موضوع اور مقصد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''تذکرہ تاریخ اسلام کی ان بعض نامور شخصیتوں کے موضوعاتی سوانحی واقعات کا مجموعہ ہی نہیں ہے جنہیں مولانا آزاد اپنا ہیرو تصور کرتے تھے۔اس میں تسلسل سے شروع سے آخر تک عمل وعزیمت کا ایک نیا پیغام بھی ہے۔اگرچہ وہ انتہائے عجز وانکساری میں جو یقیناً ان کی شخصیت کے پیش نظر ایک شاذ اور غیر معمولی بات معلوم ہوتی ہے اسے محض ایسے ''اوراق پریشان'' سے تعبیر کرتے ہیں جو اپنی پریشانی طبع وبرہمی خاطر کی یادگار ہیں۔

ہندوستان کے شیخ جمال الدین۔سید محمد جون پوری (۱۴۴۳۔۱۵۰۴) ان کے

عقیدت مند متبعین۔ شیخ احمد سرہندی (۱۶۲۴۔۱۵۶۴) اور شاہ ولی اللہ دہلوی۔ (۱۷۶۲۔۱۷۰۳) اور ہندوستان سے باہر امام احمد بن حنبل (۷۵۵۔۷۵۰) اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (۱۳۲۸۔۱۲۶۸) کی داستان حیات، باطل کے خلاف اثبات حق کے لیے مسلسل جدوجہد کے کارناموں سے معمور ہے۔ تذکرہ کا موضوع یہی کارنامے ہیں جو اصلاح وتجدید اور فکر وعمل کی پرجوش دعوت وعزیمت سے عبارت ہے۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از ضیاء الحسن فاروقی ص ۱۲۰)

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے فتنہ خلق قرآن کے سلسلہ میں جو استقامت وعزیمت دکھائی۔ اس کے متعلق مولانا نے اس کتاب میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ میرے پیش نظر تذکرہ مطبوعہ البدر اکیڈمی سرکلر روڈ لاہور کا نسخہ ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۱۷ تا ۱۳۸ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے حالات بیان کیے ہیں۔

مولانا لکھتے ہیں کہ:

''تیسری صدی کے اوائل میں جب فتنہ اعتزال وتعمق فی الدین اور بدعت مضلہ تکلم بالفلسفہ وانحراف از اعتصام بالسنہ نے سر اٹھایا۔ اور صرف ایک ہی نہیں بلکہ لگاتار تین عظیم الشان فرمانرواؤں یعنی مامون، معتصم اور واثق باللہ کی شمشیر استبداد اور قہر حکومت نے اس فتنہ کا ساتھ دیا۔ حتی کہ بقول علی بن المدینی کے فتنہ ارتداد ومنع زکوٰۃ (بعہد حضرت ابوبکرؓ) کے بعد یہ دوسرا فتنہ عظیم تھا جو اسلام کو پیش آیا۔ تو کیا اس وقت علماء امت اور ائمہ شریعت سے عالم اسلامی خالی ہو گیا تھا۔ غور تو کرو کیسے کیسے اساطین علم وفن اور اکابر فضل وکمال اس عہد میں موجود تھے۔ خود بغداد علماء اہل سنت وحدیث کا مرکز تھا۔ مگر سب دیکھتے ہی دیکھتے رہ گئے۔ اور عزیمت دعوت، وکمال مرتبہ وراثت نبوت وقیام حق وہدایت فی الارض والامت کا وہ جو ایک مخصوص مقام تھا۔ صرف ایک ہی قائم الامر اللہ کے حصہ میں آیا۔ یعنی سید المجددین وامام المصلحین حضرت

امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ۔'' (تذکرہ ص ۱۱۷)

امام احمد بن حنبلؒ

مولانا امام احمد بن حنبل کی حق گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''عین رمضان المبارک کے عشرہ اخیر میں جس کی طاعت اللہ کو تمام دنوں کی طاعات سے زیادہ محبوب ہے۔ بھوکے پیاسے دھوپ میں بٹھائے گئے، اور اس پیٹھ پر جو علوم و معارف نبوت کی حامل تھی لگاتار کوڑے اس طرح مارے گئے کہ ہر جلاد دو ضربیں پوری قوت سے لگا کر پیچھے ہٹ جاتا اور پھر نیا تازہ دم جلاد اس کی جگہ لے لیتا۔ اس کو بھی خوشی خوشی برداشت کرلیا۔ مگر اللہ کے عشق سے منہ نہ موڑا اور راہ سنت سے منحرف نہ ہوئے۔ تازیانے کی ہر ضرب پر بھی جو صدا زبان سے نکلتی تھی وہ نہ تو جزع فزع کی تھی اور شور و فغان کی۔ بلکہ وہی تھی جس کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ یعنی ''القرآن کلام الله غير المخلوق ''اللہ اللہ یہ کیسی مقام دعوت کبریٰ کی خسروی و سلطانی تھی۔ اور وراثت و نیابت نبوت کی ہیبت و سطوت کہ خود معتصم باللہ جس کی ہیبت و رعب سے قیصر روم لرزاں و ترساں رہتا تھا، سر پر کھڑا تھا۔ جلادوں کا مجمع چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا: یا احمد! والله انی علیك شفیق وانی لاشفق علیك کشفتنی علی هارون ابنی، ووالله لئن اجابنی لاطلقن عنك بیدی ماتقول۔ یعنی واللہ میں تم پر اس سے بھی زیادہ شفقت رکھتا ہوں جس قدر اپنے بیٹے کے لیے شفیق ہوں۔ اگر تم خلق قرآن کا اقرار کرلو تو قسم خدا کی ابھی اپنے ہاتھوں سے تمہاری بیڑیاں کھول دوں۔ لیکن اس پیکر حق، اس مجسمہ سنت، اس مرید بالروح القدس، اس صابر اعظم'' کماصبر اولوا العزم من الرسل '' کی زبان صدق سے صرف یہی جواب نکلتا تھا کہ ''اعطونی شیئامن کتاب الله اوسنة رسوله حتی اقول به ''اللہ کی کتاب سے کچھ دکھلا دو، یا اس کے رسول کا کوئی قول

پیش کرو تو میں اقرار کرلوں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ

مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ (صفحہ ۱۵۷ تا ۲۳۸) مولانا نے امام ابن تیمیہؒ کے حالات لکھنے سے پہلے درج ذیل الفاظ سے آغاز کیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں:

''آٹھویں صدی کے اوائل میں جب دعوت عامہ امت وتجدید شریعت واحیاء السنۃ بعد موتہا، واخمار البدعۃ بعد شیوعہا وارتفاعہا کی روح القدس نے آیہ من آیات اللہ وحجۃ قائما من حجج اللہ شیخ المصلحین وملاذ المجددین سند الکاملین وامام العارفین، وارث الانبیاء وقدوۃ الاولیاء حضرت شیخ الاسلام تقی الدین رضی اللہ عنہ کے وجود مبارک میں ظہور کیا۔'' (تذکرہ ص ۱۳۸)

مولانا نے امام ابن تیمیہؒ کی استقامت فی الدین اور ان کی دعوت عزیمت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

ساتویں صدی کے اختتام اور آٹھویں صدی کے اوائل کا زمانہ تاریخ اسلام کا ایک نہایت ہی نازک اور انقلابی زمانہ تھا۔ مشرق میں عربی خلافت کا بالکل خاتمہ ہو چکا تھا اور اب تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل رہا اور ہر رکنے اور ٹھہرنے کی جگہ ٹھہرتا رہا تھا۔ یہ وحشی درندے صرف تاخت وتاراج کے لیے آئے تھے۔ لیکن اب پچاس لاکھ مسلمانوں کے خون اور چھ صدیوں کے اسلامی تمدن کی ویرانی پر اپنی سلطنت کی عمارت تعمیر کررہے تھے۔ ہلاکو کا پڑپوتا قازان خان اگرچہ مسلمان ہوگیا تھا لیکن ابھی یہ تبدیلی محض برائے نام تھی۔ وحشت وخونخواری میں تمام تاتاری خصائل بدستور کام کررہے تھے۔ مسلمانوں کا کوئی مرکز باقی نہ رہا تھا۔ برسوں تک جمعہ کے خطبے کسی سلطان اسلام کے ذکر سے خالی رہے۔ اس عام بربادی نے مسلمانوں کی تمام اخلاقی قوتیں بھی فنا کردیں۔ تاتاریوں کی ہیبت نے زندوں کو مردہ بنا دیا تھا۔ وہ صرف خون بہاتے اور نعشوں کے پل اور سروں کے منارے کھڑے کرتے۔

ایک چھوٹی سی ٹکڑی آبادیوں کی آبادیاں ذبح کرڈالتی ۔اور بادشاہوں اور فوجوں کو سر اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی ۔جب کوئی مرکز نہ رہا، تو شریعت کا بھی کوئی محافظ نہ رہا، نہ کوئی امت کا رہبر، وہ سارے علمی وعملی مفاسد جو آج نظر آرہے ہیں، یا تو اسی عہد میں پیدا ہوئے یا ہو چکے تھے تو اسی عالم آشوبی میں کمال وبلوغ کو پہنچے ۔علوم اصلیہ قرآن وحدیث کے ترک کی بنیادیں اسی عہد میں استوار ہوئیں، تقلید شخصی اور مذہبی فرقہ بندی کے التزام اور تعصب نے اسی زمانے میں پورا پورا زور پکڑا ۔تاتاریوں کو سب سے پہلی دعوت حنفیوں اور شافعیوں کی باہمی چپقلش نے دی تھی ۔نومسلم حکمران مذہب وعلم سے ناآشنا تھے ۔اس لیے مذہبی حکومت تمام تر علماء وفقہاء مذاہب کے ہاتھ آگئی ۔ہر مذہب کے لیے الگ الگ قاضی، الگ الگ مدارس، اوقاف، ائمہ جمعہ اور مذہبی عہدے قرار پائے ۔یہی چیز صدہا مفاسد ومصائب کا باعث ہوئی ۔ایک طرف علماء دنیا وفقہاء دولت کا ایک عظیم گروہ پیدا ہوگیا۔ دوسری طرف باہمی تعصب وتفرقہ کی آگ روز بروز زیادہ بھڑکنے لگی ۔حتی کہ جن چھوٹے چھوٹے اختلافات کو پہلے عوام نے بھی کبھی اہمیت نہ دی تھی ان کی بناء پر اب خواص وفقہاء ایک دوسرے کی تضلیل کرنے لگے ۔اور جس گروہ کو حکومت میں زیادہ دخل ہوا اس نے دوسرے کو قید خانوں اور جلاوطنیوں کی مصیبت تک پہنچا کر چھوڑا ۔عوام کا فتنہ اسی زمانے میں اس درجہ تک پہنچا جہاں آج نظر آرہا ہے ۔جو بات چاہیں علماء سے کہلوادیں اور جس بات کو اپنے ہوائے نفس کے خلاف پائیں اس پر اس قدر ہنگامہ مچائیں کہ بالآخر کسی کو زبان کھولنے کی مجال باقی نہ رہے ۔علم وعمل کی وہ ساری بدعتیں جو آج مسلمانوں کے رگ وپے میں سرایت کرگئی ہیں حتی کہ باب امتیاز مسدود ان سب کا شیوع اور جماؤ اس زمانے میں ہوا ۔تعلیم وتعلم کی تمام مجتہدانہ قوتیں ختم ہو چکی تھیں ۔اب صرف پچھلے ذخیرہ کی مزید آرائش وتزئین میں ہمتیں مصروف تھیں ۔اسی چیز نے متون وشروح اور تلخیص وتعلیق وغیرہ کے طریقہ کو رواج دیا جو بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچا کہ اس کے سوا اور تمام راہیں نظر وفکر کی بند ہوگئیں ۔مذہبی عہدوں کا ذریعہ صرف فروع فقہ کا علم تھا ۔اس لیے علوم دینیہ میں صرف اس پر قناعت کر لی گئی ۔رفتہ رفتہ علوم اصلیہ قرآن وحدیث متروک ومہجور ہو گئے ۔یہ بات

پہلے ہو چکی تھی (جیسا کہ امام غزالی نے لکھا ہے) لیکن اب بحد غایت پہنچ گئی عملیات میں اہل کتاب اور عجمی اقوام کے اختلاط و امتزاج کا معاملہ آخری حد تک پہنچ چکا تھا۔ اس لیے بدعات و رسوم کا فتنہ بھی اپنی پوری قوت اور احاطہ تک پہنچ گیا۔ اور بڑے بڑے علماء کی نظریں اس کے نفوذ و احاطہ کے اندر گم ہو گئیں۔ ایک بڑی مصیبت جو مسلمانوں پر نازل ہوئی، تصوف کے علم و عمل کا تنزل اور جہل و فسق کی کثافتوں سے اس جوہر پاک کا امتزاج اور اہل اصلاح و طہارت کی جگہ خانقاہوں اور صومعوں کی عمارتوں کی حکومت کا قائم ہو جانا ہے۔ یہ چیز اس عہد میں پوری طرح نشو ونما پا چکی تھی۔ علی الخصوص دیار مصر و شام میں کہ بقیۃ السلف مسلمانوں کا مامن و ملجا تھے۔ صرف رسمی خانقاہوں اور خرقہ پوشوں کی شہنشاہی تھی۔ خود ملوک و سلاطین بھی انہیں کے معتقد تھے۔ اور حکومت کے زور سے ان کی بدعتیں پھیلاتے رہے۔ جس گروہ کے قبضہ میں وقت کا بادشاہ اور عوام کا غول ہو اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ ملک بیبرس جاشنگر جس کے عہد میں نہ صرف ابن تیمیہؒ بلکہ تمام ائمہ عہد مثلاً امام ابن دقیق العید، حافظ مزی و علم الدین برزالی وغیرھم مبتلائے محن ہوئے۔ شیخ نصر المنیحی صاحب خانقاہ دمشق کا حلقہ بگوش معتقد تھا۔ اس نے بیبرس کو ابن تیمیہؒ کے خلاف بھڑکایا تھا۔ غرض کہ ملت و شریعت کی سیزدہ صد سالہ زندگی میں جو سخت سے سخت انقلابی زمانے گزر چکے ہیں۔ ان سب سے زیادہ سخت و مہلک زمانہ تھا۔ اور ایک انقلابی برزخ تھا کہ اصلاح کی تمام پچھلی قوتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اور فساد کے تمام تخم آئندہ کے لیے پھل پھول رہے تھے۔ وقت نہ تو بڑے بڑے مدرسوں کا طالب تھا۔ نہ بڑی بڑی خانقاہوں کا، بلکہ صرف ایک ایسی زبان و قلم کے لیے تشنہ و بے قرار تھا۔ جس میں عزم ہو، اور عارفانہ دعوت و امامت، سیکڑوں ہزاروں اعاظم وقت میں سے کسی کو بھی یہ منصب نہ ملا۔ صرف امام ابن تیمیہؒ ہی تھے جو زمانے کو پلٹ دینے اور ملکوں اور جماعتوں کو بدل دینے کے لیے اٹھے اور ایک ہی وقت و زندگی میں وقت کی ہر طلب و سوال کا جواب دیا۔ تاتاریوں کے مقابلے میں حفظ ملت و بلاد کی ایک نئی زندگی تمام بلاد مصر و شام میں پیدا کر دی، علم ہی میں نہیں بلکہ میدان جہاد و قتال میں بھی ان کا گھوڑا سب سے آگے رہتا تھا۔ ذہبی نے کہا:

"اماشجاعه فيهاتضرب الامثال ويتشبه اكابر الابطال ، حتى كانه ليث حرب"

ایک صدی کے قتل و غارت نے تمام ملک کو جرأت و ہمت سے کورا کر دیا تھا۔ بے غیرتی و بزدلی سے سب کے دل مردہ ہو گئے تھے۔ مگر اب وہی آبادیاں تھیں جو خود منزلوں سے آگے بڑھ کر تاتاریوں کا مقابلہ کرتیں۔ اور سورج کی روشنی سے زیادہ اس حقیقت پر ایمان رکھتیں کہ مسلمان اگر مسلمان ہو تو اس کو کوئی طاقت مغلوب نہیں کر سکتی۔ ان کی زندگی کے حالات امام ذہبی کی زبانی سنو، تو معلوم ہو کہ دل کی جگہ سیماب اور ہمت وعزم کی جگہ ایک پہاڑ تھا۔ دل کی بے قراریوں نے کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ مگر ہمت کی کوہ وقاری نے جہاں قدم جمایا بغیر فتح ونصرت کے منہ نہ موڑا۔ ساتھ ہی علوم وعقائد کی تجدید واصلاح کا عظیم الشان کام بھی اس اہتمام سے انجام دیا کہ بڑی بڑی جماعتوں سے بھی انصرام نہ پاتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دین حق وتوحید کی وحدت، اصل ملت کے ہر حال وہر مشکل میں ایک ہوئے۔ خیر القرون کے علم وعمل کی از سرنو تجدید، دین الخالص اور سنت خالصہ ومحصنہ کے اعتصام اور تمام تفرقوں اور فرقہ بندیوں اور بدعتی راہوں کے خلاف قولاً وعملاً دعوت اولیٰ کی صدا اس قوت ونفوذ کے ساتھ بلند کی کہ وقت کا کوئی شور وغوغا اس پر غالب نہ آ سکا۔ اور گو ہمیشہ دبانے کی بڑی بڑی قاہر وجابر کوششیں کی گئیں، مگر اس کی گونج رہ رہ کر اٹھتی اور دب دب کر ابھرتی رہی۔ حتیٰ کہ آج بھی اگر مختلف گوشوں سے صدائیں اٹھ رہی ہیں تو یہ بھی اسی گرج کی بازگشت ہے۔

دشمنان حق کے پاس سب سے بڑا آلہ تعذیب، قید خانوں کی کوٹھڑیاں ہیں۔ مگر یہ چیز بھی ان کی عزیمت ودعوت کے مقابلہ میں بے کار تھی۔ مصر میں جب قید کیے گئے تو تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ جب قلم دوات بھی چھین لی گئی تو قید خانے میں قیدیوں پر نظر ڈالی اور ان کا بڑا حصہ ڈاکوؤں، رہزنوں اور قاتلوں کا تھا۔ لیکن چند دنوں کے اندر ان کو شیطان سے فرشتہ بنا دیا۔ علم وعمل کی جو برکتیں خانقاہوں اور مدرسوں کو نصیب نہ تھی وہ جیل کے اندر ہر طرف نظر آنے لگیں۔

صاحب کواکب لکھتے ہیں کہ:

حتی سار المجلس بالاشتعال بالعلم والدین خیرا من کثیرا لزوایا والربط والخوانق والمدارس.

یہ معنی ہیں ایمان کامل اور مقام عزیمت علم وعمل کے۔ چراغ جہاں کہیں رکھا جائے گا اجالا ہو جائے گا اور پھولوں کا گلدستہ طاق کی جگہ کوڑے کرکٹ کی ٹوکری ہی میں کیوں نہ ڈال دو لیکن اس کی خوشبو ضرور پھیلے گی۔ مور نے کہا میرا چمن میرے ساتھ ہے باغ و بہار کا محتاج نہیں۔ جہاں کہیں پروں کو کھول دوں گا۔ ایک تختۂ چمن کھل جائے گا۔ اور یہی حال مومن کامل اور صاحب علم وعمل حق کا ہے۔ وہ کسی زمان ومکان کا محتاج نہیں جہاں کہیں بھی جائے گا روشنی پھیلائے گا اور جس جگہ سے گزرے گا ہوا کی عطر بیزی بتلا دے گی کہ کوئی گزرنے والا یہاں سے گزرا ہے:

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

امام ابن تیمیہؒ کے تذکرہ میں بوجہ ضمنی مباحث کے بہت طول ہو گیا۔ بایں ہمہ جس قدر لکھا گیا اس سے کہیں وہ چند قابل ذکر امور چھوڑ دیے گئے ہیں۔ حافظ ذہبی کو بھی ایسی صورت حال پیش آئی تھی۔ جن لفظوں پر انھوں نے ذکر ختم کیا تھا میں بھی کروں گا۔ یعنی جو لوگ امام ابن تیمیہؒ کے مقامات ومراتب کے جاننے والے ہیں وہ تو مجھے الزام دیں گے کہ جس قدر مدح وتوصیف کرنی تھی نہ کی۔ اور جو بے خبر اور مخالف ہیں وہ میرے بیان کو غلو ومبالغہ قرار دیں گے۔

(تذکرہ ص ۱۳۱ تا ۲۳۸)

امام ابن تیمیہؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ

مولانا ابوالکلام آزاد کا ذہن وفکر امام ابن تیمیہؒ سے شروع ہی سے بہت متاثر تھا۔ اور امام صاحب کے افکار کا مولانا کے دماغ پر بڑا غلبہ تھا۔ بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادی مولانا کے ذاتی کتب خانہ میں امام ابن تیمیہؒ کی تمام مطبوعہ تصانیف موجود تھیں۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی لکھتے ہیں کہ:

تذکرہ میں مولانا آزاد نے ان ائمہ مجتہدین اور علمائے دین کی بڑی تعریف وتوصیف کی ہے جنہوں نے قرآن وسنت کی عظمت اور برتری کو قائم رکھا۔ ان گنت مصائب وآلام میں صبر واستقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ علماء سوء کی حیلہ سازیوں کا پردہ چاک کیا۔ اور غیر منصف اور سخت گیر حکمرانوں کے ظلم واستبداد کو بے باکی سے چیلنج کیا۔ انہیں میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ بھی ہیں۔ جن کی شخصیت میں انہیں شاید اپنے وجود کا وہ پیکر نظر آتا تھا جو اپنے وقت کے نام نہاد تجدد پسندوں اور عقلیت دوستوں کے مقابلہ میں قرآن وسنت کی صداقتوں کا علمبردار تھا۔ امام احمد بن حنبل نے نویں صدی عیسویں میں معتزلی حامیان عقلیت کے خلاف جنہیں وقت کے حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل تھی ایک جرأت آموز موقف اختیار کیا تھا اور تن تنہا قرآن کے غیر مخلوق ہونے کی صداقت پر ایمان کو وقت کے مسلم معاشرے میں اور زیادہ مضبوط اور مستحکم بنا دیا تھا۔

لیکن تذکرہ میں حنبلی مسلک کے شامی مصلح ومجتہد ابن تیمیہؒ کو زیادہ جگہ دی گئی ہے۔ مولانا آزاد بار بار اپنے زمانے کی بے مثال شخصیت ابن تیمیہؒ کی تعریف وتوصیف اور ان کے لیے اپنے گہرے جذبۂ احترام کا ذکر کرتے ہیں۔ اُن پر ابن تیمیہؒ کی شخصیت، جذبۂ جہاد اور مجتہدانہ طرز فکر کا اثر کن کن اطراف وجوانب سے پڑا۔ (یہ ایک الگ موضوع ہے) بس یہ سمجھ لیجیے کہ زندگی کے آخری لمحوں تک مولانا آزاد کی شخصیت اور مذہبی دانشوری پر ابن تیمیہؒ کے فکر وعمل کی مجاہدانہ ومجتہدانہ خصوصیات کا اثر باقی رہا۔

امام ابن تیمیہؒ مولانا ابوالکلام آزاد کے ہیرو تھے اور ان کے روحانی رہنما بھی تھے۔ اور ابن تیمیہؒ کے افکار سے مولانا آزاد نے فیض حاصل کیا تھا۔

(مولانا ابوالکلام آزاد ص ۱۳۲)

امام ربانی مجدد الف ثانیؒ

دعوت وعزیمت اور اعلائے کلمۃ الحق اور حق گوئی وبیباکی کے سلسلہ میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کی خدمات بھی قدر کے قابل ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد حضرت امام

ربانی کی دعوت اعلائے کلمۃ الحق کے بہت زیادہ معترف تھے۔تذکرہ میں مولانا نے ان کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔لکھتے ہیں کہ:

شہنشاہ اکبر کے عہد اختتام اور عہد جہانگیری کے اوائل میں کیا ہندوستان علماء ومشائخ حق سے بالکل خالی ہوگیا تھا۔کیسے کیسے اکابر موجود تھے لیکن مفاسد وقت کی اصلاح وتجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔صرف حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کا وجود گرامی ہی تن تنہا اس کاروبار کا کفیل ہوا۔معلوم ہے کہ اس عہد میں بڑے بڑے علماء واصحاب خانقاہ موجود تھے۔بدایونی وطبقات اور روضۃ العلماء واخبار الاخیار دیکھوتو معلوم ہوتا ہے ہندوستان میں بجز عالموں اور پیروں کے اور کوئی بستی کوئی شہر وقریہ نہ تھا کہ خانقاہوں اور مدرسوں سے خالی ہو۔علماء دین شیخ وجیہہ الدین گجراتی ،شیخ علی متقی ،شیخ جلال تھانیسری ،ملامحمود جون پوری ،مولانا یعقوب کشمیری ،ملاقطب الدین سہالوی ،شیخ عبدالحق محدث ،ملاعبدالحکیم سیالکوٹی ،مولانا عبدالہداد جون پوری وغیرھم اپنے وقتوں کے مالک اور علم وتعلم کے بادشاہ تھے۔بایں ہمہ دوسرے دوسرے گوشوں اور کاموں میں وقت بسر کر گئے۔اس راہ کو ایک قدم بھی نہ اٹھ سکا۔(تذکرہ ص ۲۳۸)

کچھ شک نہیں کہ توفیق الٰہی نے حضرت مجدد الف ثانی کے وجود گرامی ہی کے لیے یہ مرتبہ خاص کردیا تھا۔انبیاء اولوا العزم کی نیابت وقائم مقامی یعنی مقام عزیمت دعوت کا خلعت صرف انہی کے جسم پر چسپ آیا۔باقی جس قدر تھے یا تو مدرسوں میں پڑھاتے رہے یا موٹی موٹی کتابیں اور نئی نئی شرحیں اور حاشیے لکھتے رہے یا پھر ان کی تفصیل وتکفیر کے فتوؤں پر دستخط کرتے رہے۔وقت کا جو اصلی کام تھا اس کو کوئی ہاتھ نہ لگا سکا۔(تذکرہ،ص ۲۴۲)

مولانا محی الدین احمد قصوریؒ

مولانا محی الدین احمد قصوری پنجاب کے نامور عالم دین اور وکیل مولانا عبدالقادر قصوریؒ کے فرزند ارجمند تھے۔مولانا آزاد کے مولانا عبدالقادر قصوری اور ان کے صاحبزادگان مولانا محی الدین احمد قصوری اور مولانا محمد علی احمد قصوری سے بہت اچھے تعلقات تھے۔مولانا ابوالکلام نے ان کو خاندانِ ساداتِ قصور کے نام سے یاد کیا ہے۔۱۹۱۵ء میں مولانا محی

الدین احمد قصوری کو مولانا آزاد نے کلکتہ بلوایا۔ مولانا محی الدین احمد قصوری نے مولانا آزاد کی نگرانی میں روزنامہ ''اقدام'' جاری کیا۔ ۱۹۱۶ء میں حکومتِ بنگال نے مولانا آزاد کو صوبہ بدر کر دیا۔ مولانا آزاد چونکہ روزنامہ ''اقدام'' کے سرپرست تھے، اس لیے ان کے صوبہ بدر ہونے سے ''اقدام' بند ہو گیا۔

تذکرہ میں مولانا آزاد نے محی الدین احمد قصوری کا ذکر درج الفاظ میں کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ:

اخبارات سے معلوم ہوا کہ عزیزی مولوی محی الدین احمد بی اے کو قصور میں تلاشی کے بعد گرفتار کر لیا گیا ہے۔ شاید نظر بندی کا معاملہ پیش آئے۔ ان تمام ایام جلاوطنی میں یہ پہلا دن ہے کہ اس واقعہ کے سننے سے دل کو مضطر اور دماغ کو پراگندہ پاتا ہوں۔

عزیز موصوف بلکہ ان کا پورا خاندان اپنے خصائص ایمانی و جوش اسلامی و ایثار للہ و لی اللہ کے اعتبار سے عہد سلف کے واقعات زندہ کرنے والا ہے۔ اور علی الخصوص اس عزیز کی طلب صادق اور استعدادِ کامل سے تو اپنی چند در چند یادیں وابستہ تھیں۔ افسوس فتنۂ حوادث نے اس کو بھی نہ چھوڑا۔ مجھے اس سے کب انکار تھا کہ میرے پاؤں میں ایک کے بدلے دس زنجیریں ڈال دی جائیں لیکن دوسروں کو اس میں کیوں شریک کیا جاتا ہے۔ بظاہر عزیز موصوف کا اس کے سوا کوئی جرم نہیں کہ مجھ خانماں خراب سے راہ و رسم رکھتے ہیں۔ سبحان اللہ! اپنی روشناسی اور دوست نوازی بھی قابل تماشا ہے۔ جب تک کوئی اپنا دشمن نہ بن جائے ہمارا دوست نہیں ہو سکتا۔

اے ہم نفسان آتشم از من بگریزند
ہرکس کہ شود ہمرہ ما دشمن خویش ست

(تذکرہ ص ۳۰۲)

تذکرہ کا مطالعہ

تذکرہ میں بہت زیادہ عربی فارسی عبارتیں اور اشعار درج کیے گئے ہیں اور ادبی نقطہ نظر سے اس کا مقام بہت بلند ہے۔ اس کے مطالعہ سے مصنف کی عالمانہ جامعیت وفضیلت

اوران کے افکاراور مذہبی عقائد ومیلانات کو سمجھنے کا پتہ چلتا ہے۔تاہم اس کی اہمیت مسلم ہے۔
پروفیسر ضیاءالحسن فاروقی لکھتے ہیں کہ:

''یہ صحیح ہے کہ تذکرہ عام لوگوں کے پڑھنے کے لیے نہیں لکھا گیا تھا لیکن یہ تمام عالموں کے لیے بھی نہیں ہے ۔خواہ اسلام اور تاریخ اسلام سے متعلق ان کی معلومات کتنی ہی گہری اور وسیع کیوں نہ ہوں، اسے صرف دینی عالم قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔جنہوں نے مذہب کو جذبہ محبت وخیراور وسیع تر ہمدردیوں کے ساتھ سمجھا ہو۔اس میں اس کشادہ دل اور بے تعصب راسخ العقیدگی کی ترجمانی کی گئی ہے جس سے سچی مذہبیت پیدا ہوتی ہے۔ سچی مذہبیت جوسرچشمہ ہے اس بابرکت ہمت اور عزیمت کا جسے ہم دنیا پرست عالموں ،حد سے تجاوز کرنے والے صوفیوں اور بے دین اور ظالم حکمرانوں کے مقابلہ میں حق وصداقت کے لیے اٹھ کھڑی ہونے والی دینی شخصیتوں میں پاتے ہیں۔''

(مولانا ابوالکلام آزادص ۱۳۰)

آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی (بروایت ملیح آبادی):

۱۹۲۱ء میں مولانا ابوالکلام نظر بند ہوئے توان کے ساتھ دوسرے سیاسی لیڈر بھی تھے۔ ان ہی میں مولانا کے ایک رفیق مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی بھی تھے۔یہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بہت زیادہ عقیدت مند تھے۔انھوں نے بڑی مشکل سے مولانا آزاد کو تذکرہ کی دوسری جلد لکھنے کے لیے آمادہ کرلیا۔چنانچہ مولانا آزاد بولتے جاتے تھے اور ملیح آبادی لکھتے جاتے تھے۔اس طرح مولانا آزاد نے جیل ہی میں اپنے پورے حالات لکھوادیے۔

اس کتاب میں مولانا نے اپنے والد محترم کے حالات زندگی لکھواتے ہوئے اپنا خاندانی سلسلہ شیخ جمال الدین دہلوی سے شروع کیا ہے۔ جوحضرت سیّد احمد سرہندی کے خلیفہ تھے۔پھر اپنے والد کے نانا مولانا منورالدین اوران کے والد قاضی سراج الدین کی سوانح حیات مختصر لکھوائی ہے۔اوراس کے علاوہ اہلحدیث کے ساتھ اپنے والد کے بغض وعناد کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

شورش کاشمیری مرحوم اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

مولانا نے اس حقیقت کو اعراض وانکار کی بہت سی وادیاں قطع کرنے کے بعد پایا تھا۔اس کتاب میں مولانا کی وہ ساری ذہنی کشمکش خود ان کی زبانی موجود ہے جو سرسید کے افکار وعقائد سے متاثر ہوکر موروثی مذہب سے ان کی دل برداشتگی کا باعث ہوئی ۔اور وہ خاندانی مذہب سے بغاوت کی راہ پر آگئے ۔ اپنے والد کے مسلک پر ان کا لوٹنا محال تھا کہ والد کا راستہ عشق کے غلو کا راستہ تھا۔اور اس ساری کشمکش میں حقیقی اسلام ان کے سامنے آچکا تھا۔وہ اس میں ڈوب گئے ۔ترجمان القرآن کی دونوں جلدیں اسی یقین واعتماد کی سرجوشی اور علم وصداقت کے ولولے سے معمور ہیں کہ ہر چیز استدلال وایقان کے ترازو میں تلی ہوئی نظر آتی ہے۔

اسی کتاب میں ایک چیز انتہائی عمدگی سے بیان ہوئی ہے کہ مولانا نے اپنے والد کے غلو فی المذہب ہی کو ہدف نہیں بنایا ہے بلکہ صلحاء امت کے خلاف ان کا طرز عمل بھی بیان کیا ہے ۔اور ان مصائب کو شرحِ صدر سے لکھا ہے جو ان کے ہاتھوں علمائے اہلحدیث پر ہندوستان اور حجاز میں بیت رہے تھے ۔(یہ کتاب اپریل ۱۹۵۸ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کی)

(ابوالکلام آزاد شورش کاشمیری ص ۳۷۷)

رسول رحمت ﷺ:

یہ کتاب آنحضرت کی سیرت طیبہ پر ہر پہلو سے جامع ہے، یہ مولانا آزاد کے ایک صد پانچ (۱۰۵) مقالات کا مجموعہ ہے جو آپ نے سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر مختلف اوقات میں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں تحریر فرمائے ۔

یہ مقالات مولانا غلام رسول مہر نے مرتب کیے اور جہاں جہاں خلا محسوس ہوا اس کو اضافہ مطالب کے ساتھ پُر کیا ۔اس کتاب میں جغرافیائی تشریحات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے ۔مہر صاحب نے بعض مقالوں پر ضروری حواشی بھی لکھے ہیں اور بعض تمہیدی عبارتیں

بھی تحریر کی ہیں۔

مولانا ابوالکلام تذکرہ میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حالات میں سیرۃ النبی ﷺ کے بارے میں فرماتے ہیں:

اور یہ حقیقت ہے کہ نہ صرف اس عہد میں بلکہ جب تک دنیا باقی ہے صاحب قرآن کی سیرت و حیاتِ مقدس کے مطالعہ سے بڑھ کر نوع انسانی کے تمام امراض قلوب و علل ارواح کا کوئی علاج نہیں۔ اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجۃ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحب قرآن کی سیرت ہے۔ اور دراصل قرآن اور حیات نبوت معناً ایک ہی ہیں۔ قرآن متن ہے اور سیرت اس کی شرح، قرآن علم ہے اور سیرت اس کا عمل، قرآن صفحات و قراطیس مابین الدفتین اور فی صدور الذین اوتو العلم میں ہے۔ اور یہ ایک مجسم و ممثل قرآن تھا جو یثرب کی سرزمین پر چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ کما قلت الصدیقه رضی الله عنها وکان خلقه القرآن۔

(تذکرہ، ص:۱۷۶)

رسول رحمت ﷺ کے مقالات قرآن مجید سے سیرۃ طیبہ کے استنباط کا ڈھنگ سکھاتے ہیں اور سلیقہ بتاتے ہیں۔ مولانا نے رحمۃ للعالمین کے معانی و مطالب جس بلاغت سے بیان کیے ہیں۔ اس سے پہلے رحمۃ للعالمین کا یہ جامع مانع تصور کسی نے بیان نہیں کیا۔

رسول رحمت پر مولانا غلام رسول مہر نے ایک جامع و علمی اور تحقیقی مقدمہ بھی لکھا ہے جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے اور ۲۸ صفحات پر محیط ہے۔ اس مقدمہ میں مولانا مہر نے سیرۃ نبویؐ کا مقام، قرآن اور سیرۃ نبویہ، اشاعت سیرۃ طیبہ اور رسول اللہ ﷺ کا احترام اور اس کا مقام جیسے عنوانات پر اظہار خیال کیا ہے۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۰ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کی۔ صفحات کی تعداد ۷۹۹ ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام:

یہ کتاب بھی مولانا ابو الکلام آزاد کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو مختلف انبیائے کرام علیہم السلام پر ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں شائع ہوئے۔ اس کے مرتب بھی مولانا غلام رسول مہر ہیں۔ اس کتاب کا نصف حصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق ہے۔ اور دوسرا حصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان ترجمان القرآن سے ماخوذ ہے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام پر دو مقالے ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت ایوب علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام پر بھی مقالات ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کی بھی سرگزشت ہے۔

کتاب کے آغاز میں مولانا مہر نے مقدمہ بھی لکھا ہے جو دو مقالوں پر مشتمل ہے۔ ایک میں سیر انبیاء کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے، دوسرے میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں مخصوص دعوتوں پر کیوں اکتفا کیا گیا۔

یہ کتاب بھی شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کی ہے۔ صفحات کی تعداد ۳۶۰ ہے۔

باب نمبر ۱۱

مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت بڑی ہمہ گیر اور پہلودار تھی ۔ انہوں نے ادب، صحافت، تصنیف و تالیف، تقریر و خطابت، سیاست اور کتنے ہی دوسرے شعبوں میں اپنے غیر فانی نقوش چھوڑے ۔ مولانا علوم اسلامیہ کے بحر زخار تھے ۔ تمام علوم میں ان کو یکساں قدرت حاصل تھی ۔ آپ نے تمام موضوعات یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، سوانح، سیرت، فلسفہ، منطق، ادب ولغت، شعر وسخن اور سیاست وغیرہ پر بلند پایہ مضامین و مقالات اور کتابیں لکھیں ۔ عربی، فارسی اور اردو پر مکمل عبور حاصل تھا ۔ آپ نے ابتدائی عمر میں کئی عربی کتابوں کے ترجمے کیے ۔

مولانا کے مقالات ومضامین، خطبات و مکاتیب کئی اداروں نے مختلف ناموں کے ساتھ شائع کیے ہیں ۔ مثلاً مقالات الہلال، مضامین الہلال، مقالات البلاغ، مضامین البلاغ، انتخاب الہلال، انتخاب البلاغ، نگارشات آزاد، تصریحات آزاد، ملفوظات آزاد، مقالات آزاد، مکاتیب آزاد، خطبات آزاد، نوادر ابوالکلام وغیرہ ۔ اگر ان تمام مضامین و مقالات اور خطبات و مکاتیب کا تعارف کرایا جائے تو ایک بہت بڑی ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے ۔ مولانا کی بعض مشہور تصانیف کا تعارف آپ پچھلے ابواب میں پڑھ آئے ہیں ۔ مثلاً ترجمان القرآن، خطبات آزاد، کاروانِ خیال، غبارِ خاطر، برکاتِ آزاد، نقش آزاد، تذکرہ، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، رسول رحمت ﷺ اور انبیائے کرام علیہم السلام ۔

یہاں آپ کی (۲۴) اور تصانیف کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے ۔

(۱) جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد:

اس کتاب میں بدلائل ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے اذن سے غیر مسلم کا مسجدوں

میں داخل ہونا جائز ہے اور مساجد کی مجالس میں ان کو شریک کیا جا سکتا ہے نیز اداب مساجد اور آیت (انما المشرکون نجس ۔ الخ) کی تفسیر بھی بڑے عمدہ الفاظ میں بیان کی ہے۔ یہ تحریر پہلے معارف اعظم گڑھ کے مئی اور جون ۱۹۱۹ء کے دو شماروں میں شائع ہوئی تھی ۔ پھر الگ کتابی صورت میں چھپ گئی ۔ (صفحات:۱۰۳)

(۲) حقیقت الصلوٰۃ:

اس کتاب میں چند ابواب قائم کر کے نماز کے لغوی و شرعی معنی بتائے گئے ہیں اور نماز کی فرضیت، نماز کے فوائد، نماز سفر و خوف کی فرضیت اور تخفیف کی علت وغیرہ پر اچھی خاصی روشنی ڈالی گئی ہے ۔ (صفحات:۸۰)

(۳) نور اللمعہ فی فضائل الجمعہ:

یہ رسالہ علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ ھ) کے رسالہ نور اللمعہ فی فضائل الجمعہ کا ترجمہ ہے ۔ مولانا نے یہ ترجمہ ابتدائی عمر میں کیا تھا۔

(۴) حقیقت الزکوٰۃ:

اس کتاب میں زکوٰۃ کی فرضیت اور اس کی ضرورت کو واضح کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ انفرادی طور پر زکوٰۃ دینا جائز ہی نہیں ہے ۔ (صفحات:۶۴)

(۵) جہاد اور اسلام:

اس کتاب میں مسئلہ جہاد، غنیمت اسلامی، قربانی، عید الاضحیٰ اور اسوۂ ابراہیمی پر قرآن و حدیث کی روشنی میں مفصل بحث ہے ۔ (صفحات:۴۶)

(۶) ایلاء و تخییر:

اس کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے ۔ ان کے ہر پہلو پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے ۔ اس کتاب کی ابتداء میں کتب حدیث کی اہمیت، ان کی صحت اور درستگی کے معیار اور ان کے طبقات پر نہایت لطیف و مختصر بحث ہے ۔ اس کے بعد اصل موضوع بیان کیا گیا ہے ۔ جو تفسیر، حدیث اور سیرت کی مشترک بحث کا ایک نادر اور بے نظیر مجموعہ ہے۔

(صفحات:۸۶)

(۷) مسلمان عورت:

یہ کتاب فرید وجدی کی کتاب ''المرأۃ المسلمۃ'' کا ترجمہ ہے۔ اس میں عورت کا مقام، حقوق اور آزادی کے مسئلہ پر بحث ہے۔ اور آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ عورتوں کے بارے میں یورپ کی موجودہ آزادی اور مشرق کی قدیم سختی دونوں قانون فطرت کے خلاف ہیں۔ (صفحات:۲۳۳)

(۸) بائیکاٹ:

اس مختصر رسالہ میں آیت (یاأیھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء ۔ الخ) سے استدلال کرتے ہوئے مسلمانانِ برصغیر کو یورپین مال تجارت اور مصنوعات کا بائیکاٹ کر دینے کی دعوت دی گئی ہے۔ (صفحات:۱۲)

(۹) الفرق بین اولیاء اللہ واولیاء الشیطان:

اس کتاب میں اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان کی پہچان قرآن مجید کی مختلف آیات سے کرائی گئی ہے۔ اور یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اولیاء اللہ سے مقصود کوئی خاص مصطلحہ جماعت نہیں ہے بلکہ تمام مومنین، صادقین اولیاء اللہ ہیں۔ (صفحات:۶۰)

(۱۰) صدائے حق:

یہ کتاب مولانا کے مختلف خطبات کا مجموعہ ہے جو آپ نے مختلف اجلاسوں اور کانفرنسوں میں مختلف موضوعات پر ارشاد فرمائے۔ (صفحات:۱۲۰)

(۱۱) پابندیٔ عہد اور قرآن حکیم:

اس کتاب میں اجمالی طور پر تاریخی حیثیت سے یہ بتایا گیا ہے کہ اس رُوئے زمین پر اسلام کے نہ ماننے والوں کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں اور قومیں اُٹھیں۔ اور ایک دوسرے سے عہد و پیمان کیا لیکن کبھی کسی نے وفا نہ کیا۔ سوائے اسلام کے ماننے والوں کے۔ (صفحات:۸۰)

(۱۲) ذکریٰ:

یہ کتاب دو مضامین پر مشتمل ہے۔ ایک ولادت نبویؐ، دوم افسانہ ہجر و وصال، پہلے مضمون میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام، آرین مذہب کے پیشوا، اور گوتم بدھ کی برسی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تاریخ ولادت پر ان کے معتقدین کے خرافات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ذکر کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ موجودہ دور کے مسلمان اگلی امتوں کی طرح ہو گئے ہیں۔ دوسرے مضمون میں آج کل کے مسلمانوں کی غفلتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ (صفحات: ۸۳)

(۱۳) صدائے رفعت:

اس کتاب کے شروع میں طرابلس کی جنگ کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جو عرب و ترک اور اطالین قوم کے مابین ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد مسئلہ خلق قرآن سے متعلق اس مناظرہ کی رُوداد درج ہے جو شیخ عبدالعزیز الکنانی، اور بشر بن ولید الکندی کے مابین ہوا تھا۔ (صفحات: ۱۶۰)

(۱۴) دعوتِ حق:

اس کتاب میں مولانا نے اسلامی تاریخ کے ایک عظیم بزرگ عبدالعزیز الکنانی کی غیرت اسلامی کی ایک انوکھی داستان، دعوت و عزیمت اور ابتلا و محن کی ایک حیرت انگیز روداد اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایک ایمان افروز نظارہ پیش کیا ہے۔ (صفحات: ۳۷)

(۱۵) حزب اللہ:

اس کتاب میں ان لوگوں کی تردید کی گئی ہے جنہوں نے ترکی حکومت کی تنزلی کے وقت حرمین شریفین کی حفاظت کے لیے ایک فنڈ قائم کیا تھا اور لوگوں سے اپیل کی گئی تھی کہ کم ازکم سال میں ایک مرتبہ ایک روپیہ ہر مسلمان جمع کرے۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا نصب العین خدمت کعبہ نہیں بلکہ خدمت عالم ہے۔ (صفحات: ۱۰۵)

(۱۶) الحریۃ فی الاسلام:

اس کتاب میں اسلامی جمہوریت اور حریت اسلامی پر بحث کرتے ہوئے آزادی یورپ پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ (صفحات: ۶۸)

(۱۷) قول فیصل:

یہ کتاب دسمبر ۱۹۲۱ء میں مولانا کی گرفتاری اور ایک سال کی سزا (جو آپ نے پریذیڈنسی جیل علی پور میں کاٹی) اور علالت میں تحریری بیان داخل کیا، اس کی روداد پر مشتمل ہے، مولانا غلام رسول مہر اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''دسمبر ۱۹۲۱ء میں بہ سلسلہ ترک موالات مولانا گرفتار ہوئے تھے۔ اور وقت کے قومی فیصلے کے مطابق انہوں نے دوران مقدمہ میں عدالت سے تعاون نہیں کیا تھا۔ البتہ آخر میں ایک بیان داخل کیا جو ''قول فیصل'' کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ آج بھی موجود ہے، ہندوستان میں چھوٹے بڑے ہزاروں افراد گرفتار ہوئے تھے۔ اور بے شمار لوگوں نے تحریری بیانات دیے تھے۔ مگر کوئی بیان ''قول فیصل'' کا درجہ حاصل نہ کر سکا۔ مجاہدین آزادی کے خلاف مقدمے ہر ملک میں چلے اور اکثر نے بیانات بھی دیے۔ میرے علم کے مطابق آئر لینڈ کے قائد آزادی رابرٹ ایمٹ (Robert Emmet) کا بیان بہت پر زور اور پر تاثیر مانا جاتا ہے۔ لیکن ''قول فیصل'' کے مقابلے میں وہ بھی بالکل بے کیف معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نے اس میں حقیقت حال واضح کی؛ آزادی کے لیے ہر جدوجہد کا اقرار کیا۔ بلکہ کہا کہ میں اس جرم کا ارتکاب بہت پہلے سے کر رہا ہوں اور اسے اپنا پیدائشی حق قرار دیا۔ پھر اپنا یہ یقین بھی واضح کر دیا کہ حق کامیاب ہوگا اور باطل اپنی ظاہری نفرت کے باوجود ٹھہر نہ سکے گا۔ دنیا جانتی ہے کہ حالات نے مولانا کے اسی یقین کا ساتھ دیا۔ خدا کی سنت کبھی نہیں بدلی۔ قدرت کے بنائے ہوئے اصول کی کارفرمائی میں کبھی تغیر نہیں ہوا۔ لیکن

یہ بول بول لینا ایک چیز ہے۔ اور اس کی کارفرمائی پر چٹانوں سے بھی بدرجہا مستحکم ایمان ویقین کی روح سے معمور ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد، ازمہر، ص:۱۵۵)

اس کتاب میں مولانا کی بیگم زلیخا خاتون کے تار کا مضمون بھی درج ہے جسے گاندھی جی کے پاس مولانا کے گرفتار ہونے پر بھیجا گیا تھا۔

قول فیصل کا عربی ترجمہ "ثورالھند السیاستۃ" کے نام سے قاہرہ (مصر) سے اور ترکی ترجمہ قسطنطنیہ (استنبول) سے شائع ہوا تھا۔ عربی ترجمہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور ترکی ترجمہ عمر رضا مدیر "جہان اسلام" قسطنطنیہ (استنبول) نے کیا تھا۔

(ابوالکلام آزاد، از افضل احق قرشی، ص:۳۳)

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۱ء میں البلاغ پریس کلکتہ سے شائع ہوئی، بعد میں ہندوستان اور پاکستان کے کئی ناشروں نے شائع کی ہے۔ (صفحات: ۱۶۸)

(۱۸) امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا فیصلہ اور مالیرکوٹلہ کا نزاع:

یہ کتاب جماعت اہلحدیث مالیرکوٹلہ کے اس نزاع کی روداد پر مشتمل ہے جس کے نتیجہ میں مولوی محمد امین اثری رکن جماعت اسلامی ہند نے جماعت کو دو دھڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ (صفحات: ۴۸)

(۱۹) مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب:

یہ مولانا کا خطبہ صدارت ہے جو آپ نے بنگال خلافت کانفرنس منعقدہ کلکتہ فروری ۱۹۲۰ء میں ارشاد فرمایا۔ اس میں مولانا نے خلافت کا اسلامی تصور، اس کے معنی اور مفہوم پر روشنی ڈالی ہے۔ اور خلافت اسلامیہ کی تاریخ بیان کی ہے۔ مولانا اس خطبہ میں ایک جگہ اپنے بارے میں قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو۔ تم میں کوئی نہیں جو میرا شناسا ہو۔ سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس ملک میں، مَیں بے یار و آشنا غریب الوطن

ہوں۔ (ص ۲۱۲)

یہ خطبہ پہلی بار ۱۹۲۰ء میں البلاغ پریس کلکتہ سے شائع ہوا۔ اور اس کا دوسرا ایڈیشن بعض اضافوں کے ساتھ چند ماہ بعد شائع ہوا۔ (صفحات: ۲۴۳، مطبوعہ مکتبہ جمال لاہور، ۲۰۰۴ء)

(۲۰) عزیمت و دعوت:

اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ دعوت کی دو قسمیں ہیں ایک صرف دعوت اور دوسری عزیمتِ دعوت، اس کے بعد امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی دعوت اور دعوت کے طریقے اور ان پر توڑے گئے مصائب بیان کیے گئے ہیں۔ (صفحات: ۱۳۰)

(۲۱) اسلام اور آزادی:

اس کتاب میں حضرت حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت اور واقعہ کربلا کو نہایت تحقیق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ (صفحات: ۹۶)

(۲۳) مواعظ ربیع الاول:

اس مختصر رسالہ میں ۱۲، ربیع الاول کے خرافات کی تردید کی گئی ہے اور خاص طور پر ان لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو ماہ ربیع الاول میں مجالس ومحافل وغیرہ قائم کرنے کے تو بڑے شائق ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی حقیقی تعلیم سے کوسوں دور ہیں۔ (صفحات: ۱۰)

(۲۳) اتحاد اسلامی:

اس رسالہ میں قرآن وحدیث کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ جب تک اسلام دنیا میں موجود ہے مسلمانوں کے درمیان اسلامی اخوات بھی موجود رہے گی۔ اس کے بعد ''مسئلہ مشرقی، اور پان اسلام ازم'' کے سلسلہ میں بتا گیا ہے کہ یہ دونوں تحریکیں انگریزوں کی ایجاد ہیں۔ (صفحات: ۲۴)

(۲۴) انڈیا ونز فریڈم (India wins freedom):

۱۹۵۶ء میں پروفیسر ہمایوں کبیر نے مولانا کو اس بات پر آمادہ کرلیا تھا کہ وہ فرصت

کے اوقات میں مولانا کے بیانات انگریزی میں لکھتے رہیں۔ اس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ جب ہمایوں کبیر کے پاس ایک باب تیار ہو جاتا، تو مولانا کے پاس دیکھنے کے لیے بھیج دیتے۔ مولانا اس میں حک واضافہ کر کے مسودے کو ٹھیک کر دیتے۔ جب کتاب مکمل ہو گئی تو مولانا نے اس پر نظر ثانی کی اور اس میں سے ۳۰ صفحات نکال لیے۔ اور ان کو نیشنل لائبریری کلکتہ میں محفوظ کرا دیا اور ان کے بارے میں وصیت کی کہ میری وفات کے تیس سال بعد شائع کیے جائیں، چنانچہ یہ تیس صفحات مولانا کی وفات ۱۹۵۸ء کے تیس سال بعد ۱۹۸۸ء میں شائع کیے گئے۔

اس کتاب کا اردو ترجمہ، تحریک آزادیٔ، آزادی کی حیثیت، اور ''ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے''، اور ''ہماری آزادی'' کے عنوان سے بھی شائع ہوا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر اس کتاب کو مولانا کی تصنیف تسلیم نہیں کرتے اور اس کو مولانا کے ملفوظات قرار دیتے ہیں۔

باب نمبر۱۲

مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کی سیاسی بصیرت

مولانا ابوالکلام آزاد جیسی نابغہ روزگار شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں جو افکار و تصورات کی دنیا میں قوموں اور ملتوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیتی ہیں، اور تاریخ کا نیا دور شروع کرتی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد میں فطری عظمت تھی۔ وہ مجتہدانہ دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے اور اپنے کمالات کے اعتبار سے ایک عظیم عالم دین تھے۔ مفکر تھے، مجتہد تھے، مفسر قرآن تھے، محدث تھے، مورخ تھے، محقق تھے۔ معلم تھے، متکلم تھے، ادیب اور دانش ور تھے، شعلہ بیان خطیب تھے، بلند پایہ صحافی اور مصنف تھے۔ ذہانت اور ذکاوت، تدبر، بصیرت، فراست، فہم اور فکر میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ مولانا ظفر علی خان نے ان کے بارے میں فرمایا تھا:

جہانِ اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہوگئی
ہے تجھ کو اس میں جستجو تو پوچھ ابوالکلام سے

مولانا آزاد کی شخصیت دین، سیاست، وطنیت اور جدت و قدامت میں نہایت حسین امتزاج کی حامل تھی۔ ان کی نظر بڑی حکیمانہ تھی۔ ایک طرف وہ بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ اور اپنی تہذیبی روایات کے امین و محافظ تھے تو دوسری طرف ایک بہت بڑے سیاستدان تھے۔ اور ان کا شمار اُس عہد کے نامور مدبرین، مفکرین میں ہوتا تھا، انہوں نے برصغیر کی سیاست پر گہرے نقوش چھوڑے۔

مولانا ابوالکلام نظم و نثر اور خطابت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کی نثر کی برصغیر (پاک و ہند) میں مثال نہیں ملتی۔ مولانا حسرت موہانی آپ کی نثر کے بارے میں

فرماتے ہیں:

جب سے دیکھی ہے ابو الکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

خطابت میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کی خطابت کا شہرہ پورے برصغیر میں تھا حسرت فرماتے ہیں:

سب ہو گئے خاموش حسرت
گویا ہیں ابو الکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات سیاسی کے تین دور تھے:

پہلا دور ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۵ء تک کا ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۸ سے ۲۸ سال کی تھی۔ اور وہ اس دور میں حب الوطنی، عالم گیر اخوت واتحاد اسلامی اور معقولیت پر مبنی احیاء اسلام کے قائل تھے۔

مولانا عبدالمجید سوہدروی مرحوم لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد جنہوں نے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات وتحریکات اور آپ کے خلفاء کے مجاہدات ومجادلات کا خوب مطالعہ کیا تھا اوائل عمر ہی میں یہ سپرٹ، اور مایہ جذبہ اپنے دل میں رکھتے تھے کہ جیسے بھی ممکن ہو، ہندوستان کو جو ہزار بارہ سو سال سے مسلمانوں کا وطن اور دول اسلامیہ کا ایک ٹکڑا بن چکا تھا۔ انگریز کی غلامی سے آزاد کرا کے مسلمانان ہند کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے تاج وتخت کو پھر حاصل کر سکیں اور حکومت کرنے کے لائق ہو جائیں۔ اسی جذبہ، اسی جوش، اسی ولولہ کے ساتھ انہوں نے اپنی سیاست کا آغاز کیا، اور اس وقت کیا جبکہ ان کی ابھی مسیں ہی بھیگ رہی تھیں۔ جوانی کا تازہ خون، شباب کی سرمستیاں اور رنگینیاں عام طور پر انسان کی نوجوانی کو غلط راستے پر لگا دیتی ہیں۔ لیکن آزاد کی نوجوانی کچھ عجیب قسم کی تھی کہ اس کی بہار نے انہیں سیاسی زندگی میں الجھا دیا۔ ادھر ان کا شباب جوش میں آکر اُبھرا،

ادھر وہ دست وگلو میں پھولوں کے ہار اور گجرے پہننے کی بجائے ، فولاد کی ہتھکڑیوں ، بیڑیوں اور طوقوں سے روشناس کرائے گئے ۔عوام کا جوبن تفریح گاہوں اور عشرت کدوں میں کٹ رہا تھا ۔ اور آزاد کی جوانی جیل کی سلاخوں سے کھیل رہی تھی ۔ اس لیے اور صرف اس لیے کہ ملت اسلامیہ ہند جس حریت وآزادی سے محروم کی گئی ہے اس کو انگریز سے چھین کر پھر سے اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے ۔ اور خدا کے اس قانون کا ڈھنڈورا چاردانگ عالم میں پیٹا جائے کہ مسلمان آزاد رہنے کے لیے پیدا ہوا ہے ۔ آزادی اس کا پیدائشی حق ہے، وہ باطل سے نہ کبھی دبا ہے ۔ اور نہ دبے گا اور حق پرستاران اسلام نے نہ کبھی کفار کی غلامی قبول کی ہے؛ نہ کبھی قبول کریں گے ۔"

دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزادمنش انسانوں کے
یا تختہ جگہ آزادی کی ، یا تخت مقام آزادی کا

(سیرت آزاد، ص:۸۱)

اس کے بعد مولانا سوہدروی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

"مولانا ابوالکلام آزاد نے انگریزی حکومت اور اس کے جور وتشدد کے خلاف ۱۹۱۰ء کے قریب آواز اُٹھائی اور اسی سال اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن ایک غیر ملکی جابر وظالم حکومت اور اس کی قہرمانیوں سے ٹکر لینا اور ملک وملت کے پاؤں سے غلامی کی زنجیریں کاٹنا تنہا مولانا آزاد کے بس کی بات نہ تھی ۔ وہ کہنے کو تو اس پر کمربستہ ہو گئے اور دل میں آزادی دلانے کا عزم صمیم بھی کر لیا لیکن جب تک ملک کے عام مسلمان ان کے ہمنوا نہ بنتے ، اور ان کے مشن کو کامیاب بنانے کے لیے جوش عمل نہ دکھاتے ۔ اس وقت تک کامیابی دشوار ہی نہیں ناممکن تھی ۔"

"پس مولانا آزاد نے سوچا کہ جب تک ہندوستان کے مسلمانوں کو بیدار نہ کیا جائے ، اور راستہ ہموار نہ کیا جائے ۔ اس وقت تک برٹش گورنمنٹ سے

مصروف بیکار ہونا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے اُنہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں علمائے ہند کو مخاطب کیا۔ انہوں نے وقت کی اہمیت و ضرورت بتائی۔ ان کو غیرت دلائی اور عظمت رفتہ کا احساس دلایا۔ کتاب و سنت کے بھولے ہوئے سبق یاد دلائے۔ اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا اور اپنے انہی مقاصد عظیمہ کو بروئے کار لانے کے لیے انہوں نے ۱۹۱۲ء میں ''الہلال'' اور اس کے بعد ''البلاغ'' ایسے روح پرور، ایمان افروز اور حریت بردار جرائد کو جاری فرمایا جنہوں نے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا۔''

(سیرت آزاد، ص:۸۲)

مولانا کی حیات سیاسی کا دوسرا دور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۳ء تک کا ہے۔ اس دور میں مولانا ۳۴ سے ۳۵ سال کے تھے۔ اور تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کے رہنما کی حیثیت سے اُبھرے تھے۔ پہلے دور میں مولانا اپریل ۱۹۱۶ء تا جنوری ۱۹۲۰ء رانچی میں نظر بند رہے تھے۔

مولانا امداد صابری لکھتے ہیں:

''اوائل جنوری ۱۹۲۰ء میں مولانا رانچی سے کلکتہ پہنچے۔ لیکن اس وقت تحریک خلافت کا آغاز ہو چکا تھا اور امرتسر میں خلافت کمیٹی کانگرس کے جلسوں نے ملک میں نئی سیاسی زندگی کے آثار پیدا کر دیے تھے۔ جمعیۃ علمائے ہند کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ اور طبقہ علماء میں بھی سیاسی زندگی کی سرگرمی پیدا ہوگئی تھی۔ حضرت مولانا نے چند دن کلکتہ میں قیام کر کے دہلی کا رخ کیا۔ جہاں امرتسر کے جلسوں میں شرکت کے بعد رہنمایان قوم جمع ہو رہے تھے۔ یہ جنوری ۱۹۲۰ء کے وسط کا واقعہ ہے۔''

(امام الہند از مولانا امداد صابری، ص:۱۴۰)

۲۸، فروری ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں بنگال پراونشل خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ مولانا کو اس کانفرنس کا صدر بنایا گیا۔ اور آپ نے اس کانفرنس میں معرکۃ آلاراء خطبہ صدارت ارشاد

فرمایا۔ خطبہ کا عنوان تھا ''مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب'' یہ خطبہ بڑا جامع، علمی اور معلوماتی تھا۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے اس خطبے پر نہ صرف دلنشیں تبصرہ فرمایا ہے بلکہ نہایت موثر الفاظ میں اس کا لب لباب بھی بیان کر دیا ہے۔

لکھتے ہیں:

(رانچی نظر بندی سے رہائی کے بعد) اوائل جنوری ۱۹۲۰ء میں (مولانا) کلکتہ پہنچے۔ ۸، ۹ فروری ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں خلافت کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ ہوا اور خود مولانا کو اس کانفرنس کا صدر چن لیا گیا۔ دو ماہ کی کم مدت میں گوناگوں مصروفیتوں کے باوصف اُنھوں نے خطبہ صدارت مرتب کیا جو دو سو صفحات پر مشتمل تھا، یہ پہلی کتاب تھی جس میں مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب کی شرعی حیثیت انتہائی تفصیل سے مدلل اور دلنشیں انداز میں واضح کی گئی ہے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کے سامنے تفصیل سے لائحہ عمل پیش کر دیا۔ یہیں سے اس شہرہ آفاق تحریک کی بنیاد پڑی جس نے یہاں ''ترکِ موالات'' اور ''لاتعاون'' کا نام پایا۔ واضح رہے کہ کانگرس کی لا تعاون کی قرارداد اگست ۱۹۲۰ء میں منظور کی گئی تھی۔ اور مولانا اس تحریک سے چھ مہینے پیشتر خطبہ ارشاد فرما چکے تھے۔ اس وقت تک لوگوں کے کان بھی لا تعاون اور ترک موالات کے ناموں سے آشنا نہ ہوئے تھے۔

(بحوالہ امام الہند از مولانا امداد صابری، ص: ۱۴۳)

مولانا کا یہ خطبہ تحریک ترک موالات میں مسلمانوں کے لیے روشنی کی قندیل بنا رہا۔ اس خطبہ سے خلافت اور جزیرۃ العرب کے تقدس کے لیے شرعی، عقلی اور سیاسی دلیلیں حاصل کی گئیں۔ اسی خطبہ سے برصغیر کے مسلمانوں نے اپنا آئندہ لائحہ عمل مرتب کیا۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو ایک خاص شرف عطا کیا تھا۔ دینی حقائق کو زمانہ حال کی زبان میں اس طرح بیان فرماتے تھے کہ دل میں پیوست ہو جاتے تھے۔ مولانا نے اس خطبہ میں ایک مشہور حدیث نبوی ﷺ کی ایسے دلنشیں انداز میں تشریح فرمائی کہ سامعین عش عش کر اُٹھے، حدیث یہ ہے۔ جس میں رسول اللہ ﷺ نے امت کو پانچ باتوں کا حکم دیا۔ یعنی جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور جہاد۔

۱۹۲۰ء ، ۱۹۲۱ء کی رہائی کا پورا زمانہ تحریک خلافت اور ترک موالات کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں بسر ہوا تھا اور شب و روز کے اسفار، اجلاس اور کانفرنسوں میں شرکت میں صرف ہوتا تھا۔ تصنیف و تالیف کی طرف کوئی توجہ نہ تھی۔ مولانا نے پورے ہندوستان کا سفر کیا۔ بنگال ، بہار ، سرحد ، پنجاب سندھ کے سیکڑوں شہروں کا سفر کیا۔ اجلاسوں سے خطاب کیا، بعض اجلاسوں کی صدارت کی۔ بادشاہی مسجد لاہور میں خطبہ جمعہ کے بعد وہ مشہور ولولہ انگیز تقریر کی جس کو سول اینڈ ملٹری گزٹ نے ''صحن مسجد میں باغیانہ لکچر قرار دیا۔ ۲۵ ، ۲۶ جون کو بہار میں جمعیۃ العلماء کے اجلاسوں کی صدارت فرمائی۔ ۲۰ ، ۲۶ اگست آگرہ میں مجلس خلافت کو مخاطب کیا۔ ۵ ، اکتوبر کو بمبئی میں کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کی۔ ۱۸، ۱۹ نومبر کو لاہور میں جمعیۃ العلماء کے اجلاس کی صدارت کی۔ اس کے بعد آپ بمبئی تشریف لے گئے۔ اور کچھ دن بعد آپ بمبئی سے کلکتہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ حکومت ان کو گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو آپ کو گرفتار کرلیا گیا۔ اور مولانا کو ایک سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ اس گرفتاری کے مقدمہ میں جو تحریری بیان مولانا نے دیا تھا وہ ''قول فیصل'' کے نام سے مشہور ہوا۔ گرفتاری پر مولانا نے عوام سے کہا تھا کہ:

> ہماری فتح مندی کی تمام بنیاد چار سچائیوں پر ہے۔ اور میں اس وقت ملک کے ہر باشندے کو ان ہی کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ (۱) ہندو مسلمان کا کامل اتفاق (۲) امن (۳) نظم (۴) قربانی اور اس پر استقامت۔

(ابوالکلام آزاد، از رشید الدین خاں ، ص ۵۳)

مولانا آزاد کی حیات سیاسی کا تیسرا دور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۵۸ء تک کا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں مولانا نے اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی، اس دور میں وہ متحدہ ہندوستانی قومیت کے علمبردار اور قومی قیادت کے صف اول کے رہنماؤں میں شامل رہے۔

۶ جنوری ۱۹۲۳ء کو مولانا جیل سے رہا ہوئے۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۲۳ء آل انڈیا نیشنل کانگرس منعقدہ دہلی کی صدارت کی۔ اس خطبہ میں آپ نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ مولانا نے فرمایا کہ:

''ہماری جدوجہد کی بنیاد کا کیا حال ہے۔ میرا اشارہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف ہے۔ یہ ہماری تعمیرات کی پہلی بنیاد ہے جس کے بغیر نہ صرف ہندوستان کی آزادی بلکہ ہندوستان کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ہوسکتی ہیں، محض خواب وخیال ہیں، صرف یہی نہیں ہے کہ اس کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی، بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتے۔ آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں اس سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ کیونکہ سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔''

(خطباتِ آزاد، طبع دہلی ۱۹۷۴ء، ص۲۰۴)

۲۹، دسمبر ۱۹۲۵ء کو آل انڈیا خلافت کانفرنس کے اجلاس کان پور کی صدارت فرمائی۔ اور بڑا جامع اور مدلل خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں آپ نے عالم اسلامی کے تغیرات، ملک کے داخلی تغیرات، مسلمانان ہند کے حالات، مرکزی خلافت کمیٹی اور اس کا نظام، اور موتمر حجاز جیسے عنوانات پر اظہارِ خیال فرمایا۔

مولانا نے اپنے خطبہ میں فرمایا:

''خلافت کمیٹی جس وقت قائم ہوئی تھی، تو دو مقصد اس کے پیش نظر تھے۔ مسئلہ خلافت کے لیے ملک میں عام جدوجہد جاری رکھنا اور مسلمانوں میں خصوصیت کے ساتھ ملکی آزادی کے لیے سرگرمی پیدا کرنا۔ اس آخری مقصد کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ اس راہ میں مسلمانوں کے قدم بہت پیچھے تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ خصوصیت کے ساتھ ایک جماعت ان میں سرگرمی پیدا کرتی رہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جہاں تک مسئلہ خلافت کا تعلق ہے، کوئی ایسی

جدوجہد موجود نہیں ہے جس کے لیے ملک میں ایک مستقل نظام کی ضرورت ہو۔ اور جو مسائل درپیش ہیں ان کے لیے مرکزی کمیٹی کافی ہے۔ باقی رہا دوسرا مقصد تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے اب ضروری نہیں کہ خلافت کمیٹی کے نام سے تمام صوبوں اور ضلعوں میں کوئی نظام رکھا جائے۔"

(خطبات آزاد، طبع دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۲۲۶)

مولانا نے جب آل انڈیا کانگرس میں شمولیت کی تو آخر تک اس جماعت سے وابستہ رہے اور ساری زندگی اس جماعت کے حفظ و بقا میں گزار دی۔ جیسا کہ رشید الدین خاں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"مولانا اسی ایقان پر ثابت قدمی سے عمر بھر جمے رہے اور استقامت کا یہی نمونہ ان کی زندگی کا اور ہندوستان جیسے مختلف النوع ملک کی صحیح اور جامع حب الوطنی کا زریں کارنامہ ہے۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۵۸ء تک کے ۳۵ سال انہوں نے برابر کانگرس کی صف اول کی قیادت میں بسر کیے۔"

(ابوالکلام آزاد، رشید الدین خاں، ص:۶۱)

۹۳۹ ء میں مولانا آل انڈیا کانگرس کے قائم مقام صدر بنا دیے گئے اور ایک سال بعد ۱۹۴۰ء میں مستقل صدر منتخب ہوئے۔ اور ۱۹۴۶ء تک آپ صدارت کے عہدہ پر فائز رہے۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں مولانا نے آل انڈیا نیشنل کانگرس کے اجلاس رام گڑھ کی صدارت کی۔ اور اس میں ایک جامع اور بلیغ خطبہ صدارت ارشاد فرمایا۔ جس میں آپ نے مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تاریخ اور اپنے مسلمان ہونے پر بڑے جامع الفاظ میں اظہارِ خیال کیا۔ (اس خطبہ کا ایک اقتباس آپ باب نمبر ۳ مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت میں پڑھ آئے ہیں۔)

مولانا نے اس خطبہ میں واشگاف الفاظ میں فرمایا:

"میں مسلمان ہوں۔ اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام

کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں ۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں ! اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے، اور میرا فرض ہے کہ میں اس کی حفاظت کروں ۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں ۔ اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے ۔''

(خطبات آزاد، طبع دہلی ۱۹۷۴ء، ص ۲۹۷)

گویا مولانا آزاد کے نزدیک ہندوستان کی متحدہ قومیت اور مسلمانوں کی انفرادیت میں کوئی تضاد نہیں تھا بلکہ وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتی تھیں ۔ یہی وہ نکتہ ہے جو مولانا آزاد کو اپنے بہت سے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے ۔

۹ راگست ۱۹۴۲ء کو مولانا کو ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک کی منظوری کے بعد گرفتار کرلیا گیا اور قلعہ احمد نگر میں نظر بند کیا گیا اور ۱۵، جون ۱۹۴۵ء کو آپ کو رہا کیا گیا ۔

مولانا کے سیاسی افکار پر ایک نظر :

مولانا ابوالکلام اپنے پہلے سیاسی دور (۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۵ء) میں صحافی مدیر، انشاء پرداز اور خطیب کی حیثیت سے اُبھرتے ہیں ۔ اس دور میں ان کے تین مقاصد تھے ۔

(۱) احیائے اسلام (۲) ترویج عالمگیر اخوت واتحاد اسلامی (۳) مسلم حب الوطنی ۔

لکھتے ہیں :

مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے تمام کاموں کی بنیاد تعلیم الٰہی پر رکھیں نہ کہ محض کسی ترقی یافتہ قوم کی تقلید واتباع پر یا محض اخذ تحصیل تمدن وسیاست ووطنیت پر ۔

(الہلال، یکم جولائی ۱۹۱۴ء)

پھر لکھتے ہیں کہ :

''اسلام کا عقیدہ توحید، انسانی حریت وآزادی کا سرچشمہ حقیقی ہے کیونکہ جو سر صرف خدا کے آگے جھکے گا ممکن نہیں کہ وہ انسان اور انسانوں کے غرور

بادشاہت وحکومت کے آگے ذلت عبودیت سے سربسجود ہو۔ ملک وانسانیت کی خدمت آزادانہ حیات سیاسی وملی کا حصول، جدوجہد حریت اور خودمختارانہ حکومت کے حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ مساعی ۔ یہ تمام مقاصد صالحہ اگر دوسری قوموں کو بربنائے جذبۂ قومیت ووطنیت عزیز ہیں تو ہر قائل کلمۂ توحید کو مذہباً ودیناً محبوب ہونا چاہئیں ۔''

(الہلال ،۴ فروری ۱۹۱۴ء)

مولانا اعلان کرتے ہیں کہ:

''ہمارے عقیدے میں ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہے ۔ ایک کفر صریح ہے ۔ اور پالیٹکس بھی اسی میں داخل ہے ۔ الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے ۔ خواہ تعلیمی مسائل ہوں، خواہ تمدنی وسیاسی ہوں! خواہ اور کچھ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔''

(الہلال، ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء)

دوسرا سیاسی دور (۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۳ء)، مولانا رانچی کی نظر بندی سے رہا ہوئے تھے۔ اور برصغیر کی سیاست میں ان کا عمل دخل شروع ہو چکا تھا۔ اور مولانا محدود مسلم حب الوطنی کے دائرہ سے نکل کر مضبوط اور متحدہ ہندوستانی قومیت کے وسیع میدان میں ایک اٹل اور فیصلہ کن انداز سے داخل ہو گئے ۔

رشید الدین خاں لکھتے ہیں کہ:

''یہ تین سال کا مختصر دور (متحدہ حب الوطنی سے متحدہ قومیت کے مسلک تک) مولانا آزاد تحریک خلافت کی قیادت، عوامی سیاست کے تجربہ اور سیاسی شعور کی بالیدگی کے راستہ سے پہنچے ۔ ہندوستان کی سیاست میں خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کی، عوامی سیاست میں، تحریک خلافت نے ایک اہم متحرک رول ادا

کیا ہے۔ پہلی مرتبہ انگریز سامراج کے خلاف عام مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کیا ان کی جدوجہد کے بین الاقوامی اور دیگر برادران وطن کے ساتھ تعلق خاطر کو واضح کیا گیا۔ اور اس طرح ملک میں پہلی بار ایک رواں دواں، موثر اور مضبوط مخالف سامراج محاذ قائم کیا گیا تھا۔ یہی چیز تحریک خلافت کی محرک بنی، مسلمان عوام نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں شمولیت کی اور یہی اس کا مثبت پہلو تھا کہ اس نے مسلمانوں میں سیاسی احساس بیدار کیا۔ سامراج کے خلاف عوامی اتحاد اور سنگھٹن کو مضبوط کیا۔ مسلمانوں کے مختلف سیاسی طبقوں نے اس میں شرکت کی، گاؤں گاؤں میں ایک نئی لہر دوڑ گئی، دیکھتے دیکھتے مسلمان سیاست امیروں، جاگیرداروں اور متمول طبقوں کے محلات اور حویلیوں سے اُتر کر بازاروں، کارخانوں، کھیتوں اور مدرسوں میں پہنچ گئی۔ اب اس کی گزرگاہ صرف بڑے بڑے شہروں تک محدود نہیں رہی۔ وہ ملک کے مختلف قصبوں، دیہاتوں اور تعلیمی اور ثقافتی مراکز میں پہنچ گئی۔ تحریک خلافت کے اس عظیم الشان کارنامہ میں مولانا کی قیادت اور فکر سیاسی کو بڑا دخل تھا، انہوں نے اس نئے شعور کو نظریاتی زبان دی۔ اور حب الوطنی سے اس کا دینی رشتہ جوڑ کر سیاست کے ایک نئے اور موثر اسلوب کو اُبھارا۔ تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کے مشترکہ مضمرات کو عوام تک پہنچانے میں مولانا آزاد کے علم، ان کے قلم، ان کی جادو بیانی، ان کے کردار، اور حکمت عملی اور ان کے نفس انقلابی کو بڑا دخل رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تحریک خلافت کو قومی تحریک عدم تعاون اور ترک موالات کے ساتھ مربوط کرنے اور ہندو مسلم اتحاد کو اس کی بنیادی کڑی بنانے میں پانچ نام جلی حروف سے قرطاس تاریخ میں لکھے گئے اور یہ نام ہیں، گاندھی جی، مولانا آزاد، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے۔ اس حکمت عملی سے ملک میں ایک ایسا طوفان اُٹھا کہ اس نے خاص و عام میں ایک نئی روح پھونک دی۔"

(ابوالکلام آزاد، از رشید الدین خاں، ص: ۳۴، ۳۵)

مولانا کے سیاسی افکار کی تیسری اور آخری منزل (۱۹۲۳ء تا ۱۹۵۸ء) تک ہے۔ (۱۹۵۸ء میں مولانا اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے) جب وہ ۶ رجنوری ۱۹۲۳ء کو ایک سال کے ایام اسیری گزار کر رہا کر دیے گئے۔ جب وہ رہا ہوئے تو ملک میں ایک سیاسی ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ سول نافرمانی اور ترک موالات کا دور دورہ تھا۔

مارچ ۱۹۴۰ء کے اجلاس کانگرس منعقدہ رام گڑھ میں اپنے خطبۂ صدارت میں ''مسلمان اور متحدہ قومیت'' کے عنوان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسانوں کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں، اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی، پھر ایک کے بعد ایک قافلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے یہاں بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملاپ تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔

ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے، جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو، ہماری بولیاں الگ الگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے، ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ

تھے، مگر اُنہوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا، یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے۔ اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے۔

ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بنا کرتے ہیں۔ اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابل تقسیم قوم بن چکے ہیں۔''

(خطبات آزاد، طبع دہلی ۱۹۷۴ء، ص ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰)

مولانا آزاد اور پاکستان:

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔ ان کی ذہانت و ذکاوت، فہم و بصیرت اور فکر و تدبر سے کسی کو انکار نہیں۔ مولانا انسان تھے۔ اُنہیں فرشتہ اور معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں رہا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ہندوستان کی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔ یہ ان کی اپنی سوچ تھی۔ لیکن جب ملک تقسیم ہو گیا تو انہوں نے پھر اپنی زندگی کے آخری ایام تک اس نوزائیدہ مملکت کی مخالفت نہیں کی۔ بلکہ ان کی خواہش رہی کہ اب پاکستان بن گیا ہے۔ اس کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے انہوں نے فرمایا تھا کہ اگر پاکستان نہ رہا تو پھر ہندوستان کے مسلمانوں کی جو بری حالت ہو گی وہ بیان سے باہر ہے۔

ذیل میں چند معروف اہل قلم کی تحریریں درج کی جا رہی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد مولانا آزاد نے ہمیشہ اس خواہش کا اظہار کیا کہ پاکستان خوشحال اور مستحکم ہو۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی:

یہ بات کون نہیں جانتا کہ مولانا آزاد کو تحریک پاکستان سے اختلاف تھا لیکن میں اپنی

ذاتی اور عینی شہادت کی بنا پر کہتا ہوں کہ ملک کی تقسیم اور آزادی کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مولانا آزاد نے لنچ کے لیے چند سر برآوردہ مسلمان رہنماؤں کو مدعو کیا، میں تو ان سب سے چھوٹا تھا اور ان حضرات کے ساتھ ننھی ہوتا تھا۔ ان حضرات میں قابل ذکر حضرات ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ہیں۔ اور بھی چند اکابر اس لنچ میں شریک ہوئے جن کے نام اس وقت ذہن میں مستحضر نہیں ہیں۔ بہر حال میں بھی ان مدعو حضرات میں شامل تھا۔

لنچ سے فارغ ہو کر مولانا آزاد نے فرمایا کہ میں نے آپ حضرات کو اس لیے بلایا ہے کہ میں آپ حضرات سے چند خاص باتیں کرنی چاہتا ہوں۔ سب نے کہا، ضرور ارشاد فرمایئے۔ مولانا نے فرمایا:

> ''پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارا نظریہ پاکستان کے خلاف تھا۔ وہ اپنی جگہ تھا۔ اس کے لیے ہمارے پاس ٹھوس وجوہ اور قوی دلائل تھے۔ لیکن اب جب کہ ملک تقسیم ہو گیا ہے تو ہم کو پاکستان کے کسی لیڈر یا کسی شخص کے متعلق اپنے دل میں کوئی رنجش اور کدورت نہیں رکھنی چاہیے۔ میرے بھائی! وقت کی ایک سیاست تھی، جس سیاست کو کامیاب ہونا تھا، وہ ہو گئی۔''

اس کے بعد فرمایا:

> ''دوسری بات یہ ہے کہ ''اب پاکستان کے لیے کسی طرح کی بدخواہی کرنا یا اس کے لیے کسی طرح کی بداندیشی کرنا نہ صرف ہمارے ملک ہندوستان کے لیے مضر ہے، بلکہ خاص طور پر ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے بھی انتہائی مضر، مہلک اور خطرناک ہے، اس واسطے کہ اگر پاکستان بھی ختم ہو گیا یا پاکستان پر کوئی زوال آیا تو پھر ہندوستان کے مسلمان منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہیں گے۔ اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ برصغیر میں مسلمانوں کا مستقبل انتہائی تاریک ہو جائے گا۔ ان کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ مولانا نے صاف لفظوں میں

کہا کہ پاکستان کے ساتھ ہمارا بالکل دوسرا رویہ ہونا چاہیے اور ہم سب کو دعا کرنی چاہیے اور تمنا کرنی چاہیے کہ پاکستان پھلے پھولے اور مستحکم ہو۔"

سیاسی اعتبار سے ہماری حکومت بھی کہتی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان ایک ریجن (Region) کے، ایک ہی خطہ کے دو ملک ہیں ۔اس ریجن (Region) کی سلامتی اور خوشحالی اسی پر موقوف ہے کہ دونوں ملک اچھے پڑوسیوں کی طرح مل جل کر رہیں، اور دونوں میں خیرسگالی اور خیراندیشی کے جذبات پروان چڑھیں۔

بھارت کی حکومت کی طرف سے تو یہ ایک سیاسی بات بھی ہوسکتی تھی لیکن میں مولانا آزاد کے متعلق آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ تنہائیوں میں ہم سے بڑی شدت اور خلوص کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ اب پاکستان سے کوئی اختلاف ہمیں نہیں کرنا چاہیے۔

(مولانا ابوالکلام آزاد، از سعید احمد اکبرآبادی، ص ۴۶ تا ۴۸)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری:

"قیام پاکستان کے بارے میں ان کی رائے ڈھکی چھپی نہیں۔ وہ اس کے قیام کے خلاف تھے، وہ پاکستان اسکیم کو ہندوستان کے کل نوکروڑ مسلمانوں کے مسئلے کا صحیح حل نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن جب ملکی اور کل قومی سطح پر اس پر سب کا اتفاق ہو گیا اور قرار پا گیا کہ ملک کی تقسیم ہو گی تو پھر انہوں نے اپنی مخالفت ترک کر دی تو پھر کبھی اگر تذکرہ آیا بھی تو تاریخ کے واقعے اور اس سے اپنے عدم اتفاق اور اپنی رائے کی صحت پر بعد کے واقعات سے استدلال کا آیا۔ انہوں نے کبھی پاکستان کے ختم ہو جانے، اسے کمزور کرنے اور اس کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرنے، اس کے انتشار کو بڑھانے کی خواہش نہیں کی۔ بلکہ اس کے استحکام، اس میں جمہوریت کے فروغ، اس کے مختلف طبقوں اور فرقوں میں مفاہمت اور ہندوستان سے اس کے خوش گوار تعلقات کے نہ صرف آرزومند رہے بلکہ اس کے لیے انہوں نے بہترین کوششیں بھی کیں۔"

(آثار ونقوش، ص:۲۹)

مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق ایک تاریخی واقعہ

میاں محمد شفیع:

شیخ محمد اشرف لاہور کی ایک معروف شخصیت ہیں وہ برصغیر میں کتابیں چھاپنے کے میدان میں ہندوؤں کے مقابلے میں بھی ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد انہوں نے اسلام پر بے شمار قابل قدر کتابیں شائع کیں۔ وہ پاکستان میں اہلحدیث تنظیم میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک حالیہ ملاقات میں مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے سے ایک واقعہ سنایا جسے میں ایک تاریخی واقعہ سمجھ کر ریکارڈ پر لانا ضروری سمجھتا ہوں۔

شیخ محمد اشرف نے فرمایا: یہ اس صدی کے چوتھے عشرے کے آخری مہینے تھے جب کانگرس کے مقابلے میں مسلم لیگ کی طاقت روز افزوں زوروں پر تھی۔ میں پکا کانگرسی تھا۔ اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو نہ صرف مذہبی طور پر بلکہ سیاسی طور پر بھی دل سے اپنا پیشوا تسلیم کرتا تھا۔ حضرت مولانا ان دنوں انڈین نیشنل کانگرس کے صدر تھے۔ مجھے قدرتی طور پر مسلم لیگ کی اس بڑھتی ہوئی مقبولیت پر پریشانی تھی اور میں دل میں طرح طرح کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ اس اثنا میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا دہلی سے پشاور تشریف لے جا رہے ہیں۔ میں نے اس موقع پر غنیمت سمجھ کر مولانا سے لاہور میں ریلوے اسٹیشن پر ملاقات کا پروگرام بنایا۔

چنانچہ جس روز مولانا کی ٹرین دہلی سے لاہور پہنچنے والی تھی۔ میں اپنے دو ہم خیال دوستوں مولانا خدا بخش (جن کا اب انتقال ہو چکا ہے) اور خواجہ عبدالوحید (جو خدا کے فضل و کرم سے کراچی میں زندہ سلامت ہیں) کو ساتھ لے کر ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو وہاں مولانا سے ملاقات کے لیے امیدواروں کا بڑا اژدھام پایا۔ اس لیے ہم تینوں نے ریلوے ٹکٹ خرید لیے تاکہ مولانا کے ساتھ ہی ٹرین پر سوار ہو جائیں؛ اور جب موقع پائیں تو مولانا کے ساتھ مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کے مسئلہ پر تبادلہ خیالات کریں گے۔

یہ موقع ہمیں وزیر آباد گزر جانے کے بعد ملا: جب ان سے ملاقات کرنے والے اپنی اپنی کہہ سن چکے تو میں نے مولانا سے عرض کیا کہ:

''پنجاب مسلم لیگ کا زور دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس سے مختلف خیال کے مسلمانوں کے کام کرنے کے راستے میں بے شمار دقتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس لیے جب تک مسلم لیگ کے اس بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو ختم کرنے کے لیے موثر تدابیر اختیار نہیں کی جائیں گی، پنجاب میں کانگرس اور اس کے ہم نواؤں کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔''

مولانا نے ہماری باتیں بڑے اطمینان وسکون کے ساتھ سننے کے بعد فرمایا:

''بھائی مسلم لیگ کو کمزور کرنا دانشمندوں کی بات نہیں۔ بلکہ یاد رکھو جب تک مسلم لیگ طاقت نہیں پکڑے گی، اس وقت تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی مفاہمت کا راستہ ہموار نہیں ہو سکتا۔ مسلم لیگ کو مضبوط ہونے دو تاکہ مسلمانوں کی طرف سے کوئی جماعت مضبوطی کے ساتھ کانگرس سے بات کر سکے۔''

شیخ محمد اشرف صاحب فرماتے ہیں کہ:

''مولانا آزاد کے یہ ارشادات سن کر ہم پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ہم تو ان سے اس اُمید پر بات کرنے گئے تھے کہ وہ مسلم لیگ کے صدر کو جلی کٹی سنا کر ہمیں پنجاب مسلم لیگ سے لڑنے اور کانگرس کو مضبوط بنانے کے لیے کوئی موثر منصوبہ بتائیں گے۔ لیکن مولانا نے مسلم لیگ کو مضبوط بنانے کی ضرورت پر وعظ فرما کر بظاہر الٹی گنگا بہادی ...... لیکن شیخ صاحب کی بات درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ مولانا مرحوم پاکستان کے بعد بھی اپنے ملنے والے پاکستانی مسلمانوں کو یہی مشورہ دیا کرتے تھے کہ اب پاکستان بن گیا ہے، تو اسے مضبوط بناؤ۔ یہی ہماری بھی حفاظت کا ضامن ہوگا۔''

(نوائے وقت ۱۶، نومبر ۱۹۷۶ء بحوالہ ابوالکلام آزاد از افضل حق قرشی، صفحہ ۶۸۶، ۶۸۷)

(افسوس کہ شیخ محمد اشرف اور میاں محمد شفیع دونوں اب اس دنیائے فانی سے رحلت کر چکے ہیں۔)

ڈاکٹر محمد باقر:

مولانا ابوالکلام آزاد اور پاکستان

۱۹۴۷ء کے آغاز (غالباً مئی کے اواخر) میں جس دن تقسیم ہند کا اعلان ہوا میں اور مولانا ابوالکلام آزاد شملے میں تھے۔ مولانا اس وقت حکومت ہند میں وزیر تعلیم تھے اور میں صوبہ دہلی کے محکمہ تعلیم کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا۔ اس اعتبار سے شملے کی بعض درس گاہیں انتظامی طور پر میری تحویل میں تھیں۔ اور میں اس زمانے میں ان درس گاہوں کا معائنہ کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ مولانا کا دفتر لڈلو کاسل (Ludlow Castle) میں تھا۔ اور وہ بھی سرکاری دورے پر شملے تشریف لائے ہوئے تھے۔ چونکہ حکومت ہند کے سرکاری ملازموں کو شملے میں رعایتی قیمت پر گرینڈ ہوٹل میں رکھا جاتا تھا۔ اور گرینڈ ہوٹل میں ہر قسم کی درجہ بدرجہ رہائشی سہولتیں مہیا تھیں۔ اس لیے وزیر سے لے کر میرے جیسے چھوٹے افسر سب گرینڈ ہوٹل میں ہی قیام کرتے تھے۔ اور کھانے کے اوقات میں سب لوگ اطاق نہار میں جمع ہوتے۔ کیونکہ اپنے کمرے میں کھانا منگوانے کے لیے فاضل قیمت ادا کرنا پڑتی تھی۔

جس صبح کو اخبارات میں تاسیس پاکستان کا اعلان ہوا۔ اس روز جب ہم ناشتے پر بیٹھے تو میری اہلیہ نے مولانا کو اپنی میز پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر مجھے یاد دلایا۔ آپ کہہ رہے تھے کہ میں آج کل مولانا سے بات کروں گا۔ وہ دیکھیے، وہ تشریف رکھتے ہیں۔ کھانے کے کمرے میں ہم سب کی نشستیں مقرر تھیں، اور مولانا ہمیشہ ایک کونے میں بیٹھا کرتے تھے۔ میں اُٹھ

کر ان کے پاس چلا گیا۔ سلام عرض کیا، اور پھر صبح کی خبر چھیڑ کر کہا، حضور میں آپ کی خدمت میں مشورے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ فوراً فرمایا۔ ''میاں! گذشتہ چند مہینوں کی ملاقاتوں کی وجہ سے میں آپ کے خیالات اور عقائد سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ اب پاکستان بن گیا ہے۔ پاکستان کو آپ جیسے آدمیوں کی ضرورت ہے اس لیے آپ کو پاکستان جانا چاہیے۔''

میں شکریہ ادا کر کے اپنی میز پر چلا آیا۔ اور اہلیہ سے ماجرا بیان کیا، وہ حیران ہو کر کہنے لگی کہ یہ مولانا کی رائے ہے۔

(ابوالکلام آزاد، از افضل حق قرشی، ص: ۲۹۴)

باب نمبر ۱۳

مولانا ابوالکلام آزاد کے ایام اسیری

جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا ایک ایسی روایت ہے جس سے مسلمانوں کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ علمائے سلف میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ وغیرہم نے اپنے اپنے دور میں حکومت وقت کے سامنے کلمہ حق کہنے میں جو مصائب و آلام برداشت کیے۔ اس سے تاریخ اسلام سے واقفیت رکھنے والا ہر طالب علم بخوبی واقف ہے۔ استقامت و عزیمت اور دعوتِ حق میں علمائے اسلام نے جو خدمات انجام دیں اور قربانیاں پیش کیں وہ مسلمان قوم کے علاوہ کسی دوسری قوم نے پیش نہیں کیں۔

برصغیر میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جن علماء کو تختہ دار پر لٹکایا گیا ان میں استقامت کی ایسی تصویریں بھی تھیں کہ عدالتوں نے ان کی سزائے موت کو صرف اس لیے عمر قید میں تبدیل کیا کہ وہ لوگ شہادت کو عزیز رکھتے تھے۔ علمائے صادق پور نے اس سلسلہ میں جو کردار ادا کیا اس کی نظیر برصغیر کی تاریخ میں مشکل ہی ملے گی۔ شورش کاشمیری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

> ''علمائے صادق پور کے مقدمات عدالتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کلمہ حق کہنے کی ایک ایسی نظیر تھے کہ مادر گیتی اس قسم کے انسان شاذ ہی جنتی ہے۔''

(ابوالکلام آزاد، ص: ۲۶۳)

برصغیر میں تین مسلمان لیڈروں نے برطانوی سامراج کے خلاف کلمۂ حق کہنے کا آوازہ بلند کیا۔ اور یہ تھے مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، اور مولانا ابوالکلام آزاد۔ ان تینوں نے ایک نئی انقلابی صحافت کا آغاز کیا۔

سب سے پہلے مولانا ظفر علی خاں نے ''زمیندار'' کے ذریعہ۔ ان کے بعد مولانا محمد علی

جوہر نے ''کامریڈ'' کے ذریعہ اور آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' کے ذریعہ برطانوی سامراج کے خلاف کلمہ حق بلند کیا۔ اور تحریک لاتعاون شروع کی۔ چنانچہ حکومت وقت نے پہلے مولانا ظفر علی خاں کو جیل بھیجا پھر مولانا محمد علی کو اور پھر مولانا ابوالکلام کو۔

رانچی کی نظر بندی:

مولانا ابوالکلام آزاد کو پہلی بار ۱۹۱۶ء میں گرفتار کیا گیا۔ مولانا کا ایک شعر ہے:

یہ بھی قیدی ہو گیا آخر کمندِ زلف کا
لے اسیروں میں تیرے آزاد شامل ہو گیا

مولانا اپنی اسیری کے متعلق خود ہی ایک خط میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھتے ہیں:

''قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے۔ پہلا تجربہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا تھا۔ جب مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا۔ پھر ۱۹۲۱ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۰ء میں یکے بعد دیگرے یہی منزل پیش آتی رہی۔ اب پھر اُسی منزل کے لیے قافلہ پیما ہو کر عمر گزر رہی ہے:

بازی خواہم زسرگرم رہ بیہودہ را

یہاں پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدت شمار کی جائے تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ عمر کے ترپن (۵۳) سال جو گزر چکے ہیں۔ ان سے یہ مدت وضع کرتا ہوں تو ساتویں حصے کے قریب پڑتی ہے۔ گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانہ میں گزرا۔ توراۃ میں احکام عشرہ میں ایک حکم سبت کے لیے بھی تھا۔ یعنی ہفتہ کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس دن سمجھا جائے۔ اور اسلام نے بھی یہ تعطیل قائم رکھی، سو ہمارے حصہ میں بھی سبت کا دن آیا۔ مگر ہماری تعطیلیں اس طرح بسر ہوئیں، گویا خواجہ شیراز کے دستورالعمل پر کاربند رہے:

نہ گویمت کہ ہمہ سال مے پرستی کن
سہ ماہ مے خورد نہ ماہ پارسامی باش

وقت کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مناسبت پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے۔ اس پر نہیں کہ سات برس آٹھ مہینے قید و بند میں کیوں کٹے۔ اس پر کہ سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں ہوئے:

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کے گرفتار بود''

مولانا نے یہ خط ۱۱، اگست ۱۹۴۲ء کو لکھا تھا:

''اس کے بعد قید کے دو برس گیارہ مہینے اور گزر گئے اور مجموعی مدت سات برس آٹھ مہینے کی جگہ دس برس سات ماہ ہوگئی، اس اضافہ کے ساتھ کوئی شکوہ نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ اس کا افسوس ضرور ہے کہ وہ ساتویں حصہ کی مناسبت کی بات مختل ہوگئی۔ اور سبت کی تعطیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا۔''

(غبار خاطر طبع دہلی ۱۹۸۳ء، ص: ۳۳)

اس کے بعد مولانا لکھتے ہیں:

''وقت کے وہ حالات ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں ان میں اس ملک کے باشندوں کے لیے زندگی بسر کرنے کی دو ہی راہیں رہ گئی ہیں۔ بے حسی کی زندگی بسر کریں یا احساس حال کی، پہلی زندگی ہر حال میں اور ہر جگہ بسر کی جا سکتی ہے۔ مگر دوسری کے لیے قید کی کوٹھڑی کے سوا اور کہیں جگہ نہ نکل سکی۔ ہمارے سامنے بھی دو ہی راہیں کھلی تھیں۔ پہلی ہم اختیار نہیں کر سکتے تھے، ناچار دوسری اختیار کرنی پڑی:

رند ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نہ بود
لیک صنم بہ سجدہ درنا صیہ مشترک نخواست

زندگی میں جتنے جرم کیے اور ان کی سزائیں پائیں سوچتا ہوں تو ان سے کہیں زیادہ تعداد ان جرموں کی بھی ہے جو کہ نہ کر سکے اور جن کے کرنے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ یہاں کردہ جرموں کی سزائیں تو مل جاتی ہیں لیکن ناکردہ

جرموں کی حسرتوں کا صلہ کس سے مانگیں:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

۱۹۱۶ء میں جب یہ معاملہ پیش آیا تو مجھے پہلی مرتبہ موقع ملا کہ اپنی طبیعت کے تاثرات کا جائزہ لوں۔ اس وقت عمر کے صرف ۲۷ برس گزر رہے تھے۔ "الہلال"، "البلاغ" کے نام سے جاری تھا۔ دارالارشاد قائم ہو چکا تھا۔ زندگی کے گہری مشغولیتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ طرح طرح کی سرگرمیوں میں دل اٹکا ہوا اور علاقوں اور رابطوں کی گرانیوں سے بوجھل تھا۔ اچانک ایک دن دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہونا پڑا۔ اور مشغولیت کی ڈوبی ہوئی زندگی کی جگہ قید و بند کی تنہائی اور بے تعلقی اختیار کرنی پڑی۔ بظاہر اس ناگہانی انقلاب حال میں طبیعت کے لیے بڑی آزمائش ہونا تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہیں ہوئی۔ آباد گھر چھوڑا اور ایک ویرانہ میں جا بیٹھ رہا:

نقصان نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

مولانا نے اس پر حسب ذیل حاشیہ لکھا ہے:

"۷، اپریل ۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال کے ڈیفنس آرڈیننس کے تحت مجھے بنگال سے خارج کر دیا گیا تھا۔ میں رانچی گیا۔ اور شہر سے باہر مورا یادی میں مقیم ہو گیا۔ پھر کچھ دنوں بعد مرکزی حکومت نے وہیں قید کر دیا۔ اور اس کا سلسلہ ۱۹۲۰ء تک جاری رہا۔"

(غبار خاطر طبع دہلی ۱۹۸۳ء، ص ۳۴، ۳۵)

رانچی میں نظر بند ہونے سے مولانا کا باہر کی دنیا سے کسی قسم کا رابطہ ممکن نہ تھا۔ مگر مولانا نے اپنے عزائم کار کو تصنیف و تالیف تک محدود رکھا۔ مولانا لکھتے ہیں:

"اب میرے اختیار میں صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا۔ یعنی تصنیف و تالیف کا مشغلہ، نظر بندی کی انیس دفعات میں سے کوئی دفعہ بھی مجھے اس سے نہیں روکتی

تھی۔ میں نے اس پر قناعت کی، اتنا ہی نہیں بلکہ میں نے خیال کیا کہ زندگی کی تمام آزادیوں سے محروم ہونے پر بھی لکھنے پڑھنے کی آزادی سے محروم نہیں ہوں اور اس کے نتائج محفوظ ہیں۔ تو زندگی کی راحتوں میں سے کوئی راحت بھی مجھ سے الگ نہیں ہوئی۔ میں اس عالم میں پوری زندگی بسر کر دے سکتا ہوں۔ لیکن ابھی اس صورت حال کو تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ معلوم ہو گیا کہ اس گوشے میں بھی مجھے محرومی سے دوچار ہونا تھا۔''

(ترجمان القرآن، جلد اول، ص ۳۴)

رانچی میں نظر بندی کے دوران مولانا کو جو مشکلات پیش آئیں اور جن آزمائشوں سے گزرنا پڑا اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں کہ:

''نظر بندی کے احکام جس وقت نافذ کیے گئے تو میری قیام گاہ کی تلاشی بھی لی گئی تھی اور جس قدر کاغذات ملے تھے، افسران تفتیش نے اپنے قبضہ میں کر لیے تھے۔ انہی میں ترجمہ اور تفسیر کا مسودہ بھی تھا۔ لیکن جب معائنہ کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں کوئی چیز قابل اعتراض اور حکومت کے لیے مفید مقصد نہیں ہے تو دو ہفتے کے بعد واپس دے دیے گئے۔''

لیکن جب تفتیش کے نتیجے میں حکومت ہند کو اطلاع دی گئی تو اس نے مقامی حکومت کے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا۔ وہاں خیال کیا گیا کہ مقامی حکومت نے کاغذات واپس دے دینے میں جلدی کی؛ اور بہت ممکن ہے کہ پوری ہوشیاری کے ساتھ معائنہ نہ کیا گیا ہو۔ اس زمانے میں حکومت ہند کے محکمہ تفتیش کا افسر اعلیٰ سر چارلس کلیو لینڈ، تھا اور مختلف اسباب سے جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں، اسے میری مخالفت میں ایک خاص کد ہو گئی تھی، وہ پہلے کلکتہ آیا؛ اور دو ہفتے تک تفتیش میں مشغول رہا، پھر رانچی آیا، اور از سر نو میرے مکان کی تلاشی لی، تلاشی کے بعد کہا گیا: جو کاغذات پچھلی تلاشی کے موقع پر لیے گئے تھے اب حکومت ہند کے معائنے کے لیے بھیجے جائیں گے۔ چنانچہ تمام کاغذات حتیٰ کہ چھپی ہوئی کتابیں بھی لے لی گئیں۔ ان میں نہ صرف ترجمہ اور تفسیر کا مسودہ تھا، بلکہ بعض دوسری مصنفات کے بھی مکمل

و نامکمل مسودات تھے۔

جس وقت یہ معاملہ پیش آیا۔ ترجمہ کا مسودہ آٹھ پاروں تک اور تفسیر کا مسودہ سورۃ نساء تک پہنچ چکا تھا۔ لیکن اب ان کا ایک ورق بھی میرے قبضہ میں نہ تھا۔ تاہم میں نے نویں پارے سے ترجمہ کی ترتیب جاری رکھی اور ۱۹۱۸ء کے اواخر میں کام ختم کر دیا۔ اب اگر ابتداء کے آٹھ پاروں کا ترجمہ واپس مل جائے تو پورے قرآن کا ترجمہ مکمل تھا۔

میں نے کاغذات کی واپسی کے لیے خط و کتابت کی لیکن جواب ملا کہ نہ تو مسودے واپس دیے جا سکتے ہیں نہ ہی بتلایا جا سکتا ہے کہ کب تک واپس کیے جائیں گے، چونکہ کاغذات کی واپسی کی بظاہر کوئی قریبی اُمید نظر نہیں آتی تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ آگے چل کر کیا صورت حال پیش آئے۔ اس لیے یہی مناسب معلوم ہوا کہ از سر نو ان پاروں کا ترجمہ کر کے کتاب مکمل کر لی جائے۔ یہ کام آسان نہ تھا، ایک لکھی ہوئی چیز کو دوبارہ لکھنا طبیعت پر بہت شاق گزرتا ہے۔ تاہم میں نے چند ماہ کی محنت کے بعد یہ حصہ بھی از سر نو مکمل کر لیا:

گفتہ گرشد ز کنم شکر کہ ناگفتہ بجاست
از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام

مولانا حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''یہ کاغذات مجھے رہائی کے بعد ۱۹۲۰ء میں واپس ملے۔ رہائی کے بعد جب میں نے مطالبہ کیا تو کئی ماہ تک کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس زمانے میں صوبہ بہار کے گورنر لارڈ سنہا تھے۔ مجھ میں اور ان میں اس وقت سے شناسائی تھی جب ۱۹۰۹ء میں وہ حکومت ہند کے ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہوئے تھے۔ وہ علاج کے لیے کلکتہ آئے، اور ایک دوست کے یہاں اتفاقاً ملاقات ہوگئی۔ میں نے یہ واقعہ ان سے بیان کیا، انہوں نے حکومت ہند سے خط و کتابت کی اور دو ہفتے کے بعد تمام کاغذات مجھے واپس مل گئے۔''

(ترجمان القرآن، جلد اول، ص ۳۴، ۳۵)

رانچی کی چار سالہ نظر بندی میں مولانا آزاد نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان کی

مثال ملنی مشکل ہے۔ یہاں آپ نے اپنی بہترین اور معرکہ آراء کتاب ''تذکرہ'' لکھی۔ اور یہیں ترجمان القرآن کی وہ تفسیر منصۂ شہود پر آئی جس نے تفاسیر قرآن مجید میں ایک گرانقدر اور انقلابی تفسیر کا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ مولانا نماز جمعہ کے بعد ایک مسجد میں خطبہ دیتے تھے جس کو سننے کے لیے لوگ کثرت سے جمع ہوتے تھے۔ مولانا نے رانچی میں وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا اور لوگوں کو توحید وسنت کی راہ دکھائی۔

مولانا کے مخالفوں اور حاسدوں نے رانچی میں بھی ان کو ایذائیں پہنچانے کی پوری پوری کوششیں کیں۔ انہیں غیر مقلد اور وہابی کہنا شروع کر دیا۔ لیکن مولانا کی فہم وبصیرت سے یہ فتنہ جلد دب گیا اور حنفی وہابی کا جھگڑا ختم ہو گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے رانچی میں جو چار سال گزار دیے، وہ رائیگاں نہیں گئے بلکہ اس کا اثر بہت دیر پا رہا۔ وہاں کے مسلمانوں میں دینداری کے علاوہ قومی رجحانات ہمیشہ طاقتور رہے؛ اتنے طاقتور کہ بڑے بڑے طوفان بھی انہیں ہلا نہ سکے۔

رانچی کے زمانہ قیام کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی نے ''مولانا ابوالکلام آزاد کے اسوۂ یوسفی'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں سید صاحب نے مولانا آزاد کے علمی کاموں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

زمانہ قیام رانچی سے ایک سال تک جامع مسجد میں انہوں نے مسلمانوں کو قرآن مجید کا درس دیا۔ زیادہ تر اوقات تالیف وتصنیف میں بسر ہوئے۔ ترجمان القرآن یعنی قرآن مجید کا موثر تفسیری ترجمہ اس زمانے میں ختم ہوا۔ البیان تفسیر قرآن میں ایک جامع تصنیف کا سلسلہ ۲۳ پاروں تک پہنچا۔ فقہ اسلامی پر بغیر فریقانہ تعصب کے صرف کتاب وسنت کو پیش نظر رکھ کر متعدد رسائل، الصلوٰۃ، الزکوٰۃ، الحج، النکاح ترتیب دیے۔ سوانح مجددین کا سلسلہ شروع کیا۔ اور اس میں علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ، علامہ ابن قیم، اور شاہ ولی اللہ صاحب کے سوانح ومجتہدات قلم بند کیے۔ ایک رسالہ منطق اور بعض دوسرے علمی موضوعات پر تحریر کیا۔

(بحوالہ امام الہند ابوالکلام آزاد، امداد صابری، ص: ۱۳۹)

اس شہادت کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی اسلامی سیرت اور خدمات جلیلہ کے لیے

اور کیا رہ جاتا ہے کہ جس کا ذکر کیا جائے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے اور اس سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ رانچی میں مولانا آزاد کی چار سالہ نظر بندی اور اس کے ثمرات و نتائج تاریخ انقلاب ملت اسلامیہ کا اتنا اہم موضوع اور مولانا کی زندگی کا ایسا عظیم الشان واقعہ ہے کہ اس کا تاریخ کی روشنی میں ہونا نہایت ضروری ہے۔

تحریکِ ترکِ موالات کے جرم میں قید:

۱۰، دسمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا کو تحریکِ ترکِ موالات کے رہنما کی حیثیت سے گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا پر دفعہ ۱۲۴۔ الف کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔

مقدمہ میں ایک سال کی سزا سنائی گئی۔ آپ نے یہ ایام اسیری پریذیڈنسی جیل علی پور میں گزارے۔ اس مقدمہ میں آپ نے وہ تاریخی بیان دیا۔ جو ''قول فیصل'' کے نام سے مشہور ہوا۔

تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں ہندو اور مسلمان رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا۔ اور انہیں مختلف مدتوں کی سزائیں سنائی گئیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو بھی گرفتار ہوئے۔ مولانا محمد علی کو دو سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۰، دسمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار کیے گئے۔ اور دفعہ ۱۲۴۔ الف کے تحت آپ پر مقدمہ چلا گیا۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۲۱ء کو مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی، ۲۴ جنوری ۱۹۲۲ء کو آپ نے اپنا بیان داخل کیا۔ ۹، فروری ۱۹۲۲ء کو عدالت نے فیصلہ سنا دیا۔ اور ایک سال بامشقت کا حکم سنایا۔

عدالت میں مولانا نے جو بیان دیا وہ ''قول فیصل'' کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ مولانا نے اپنے بیان میں فرمایا کہ:

> ''میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے صرف انہی دو موقعوں پر نہیں، بلکہ گذشتہ دو سال (۱۹۲۰ء ۱۹۲۱ء) کے اندر اپنی بے شمار تقریروں میں یہ اور اسی مطلب کے لیے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے ہیں۔ ایسا کہنا میرے اعتقاد میں

میرا فرض ہے۔ میں فرض کی تعمیل سے اس لیے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ دفعہ (۱۲۴۔الف) کا جرم قرار دیا جائے گا۔ میں اب بھی ایسا کرنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا ہوں، ایسا ہی کہتا رہوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے آگے بدترین گناہ کا مجرم سمجھوں۔''

یقیناً میں نے کہا کہ موجودہ گورنمنٹ بہت ظالم ہے۔لیکن اگر میں نہ کہوں۔ میں نہیں جانتا کیوں مجھ سے توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں، میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔ میں یقیناً یہ کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں۔ گورنمنٹ نا انصافی اور حق تلفی سے باز آجائے ...... جو چیز بری ہے اسے یا تو درست ہو جانا چاہیے یا مٹ جانا چاہیے۔تیسری بات کیا ہو سکتی ہے۔ (قول فیصل)

''قول فیصل'' مولانا ابوالکلام آزاد کا ایسا تاریخی بیان ہے کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، بقول مولانا غلام رسول مہر:

''ہندوستان میں چھوٹے بڑے ہزاروں افراد گرفتار ہوئے تھے اور بے شمار لوگوں نے تحریری بیانات دیے تھے۔ مگر کوئی بیان ''قول فیصل'' کا درجہ حاصل نہ کر سکا۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد، از مہر، ص: ۱۵۵)

سائمن کمیشن کی مخالفت میں گرفتاری:

۲۱، اگست ۱۹۳۰ء کو مولانا کو سائمن کمیشن کی مخالفت میں گرفتار کیا گیا۔ اور ۲۷، جنوری ۱۹۳۱ء کو رہا کر دیا گیا۔ یہ اسیری صرف پانچ ماہ رہی۔ سائمن کمیشن کیوں ہندوستان آیا۔ اس کے بارے میں پروفیسر حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

''برطانوی حکومت نے برصغیر کے سیاسی حالات و رجحانات کا اندازہ کرتے ہوئے بالآخر اعلان کیا کہ ہندوستان کو مزید آئینی اصلاحات دینے اور درجہ نوآبادیات کی منزل تک پہنچانے کے لیے دستوری راستہ تلقین کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جاتا ہے۔ جو وہاں جا کر اس ملک کے سیاسی رہنماؤں سے

ملاقات کر کے ایک ایسی رپورٹ تیار کرے گا جو ان رہنماؤں کے خیالات و جذبات کی ترجمانی کرے گی حکومت برطانیہ پھر ان خیالات و جذبات کی روشنی میں مزید اصلاحات رائج کرے گی۔ چنانچہ سر جان سائمن نامی ایک انگریز کی سرپرستی میں ایک ایسے ہی کمیشن کا تقرر کیا گیا۔ یہ خالصتاً انگریزوں پر مشتمل تھا۔ اس میں کوئی ہندوستانی رہنما شامل نہ تھا۔ اس لیے ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں نے اس کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے میں کانگرس کے علاوہ خلافت کمیٹی، جناح مسلم لیگ اور جمعیۃ العلمائے ہند جیسی جماعتیں بھی شامل تھیں۔ البتہ پنجاب کی شفیع لیگ اس سے علیحدہ تھی۔ علامہ اقبال ان دنوں شفیع لیگ کے ہمراہ تھے۔"

(ظفر علی خاں اور ان کا عہد، ص: ۱۶۸)

سیاسی رہنماؤں میں مولانا ظفر علی خاں، علی برادران، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزاد نے سائمن کمیشن کی سب سے زیادہ مخالفت کی اور اس کے مقابلے میں ہندوستان کے عوام کو اُبھارا۔

سائمن کمیشن جہاں کبھی کہیں بھی جاتا ہندو اور مسلمان اس کے خلاف احتجاج کرتے۔ اور سائمن گو بیک (Go Back) کے نعرے لگاتے۔ لاہور اور لکھنو میں سائمن کمیشن کے خلاف زبردست مظاہرے ہوئے۔ لاہور میں پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خاں اور لاجپت رائے، پولیس کی لاٹھیوں کی زد میں آگئے۔ لاجپت رائے کو شدید ضربیں آئیں جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔

لکھنو میں بھی سائمن کمیشن کی آمد پر ایک ایسا ہی مظاہرہ ہوا۔ وہاں جلوس کی قیادت پنڈت جواہر لعل نہرو اور گوبند ولب پنتھ کر رہے تھے۔ وہاں بھی پولیس نے لاہور کی طرح لاٹھی چارج کیا۔ اور یہ دونوں رہنما زخمی ہوئے۔

گرفتاری:

۲، مارچ ۱۹۳۲ء کو مولانا کو میرٹھ میں ایک تقریر کے جرم میں گرفتار کیا گیا اور ۱۱ مئی

۱۹۳۲ء کو رہا کر دیا گیا۔ یہ اسیری صرف ۲ ماہ رہی۔

گرفتاری:

۳، جنوری ۱۹۴۱ء کو مولانا کو گرفتار کیا گیا۔ دو برس کی سزا ہوئی۔ اور نینی جیل میں لے گئے۔ لیکن ۱۱ ماہ بعد رہا کر دیے گئے۔

ہندوستان چھوڑ دو (Quit India) کی تحریک کے الزام میں گرفتاری:

۹، اگست ۱۹۴۲ء کو ہندوستان چھوڑ دو کی تجویز کی منظوری کے بعد مولانا کو گرفتار کر لیا گیا اور قلعہ احمد نگر میں نظر بند کیا گیا۔ ۱۵، جون ۱۹۴۵ء کو تین سال ۲۴ دن کی اسیری کے دن پورے کر کے رہا ہوئے۔

احمد نگر کے ایام اسیری میں مولانا نے مولانا حبیب خاں شروانی کے نام بڑے علمی اور جامع خطوط لکھے۔ ظاہر ہے یہ خط حوالۂ ڈاک نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے مولانا خط لکھ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتے تھے۔ قلعہ احمد نگر میں لکھے گئے خطوط کی تعداد بیس (۲۰) بنتی ہے۔

یہ خطوط مولانا کی رہائی کے بعد ''غبار خاطر'' کے نام سے مئی ۱۹۴۶ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیے۔ غبار خاطر میں کل ۲۴ خطوط ہیں پہلا خط شملہ دوسرا تیسرا خط سری نگر (کشمیر) سے اور چوتھا خط ممبئی سے لکھا گیا۔

ایام قید و بند:

مارچ ۱۹۱۶ء سے دسمبر ۱۹۱۹ء (۳ سال ۹ ماہ)

۱۰، دسمبر ۱۹۲۱ء سے ۶، جنوری ۱۹۲۳ء (ایک ماہ، ایک ماہ)

۲۱، اگست ۱۹۳۰ء سے ۲۷ جنوری ۱۹۳۱ء (۵ ماہ)

۱۲، مارچ ۱۹۳۲ء سے ۲۷ جنوری ۱۹۳۱ء (۲ ماہ)

۳، جنوری ۱۹۴۱ء سے ۴ دسمبر ۱۹۴۲ء (۱۱ ماہ)

۶، اگست ۱۹۴۲ء سے ۱۵، جون ۱۹۴۵ء (۳ سال ۲۴ دن)

مولانا لکھتے ہیں:

’’رانچی کی نظر بندی سے جون ۱۹۴۵ء تک اسیری کی کل مدت دس سال سات ماہ بنتی ہے۔‘‘

(غبار خاطر طبع دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۳۳)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایام اسیری کن کن جیلوں میں بسر کیے۔ شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

’’مولانا جن جیلوں میں رہے ان میں علی پور جیل کلکتہ، نینی سنٹرل جیل الٰہ آباد، میرٹھ ڈسٹرکٹ جیل، گونڈہ ڈسٹرکٹ جیل، مراد آباد سنٹرل جیل اور دہلی ڈسٹرکٹ جیل کے علاوہ احمد نگر کا قلعہ بھی تھا۔ ترجمان القرآن کی دوسری جلد میرٹھ ڈسٹرکٹ جیل میں لکھی۔ ’’غبار خاطر‘‘ قلعہ احمد نگر کی یادگار ہے۔‘‘

(ابوالکلام آزاد، از شورش کاشمیری، ص ۹۹)

جیلوں میں علمی خدمات:

جیسا کہ آپ اس باب میں پڑھ آئے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے رانچی میں نظر بندی کے دوران ترجمان القرآن اور دوسری کئی کتابیں ترتیب دیں۔ اور قلعہ احمد نگر میں ’’غبار خاطر‘‘ لکھی۔ اسی طرح کئی علماء و سیاسی اکابرین نے جیلوں میں کتابیں لکھیں۔ میرا ایک مضمون جیلوں میں علمی خدمات کے عنوان سے روزنامہ امروز لاہور اشاعت ۸رفروری ۱۹۸۶ء اور مابعد ماہنامہ ’’نوائے اسلام دہلی میں بھی شائع ہوا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کو بھی اس کتاب کی زینت بنایا جائے تاکہ قارئین کو معلوم ہو کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح دوسرے علماء و اکابرین نے بھی جیلوں میں کیا کیا علمی خدمات انجام دیں۔

(عبدالرشید عراقی)

درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ علم و فن کی ایک خدمت ہے، اللہ تعالیٰ نے جن اشخاص کو ان نعمتوں سے نوازا ہے وہ اس میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ جیل سے باہر ہوں، یا جیل کے اندر ہوں وہ اپنے کام میں ہمہ تن مصروف نظر آتے ہیں۔ اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہم کو سیکڑوں صاحب کمال اور علم فضل کے حامل اشخاص نظر آئیں گے جنہوں نے

جیلوں کے اندر علمی کارنامے انجام دیے کہ جن کا تذکرہ ان شاء اللہ العزیز رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔

اس مقالہ میں چند ایسی معروف شخصیات کا تذکرہ پیش خدمت ہے جنہوں نے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں اپنا علمی مشغلہ جاری رکھا، علم وفن کے چراغ روشن کیے اور دین و مذہب اور علم وفن میں ایسی شاندار خدمات انجام دیں کہ تاریخ کے صفحات پر وہ نقش دوام بن گئیں۔

علم وفن کی شمع روشن کرنے والوں میں جہاں انبیائے کرام علیہم السلام ہیں، وہاں صاحب تدریس بھی، شاعر بھی، ادیب بھی، دانشور بھی، مورخ بھی اور سیاسی رہنما، ملی وقومی خدمت گزار بھی، حقائق و معارف کے راز داں بھی، فلسفہ اور منطق کے نکتہ داں بھی غرضیکہ ہر مکتب فکر کے صاحب فضل و کمال شامل ہیں۔

انبیائے کرام میں سب سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کا نام آتا ہے جن کو غلط اتہام کی وجہ سے مصر کے قید خانہ میں داخل کیا گیا تو آپ نے قید خانہ میں دعوت توحید کا علم بلند کیا اور قیدیوں کو ایک خدائے واحد قہار کی عبادت کی دعوت دی، ان کے بعد حضرت خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک آتا ہے۔ جنہوں نے شعب ابی طالب میں تین سال محصور رہ کر توحید الٰہی کا درس دیا۔

علمائے کرام، شعرائے عظام، اور دوسرے ارباب فضل و کمال نے جیلوں کے اندر جو علمی کارنامے انجام دیے۔ ان کا تذکرہ پڑھنے سے قبل علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) کی ایک تحریر ملاحظہ فرمائیں۔

علامہ مرحوم لکھتے ہیں کہ:

''اسلام کی تاریخ ایسے زندانیوں اور تنہا نشینوں کے کارناموں سے ناآشنا نہیں ہے۔ اسلام کے کتنے نامور علماء اور مصنفین گزرے ہیں کہ جن کے قلم کی روانی کو ان کے پابہ زنجیر ہونے کا سکون ایک لمحہ کے لیے بھی بند نہ کرسکا، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے بغداد کی مجلس میں بیٹھ کر امام محمد بن حسن رحمہ اللہ شیبانی جیسا

شاگرد پیدا کیا۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے معتصم کے قید خانہ میں مجلس درس کو نہ صرف گرم رکھا، بلکہ خلق قرآن جیسے عظیم فتنہ کا نہ صرف مقابلہ کیا، بلکہ اس کے دبانے کے لیے جان کی بازی لگا دی اور اعطونی شیًا من الکتاب والسنة سے کم کسی دلیل سے پیچھے نہیں ہٹے۔ قاضی بکار مصری نے ابن طولون کے زندانِ مصر میں ایک کھڑکی سے منہ نکال کر علم کے شائقین کو تعلیم دی۔ امیہ بن عبدالعزیز اندلسی ۴۸۹ ہجری میں اسکندریہ میں قید کیے گئے۔ اور قید کی حالت میں ہیئت اور ریاضی کی متعدد تصانیف چھوڑیں۔''

(مقدمہ کتاب الہدیٰ سیٹھ یعقوب حسن)

اب آپ شیخ الاسلام (م ۷۲۸ ھ) کا حال پڑھیے جن کے فضل و کمال؛ جلالت قدر، اور علمی تبحر کی بنا پر دُنیائے اسلام ان کی معترف ہے۔ جیل جاتے ہیں تو وہاں توحید وسنت کا درس دیتے ہیں؛ اور اس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید کی تفسیر، اور بعض دوسری معروف کتابیں جیل میں لکھیں۔ لیکن ایک وقت آیا کہ جب حکومت نے قرطاس وقلم چھین لیا تو آپ نے کوئلوں سے جیل کی دیواروں پر لکھنا شروع کر دیا۔

شمس الائمہ سرخسی جو علمائے احناف کے ایک مشہور اور معروف صاحب علم وقلم تھے۔ ''المبسوط'' جیسی علمی کتاب جو (۱۵) جلدوں پر محیط ہے جیل میں تصنیف کی۔ حکیم بوعلی سینا جن کا حکمت میں کوئی ثانی نہیں تھا۔ سیاست میں حصہ لینے کی پاداش میں جیل گئے تو جیل خانہ میں ''کتاب الہدایات'' اور ''کتاب القولنج'' جیسی علمی کتابیں لکھیں۔

امام ربانی مجدد الف ثانی جن کی علمی شہرت سے برصغیر (پاک و ہند) کا ہر ذی علم بخوبی واقف ہے۔ عہد جہانگیری میں جیل گئے اور گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کیے گئے تو آپ نے ایام اسیری میں (۶۵۰) خطوط ارسال کیے۔ جو محض خطوط ہی نہیں بلکہ کتاب و سنت کے شارح وترجمان تھے۔

اور اب دوسری طرف آئیے، حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی کی تحریک احیائے دین اور اقامت جہاد کے سلسلہ میں ان کے متبعین نے شوق جہاد کے سلسلہ میں اپنی جانوں

کی قربانیاں دیں اور عمر بھر کے لیے جیل گئے۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری جو اس تحریک کے شہسوار تھے جیل گئے اور ''کالا پانی'' کے نام سے ایک مشہور و معروف کتاب لکھی۔ اس تحریک کے ایک رکن مولوی فضل الٰہی وزیر آبادی تھے جنھوں نے اٹک جیل سے ایسے خطوط لکھے جو متحدہ ہندوستان میں اسلامی انقلاب کا ایک طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔ اور یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ وہ عبقری تھے۔ اُن کے علم و فضل اور دینی بصیرت سے کون واقف نہیں۔ جن کے بارے میں مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا تھا:

جہان اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہوگئی
ہے تجھ کو اس میں جستجو تو پوچھ ابو الکلام سے

نظم ونثر کے بادشاہ تھے۔ حسرت موہانی فرماتے ہیں:

جب سے دیکھی ہے ابو الکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزانہ رہا

ابوالکلام آزاد اپنے دور کے نامور خطیب تھے۔ حسرت فرماتے ہیں:

سب ہو گئے خاموش حسرت
گویا ہے ابو الکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کا معتدبہ حصہ جیل میں گزرا۔ اور اپنی زندگی کے گیارہ برس جیل میں گزارے۔ اُردو ادب میں خطوط نگاری کا شاہکار اور زندۂ جاوید نمونہ ''غبار خاطر'' ان کے ایامِ جیل ہی کی یادگار ہے۔

بقول علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ:

حسرت موہانی کی نظمیں، مولانا ابو الکلام آزاد کی تحریریں
مولانا محمد علی جوہر کی تقریریں اسی حجلۂ زنداں میں بنیں اور سنوریں

مولانا ابوالکلام آزاد کے باعظمت رفیق اور خاندان غزنویہ امرتسر کے گل سرسبد مولانا سید محمد داؤد غزنوی، جن کی حق پرستی، عظمت و کردار، تقویٰ شعاری اور راست بازی نے

پورے ملک میں انھیں مرکز عقیدت و احترام بنا رکھا ہے۔ جیل ہی میں سنت یوسفی زندہ کرتے ہیں اور ہدایت ورہنمائی کے نقوش سے کتنوں ہی کی زندگیاں بدل دیتے ہیں۔

شیخ الہند اسیر مالٹا مولانا محمود الحسن دیوبندی سے کون واقف نہیں۔ جو اپنے علمی تبحر، جلالت قدر اور سیاسی بصیرت سے پورے ملک میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ مختلف قید خانوں میں قید رکھے جانے کے بعد آخر کار مالٹا بھیج دیے جاتے ہیں اور وہاں آپ نے ساڑھے تین سال قید تنہائی میں کاٹے۔ اس دوران میں آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور پانچ پاروں کے حواشی لکھے۔

سیٹھ یعقوب حسن جو مدراس کے ایک رئیس تھے اور اس کے ساتھ ایک بہت بڑے عالم دین، نامور مؤرخ تھے۔ جیل گئے تو جیل میں قرآن مجید کی تفسیر ''کتاب الہدیٰ'' لکھی اور اس پر مقدمہ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا۔

مولانا حسرت موہانی جو تحریک آزادی کے ایک نامور سپاہی تھے۔ جن کی سیاسی بصیرت کا پورا برصغیر معترف تھا۔ اُردو ادب میں ایک بلند مقام کے حامل تھے۔ زندگی کے کئی سال جیل میں گزارے، خود فرماتے ہیں:

ہے مشق سخن جاری ، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے ، حسرت کی طبیعت بھی

قید و بند میں علمی مشاغل جاری رکھے۔ ان کے دیوان کا ایک معتد بہ حصہ مختلف جیلوں کا تحفہ ہے۔ حسرت جیل سے نہیں گھبراتے تھے؛ اور اس کا مذاق اُڑاتے تھے۔ فرماتے ہیں:

بے کار ڈراتے ہو مجھے قید ستم سے
وہاں روح وفا اور بھی آزاد رہے گی

جیلوں میں مولانا حسرت نے جو نظمیں اور غزلیں لکھیں وہ قید فرنگ کے نام سے علیحدہ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں جیسا نڈر، بیباک، جری، بہادر، عالم، ادیب، نقاد، مبصر، دانشور، مقرر و خطیب، صحافی اور سیاسی بصیرت رکھنے والا رہنما پورے برصغیر (پاک و ہند) میں نہیں

گزرا۔ ایسا بے باک اور جرأت مند انسان جس کے بارے میں سر مائیکل ایڈوائر نے کہا تھا کہ ظفر علی خاں ماں کے پیٹ سے قلم و دوات لے کر پیدا ہوا ہے۔

عربی، فارسی، انگریزی اور اردو زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گزرا۔ ''غلبۂ روم'' کتاب آپ نے جیل میں لکھی۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا کہ:

''ظفر علی خاں کی رہائی سے اسیری ہی بھلی کہ جیل سے ایسا انوکھا اور علمی تحفہ ہمراہ لاتے ہیں۔''

مولانا سید مودودی صرف برصغیر ہی کے نہیں عالم اسلام کے بھی عظیم مفکر اور رہنما تھے۔ ان کے علمی تبحر و سیاسی بصیرت کا اعتراف عالم اسلام کے ممتاز علماء و قائدین نے کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن کا معتدبہ حصہ جیل میں مکمل کیا۔

مشہور صحافی، ادیب، شاعر اور دانشور آغا شورش کاشمیری سے کون واقف نہیں۔ ان کی شعری، ادبی اور سیاسی خدمات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ بڑے بے باک اور نڈر انسان تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے ان کے بارے میں فرمایا تھا:

شورش سے میرا رشتہ ہے اور وہ ازلی ہے
میں وقت کا رستم ہوں ؛ اور یہ ثانی سہراب

ان کی کتاب ''پس دیوارِ زنداں'' ان کے ایامِ اسیری کی مکمل دستاویز ہے۔ اور یہ کتاب آپ نے جیل ہی میں مکمل کی۔

شورش مرحوم لکھتے ہیں کہ:

''پس دیوار زنداں ...... یہ کہانی نہیں کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں میں دار و رسن کے نمونے بھی ہیں۔ اور شعر و سخن کے زمزمے بھی، قید تنہائی کا سناٹا بھی ہے اور زور قلم کا فراٹا بھی، آنسوؤں کی مالا بھی ہے، اور آہوں کا ہار بھی، دوستوں کی باتیں بھی ہیں، اور دشمنوں کی گھاتیں بھی، ہجر کی رات بھی ہے اور وصل کی بات بھی، غرض زلف و زنجیر کے رشتے، اور زخم و مرہم کے ناطے۔ اس کہانی کے

بین السطور کی آبرو ہیں۔''

(پس دیوارِ زنداں)

پیر سید کرم شاہ ازہری بریلوی مکتبہ فکر کے ممتاز عالم تھے انہوں نے اپنی تفسیر ''ضیاء القرآن'' کا ایک معتدبہ حصہ جیل میں مکمل کیا۔

عالم اسلام میں جیلوں میں ہونے والے علمی کام پر ایک نظر:

اب عالم اسلام کی طرف آیئے تحریک اخوان المسلمین مصر کے بانی داعی کبیر، مجاہد حق امام حسن البناء شہید کی عبقری شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ حکومت مصر نے آپ کو کئی بار جیل بھیجا۔ آپ جب بھی جیل گئے۔ اخوان کو مراسلات کے ذریعہ ہدایات بھیجتے رہے اور آپ کی یہ ہدایات کتاب وسنت کی تعبیر وتشریح کا بے مثال نمونہ ہوتی تھیں۔ انہی کے نقش قدم پر چلنے والے سید قطب شہید تھے۔ جنہوں نے حسن البناء شہید کے دیرینہ مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ جن کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ مصر سے مغربی تہذیب کا خاتمہ ہو اور یہاں کتاب وسنت کی روشنی میں حکومت معرض وجود میں آئے۔ لیکن مصر کے ارباب حل وعقد اس کو کس طرح پسند کر سکتے تھے۔ چنانچہ آپ کو جیل بھیج دیا گیا اور جیل میں آپ نے کئی ایک علمی کتابیں لکھیں۔ آپ کی معرکہ آراء تصنیف تفسیر ''فی ظلال القرآن'' ہے جو آپ نے جیل میں لکھی۔

مصری عدالت کے جج عبدالقادر عودہ سے کون واقف نہیں۔ اسلامی قانون وفقہ میں ایک ممتاز مقام کے حامل تھے۔ انہیں بھی اسیر زنداں ہونا پڑا۔ ''اسلامی قانونِ تعزیرات'' آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ جو آپ نے اپنی اسیرانہ زندگی میں لکھی۔

علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی عالم اسلام کے بلند پایۂ عالم دین، مفکر اور مصنف ہیں۔ انہیں بھی حکومت وقت نے کئی بار جیل کی سیر کرائی۔ آپ نے اپنی مشہور کتاب ''فقہ الزکوۃ'' (جو علمی دنیا میں ایک خاص مقام کی حامل کتاب ہے)، جیل میں لکھی۔

یہ ہیں تاریخ کے چند واقعات جن میں مختلف اصحاب فکر واصحاب عزم وہمت نے قید وبند کی پروا کیے بغیر اپنے علم وفن کے چراغ کو تاریک، بند کمروں میں جلا کر روشنی فراہم کی،

اور اپنی عظمت کردار کا ایک بے مثال نمونہ چھوڑا۔

کیا ظلم وعدوان کی طوفانی آندھیاں حق کے چراغوں کو گل کر سکتی ہیں۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا، ان کا اپنا چراغ تو گل ہوسکتا ہے لیکن عزم وہمت کا چراغ گل نہیں ہوسکتا:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پر خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

باب نمبر ۱۴ جامعہ بیت العتیق (رجسٹرڈ)

کتاب نمبر ______

مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے معاصرین

مولانا ابوالکلام آزاد ایک جامع اور ہمہ گیر شخصیت تھے۔ انہوں نے اپنے تدبر و فکر، فہم و بصیرت اور اپنی ذہانت و ذکاوت سے صرف برصغیر (پاک و ہند) میں ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں بھی اپنے علمی تبحر، فضل و کمال اور حسن کارکردگی سے شہرت و مقبولیت حاصل کی۔

قدرت نے مولانا آزاد کی ذات گرامی میں فکر و عمل یا تدبر و بصیرت کا جو توازن مہیا کیا تھا، وہ مولانا کی شخصیت کا امتیازی جوہر ہے۔ کم لوگ ہوں گے جن کی ذات میں فکر و عمل کی ایسی مطابقت پائی جاتی ہو جو مولانا کی ذات میں پائی جاتی تھی۔ مولانا حق گوئی و بے باکی میں اپنی مثال آپ تھے۔ تذکرہ میں آپ نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ، اور امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہم اللہ اجمعین کے اعلائے کلمۃ الحق کے واقعات کا ذکر کیا ہے، ان ائمہ کرام نے ظلم و تعدی کے مقابلے میں اپنا سر نہ جھکا کر تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا مولانا نے بھی انہی کے نقش قدم پر چل کر وقت کی سب سے بڑی استعماری طاقت کے مقابلے میں سینہ سپر ہو کر تاریخ میں اپنا نام روشن کیا۔ بلکہ خود اپنوں کے سب و شتم اور دل آزاری کا مقابلہ بھی انہوں نے اسی عزم و حوصلہ اور متانت و وقار کے ساتھ کیا۔ آپ نے اپنے لیے ۱۹۱۲ء میں جو راہ متعین کی تھی اس پر ۱۹۵۸ء تک جب وہ اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے یکساں پامردی اور مستقل مزاجی کے ساتھ گامزن رہے۔

مولانا آزاد کے علم و فضل اور ان کی دینی، مذہبی، علمی، ادبی، قومی و ملی اور سیاسی خدمات کا کانگرسی، مسلم لیگی اور مذہبی و ادبی اور سیاسی رہنماؤں نے اعتراف کیا ہے۔ ان لوگوں میں مولانا کے حمایتی اور عقیدت مند بھی شامل ہیں اور مخالفین بھی۔ عربی کی ایک کہاوت ہے کہ ''حسن وہ ہے جس کا سوکنوں کو بھی اعتراف ہو۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نے ملک کی علمی، ادبی، تعلیمی، صحافتی اور سیاسی زندگی میں اپنا مقام پیدا کرلیا تھا۔ اور ان کا شمار ملک کے مقتدر رہنماؤں میں ہونے لگا تھا۔ اس لیے ان کو ہر مکتب فکر کے رہنماؤں نے خراج تحسین پیش کیا۔

ذیل میں ان حضرات کے ذاتی تاثرات کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

(عبدالرشید عراقی)

گاندھی جی:

موہن داس کرام چند گاندھی ہندو قوم کے ممتاز رہنما تھے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں ان کی خدمات نہایت قابل قدر ہیں، ان کا شمار کانگرس کے مقتدر رہنماؤں میں ہوتا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کا ساری زندگی تعلق خاطر رہا۔ مولانا سے ان کی پہلی ملاقات ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔

قاضی عبدالغفار اپنی کتاب ''آثار ابوالکلام'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ہندوستان کی سیاست کے اس انقلابی دور میں مولانا کی پہلی ملاقات مہاتما گاندھی سے ۱۸، جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ اس موقع پر آنجہانی تلک بھی موجود تھے۔ جب مولانا اور مہاتما گاندھی کے درمیان محبت اور خلوص کا ایک ایسا رشتہ قائم ہوا جو مہاتما جی کے آخری دم تک قائم رہا۔ مولانا کی زندگی میں مہاتما جی سے ان کی یہ پہلی ملاقات ایک نشان راہ ہے۔ دو غیر معمولی فطرتوں کا یہ سنگم اپنی ایک عجیب وغریب خصوصیت رکھتا تھا۔ جس طرح مولانا نے اسی طرح مہاتما جی نے سیاست کو مذہبی روحانیت کی کسوٹی پر رکھ دیا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ایک خاص حیثیت رکھتے تھے...... یہ واقعہ خود اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ شخصی مذہب ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور مشترکہ قومیت کے تصورات میں رخنہ انداز نہیں ہوسکتا۔''

(آثار ابوالکلام)

آغا شورش کاشمیری مرحوم نے اپنی کتاب ''ابوالکلام آزاد'' میں گاندھی جی کے مولانا

آزاد کے متعلق ان کے تاثرات صفحہ ۴۱۳ تا ۴۶۸ قلمبند کیے ہیں۔ ان کے تاثرات کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

گاندھی جی نے کہا:

''مولانا علم کے شہنشاہ ہیں میں انہیں افلاطوں، ارسطو، فیثا غورث کی طرح کا ویسا ہی انسان سمجھتا ہوں۔ وہ تاریخ کے بہت بڑے عالم ہیں۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی میں جہاں تاریخ کے شعور کا تعلق ہے کوئی بھی ان کا ہم پایہ نہیں۔ سب ان سے پیچھے ہیں۔ اردو زبان ان کی لونڈی ہے۔ وہ عربی وفارسی کے جید عالم ہیں۔ خطابت میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ جہاں تک کلام میں تاثیر اور استدلال میں سحر کا تعلق ہے، اس وقت ہندوستان بھر میں کوئی شخص ان کا نظیر نہیں۔ مولانا کی ذہانت ہندوستان کے لیے عطیہ الٰہی ہے۔ میں کانگرس میں آیا تو ان سے پہلی ہی ملاقات ہی میں اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک (عبقری) ہیں۔ مولانا کی ذہانت کا اس سے زیادہ کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ ۱۹۲۳ء میں جب ان کی عمر ۳۵ سال تھی کانگرس کے سب سے کم عمر صدر منتخب ہوئے۔ مولانا کی زندگی فقر اور درویشی کی زندگی ہے اور غیرت مندی کی سچی تصویر ہے لیکن مزاج ان کا شاہی ہے۔''

جواہر لعل نہرو:

برصغیر کی تحریک آزادی میں پنڈت جواہر لعل نہرو کی خدمات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ ملک کی آزادی کے سلسلہ میں کئی سال تک اسیر زنداں بھی رہے۔ آخر ان کی جدوجہد کامیاب ہوئی۔ اور ۱۹۴۷ء میں ہندوستان، برطانوی سامراج کے قبضہ سے نکل گیا۔ اور برصغیر کے لوگوں نے آزادی حاصل کر لی۔ پنڈت جی ۲۳ سال تک ہندوستان کے وزیر اعظم رہے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو اور مولانا آزاد کا آپس میں گہرا تعلق رہا۔ جواہر لعل مولانا سے ایک سال چھوٹے تھے۔ مولانا ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے جب کہ پنڈت نہرو ۱۸۸۹ء میں۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں دونوں بڑے زور وشور اور طمطراق سے عملی جدوجہد میں شریک ہوئے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب ''مولانا ابوالکلام آزاد (شخصیت اور کارنامے) میں عبدالغنی صاحب کا ایک مضمون ہے ''آزاد اور نہرو'' اس میں مضمون نگار لکھتے ہیں:

ہندوستان کی تحریک آزادی کا یہی وہ لمحہ ہے جب مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لعل نہرو دونوں بہت زور وشور سے عملی جدوجہد میں شریک ہوئے۔ اور آزادی سے قبل ان کی مسلسل قید وبند کی زندگی کا دور شروع ہوا۔ ۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۰ء کی دہائی میں گاندھی جی کے ساتھ ساتھ ان کے دائیں اور بائیں جدید ہندوستان کے پردے پر جو نمایاں ترین سیاسی شخصیتیں کانگرس کی سطح سے اُبھریں۔ وہ یہی آزاد اور نہرو ہیں۔ آزاد کو اس دہائی کے آغاز پر ۱۹۲۳ء ہی میں کانگرس کی صدارت پہلی بار ملی۔ اور نہرو کو دہائی کے آخر ۱۹۲۹ء میں یہ اعزاز عطا کیا گیا۔ اس کے بعد بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سول نافرمانی اور پانچویں دہائی کے لیے برطانیہ سے ہندوستان کی طرف انتقال اقتدار کے اقدامات و مذاکرات میں گزری۔ ان بیس برسوں میں جو تحریک آزادی کے نازک ترین ایام تھے۔ مولانا آزاد اور پنڈت نہرو ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ اور قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ احمد نگر کے قید خانے میں ہم انہیں ایک طویل عرصے تک یک جا دیکھتے ہیں۔ اور ہمیں ان کے مشترک معمولات ومشاغل کا کچھ اندازہ مولانا آزاد کے معروف ومشہور مجموعہ مکاتیب ''غبارِ خاطر'' سے ہوتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک مولانا آزاد سات سال مسلسل کانگرس کے صدر رہے۔ یہ کانگرس کی تاریخ میں کسی ایک شخص کی پیہم صدارت کا طویل ترین عہد ہے۔ اس عہد کے طول سے بھی زیادہ اہمیت حصول آزادی کے لیے فیصلہ کن ہونے کی ہے، اس عہد میں جو گویا آزادی کی تحریک میں مولانا آزاد کا عہد ہے، پنڈت نہرو ان کے قریب ترین رفیق نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ملک کے عصری مسائل پر

کانگرس کی اعلیٰ کمان میں سب سے زیادہ اتفاق رائے اور اشتراک عمل ان دونوں کے درمیان معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے اور بہت زیادہ پسند کرنے لگے تھے۔ ان کا ذاتی ارتباط جگری دوستی تک بڑھ گیا تھا۔

(مولانا ابوالکلام آزاد، از خلیق انجم، ص: ۲۷۳)

مولانا ابو الکلام آزاد پنڈت جواہر لعل نہرو سے ایک سال بڑے تھے لیکن مولانا ہندوستان کی تحریک آزادی میں پنڈت نہرو سے پہلے داخل ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا نے ''الہلال'' جاری کیا تو مولانا کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔ اور ان کا شمار برطانوی ہند کے صف اول کے رہنماؤں میں ہونے لگا۔ مولانا ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک چار سال رانچی میں نظر بند رہے اور ۱۹۲۳ء میں کانگرس کے صدر بنائے گئے۔

پنڈت نہرو ۱۹۱۲ء میں اپنی تعلیم مکمل کر کے انگلستان سے ہندوستان واپس آئے۔ اور ۱۹۲۲ء تک وہ آزادی کی جدوجہد میں شامل نہیں ہوئے۔ عدمِ تعاون کی تحریک نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ اور انہوں نے ملک کی آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا۔ اور جلد ہی تحریک آزادی کے صف اول کے رہنماؤں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۹ء میں انہیں کانگرس کا صدر بنا دیا گیا۔

پنڈت نہرو مولانا آزاد کے علم و فضل اور ان کی سیاسی بصیرت کے بہت زیادہ معترف تھے اور انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں مولانا کے علم و فضل، فہم و بصیرت اور ان کی سیاسی فکر کا اعتراف کیا ہے۔ پنڈت نہرو نے عبداللہ بٹ کی کتاب ''مولانا ابوالکلام آزاد'' میں ''ایک غیر معمولی سیاست دان'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے۔ جس میں پنڈت نہرو لکھتے ہیں کہ:

> ''مولانا عام دنیا سے بالکل مختلف اور نرالے سیاستدان ہیں۔ آپ ایک کامیاب سیاستدان کے طبعی مزاج سے معرا ہیں جو ٹھوس اور بے حس ہو کر حملہ کرنے اور حملہ سہنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ آپ کی اُفتادِ طبع سرتا سر اس کے

خلاف ہے۔آپ بے حد شرمیلے اور خلوت پسند ہیں۔مزید برآں آپ کے پہلو میں ایک بہت زیادہ حساس دل ہے۔ باوجود ایک موثر اور باوقار مقرر ہونے کے شور وشغب اور ہنگامہ خیزیوں سے بہت گھبراتے ہیں۔ان کو عوام میں تقریر کرنے کے لیے آمادہ کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔حق یہ ہے کہ ان کی اصل خصوصیت علم وفضل تھی۔ حالات کی نزاکت نے انہیں حرکت وگردش کی زندگی میں محصور کر دیا ہے۔''

(ابوالکلام آزاد، مرتبہ عبداللہ بٹ)

''وہ ہمارے لیے اور ملک وقوم کے لیے قوتوں کا ایک پہاڑ رہے ہیں۔قطع نظر اس کے کہ ہم نے اُن کی رائے سے اتفاق کیا یا اختلاف، ہم یہ ہمیشہ ملحوظ رکھتے رہے کہ ان کی رائے ہم سے بہت زیادہ وقیع ہوتی ہے اور ہم آسانی سے ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ رائے ایک ایسے آزمودہ کار اور صائب دماغ کی پیداوار ہوتی ہے جسے ماضی وحال کے علم وفضل اور غیر معمولی دانش وفراست سے نوازا گیا ہے۔اور ایسی ہمہ گیر قوتیں بہت کم ہستیوں کا حصہ ہوتی ہیں۔''

(ابوالکلام آزاد، مرتبہ عبداللہ بٹ)

ایک اور کتاب کے ایک مقام پر جواہر لعل نہرو لکھتے ہیں کہ:

''میں صرف عملی سیاست ہی نہیں جانتا سیاسیات کا طالب علم بھی ہوں۔علم سیاست کی کتابیں مجھ سے زیادہ ہندوستان میں کسی اور نے نہیں پڑھیں۔ میں تیسرے چوتھے سال یورپ کا بھی دورہ کرتا ہوں۔ جہاں سیاست کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ میں نے سیاست کے تازہ ترین علم سے واقفیت حاصل کر لی ہے۔لیکن جب ہندوستان پہنچ کر مولانا ابوالکلام آزاد سے باتیں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب بھی مجھ سے بہت آگے ہیں۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ خلیق انجم، ص ۲۱۶)

پنڈت نہرو اپنی کتاب (Discovery of India) میں لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار ''الہلال'' میں مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا، یہ ایک ایسا اندازِ تخاطب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے۔ وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجہ سے واقف تھے۔ اور سرسید، محسن الملک، نذیر احمد اور حالی کے اندازِ بیان کے علاوہ ہوا کا کوئی اور گرم جھونکا ان تک پہنچا ہی نہیں تھا۔ ''الہلال'' مسلمانوں کے کسی مکتب خیال سے متعلق نہ تھا۔ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا۔'

اگر مولانا نے اپنا قلمی جہاد جاری رکھا، تو آج ہماری قوم کو صاف اور سلجھے ہوئے طرزِ فکر اور صحیح راہِ عمل کے تعین میں کسی قدر گراں بہا تقویت نصیب ہوگی۔''

پنڈت نہرو مولانا کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے، سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر ''اخبار ریاست'' نے اپنی کتاب ''ناقابل فراموش'' میں لکھا ہے کہ میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کے لیے ان کی کوٹھی پر گیا۔ مولانا سے ملاقات جاری تھی کہ پنڈت جواہر لعل نہرو (اس وقت وزیراعظم تھے، اور مولانا وزیر تعلیم) تشریف لائے۔ ملازم نے اطلاع دی کہ پنڈت جی آئے ہیں۔ مولانا نے ملازم سے فرمایا:

پنڈت جی سے کہو کہ برآمدہ میں تشریف رکھیں۔ فارغ ہونے پر ملوں گا۔

سردار دیوان سنگھ لکھتے ہیں کہ میری مولانا سے ملاقات تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی اور میرے جانے کے بعد پنڈت نہرو ملاقات کے لیے مولانا کے کمرے میں چلے گئے۔ اور میں واپس اپنے دفتر آتے ہوئے راستہ میں سوچتا رہا کہ مولانا کی کیا شان ہے کہ ایک بہت بڑے ملک کے وزیراعظم کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔

مولانا ابوالکلام بھی پنڈت نہرو کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مولانا آزاد ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک کانگرس کے صدر رہے۔ اس کے بعد آپ نے فیصلہ کرلیا کہ اب مجھے صدر نہیں رہنا چاہیے۔ چنانچہ انڈیا ونز فریڈم (ہماری آزادی) میں لکھتے ہیں:

''اس مسئلے کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ چونکہ میں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک سات سال صدر رہ چکا ہوں۔ اس لیے اب مجھے

ریٹائر ہو جانا چاہیے۔ اس بنا پر میں نے فیصلہ کیا کہ اپنا نام تجویز کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ دوسری بات یہ طے کرنا تھی کہ میرا جانشین کون ہو۔ مجھے اس کی فکر تھی کہ میرے بعد جو صدر ہو، وہ میرے نقطہ نظر سے متفق ہو، اور ایسی پالیسی پر عمل کرے جسے میں نے اختیار کیا تھا۔ اس کی موافقت اور مخالفت میں تمام دلیلوں کو جانچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ جواہر لعل کو صدر ہونا چاہیے۔''

(ہماری آزادی، ص ۳۰۹، ۳۱۰)

ہماری آزادی (انڈیا ونز فریڈم) کا حسب ذیل اندراج مولانا آزاد کے بعد جواہر لعل نہرو کے عہدۂ صدارت پر جانشین ہونے کا ایک جائزہ ہے:

''جواہر لعل نہرو میرے عزیز ترین دوست ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کی قومی زندگی کو ترقی دینے میں کسی سے کم حصہ نہیں لیا ہے، انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے محنت کی ہے اور تکلیفیں اٹھائی ہیں اور آزادی کے بعد وہ ہمارے قومی اتحاد اور ترقی کی علامت بن گئے ہیں۔ پھر بھی مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنے جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں، یہی نہیں بسا اوقات وہ بعض معاملوں کے خاص نظری پہلو سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ واقعی صورت حال کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتے۔''

(ہماری آزادی، ص ۳۲۴)

شورش کاشمیری مولانا کے جنازے میں شرکت کے لیے دہلی گئے تھے۔ جنازہ پڑھنے کے بعد شورش کاشمیری پنڈت نہرو سے ملے تو پنڈت جی نے کہا:

''شورش تم آ گئے۔ جنازے میں شرکت کی، کب آئے تھے۔ مولانا سے ملاقات ہوئی۔ اب تو کبھی ملاقات نہ ہوگی۔''

(ابوالکلام آزاد، از شورش کاشمیری، ص: ۱۷۴)

مولانا کے انتقال کے بعد دہلی میں مولانا کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ اس جلسہ کی [illegible]ت اس وقت کے صدر جمہوریہ ہندوستان ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کی، پنڈت جواہر لعل

نہرو نے کہا کہ:

''مولانا کی موت نے ہندوستان کو ایک بڑی عظمت سے محروم کر دیا ہے، وہ ہماری ان شخصیتوں میں سے تھے جو تاریخ کے طلوع سے اب تک ہندوستان نے پیدا کی ہیں۔ ان کے جنازے میں لوگوں کا ہجوم مہاتما جی کی ارتھی سے بھی زیادہ تھا۔ میں سوچتا رہا، ایک شخص جو عوام سے دور رہا اور جس کی سب سے پریشانی کا نام عوام تھے۔ اس کے جنازے میں بیکراں ہجوم کہاں سے آیا۔ گویا سارا ہندوستان اُمڈ آیا تھا، میرے دل نے جواب دیا کہ وہ ہندوستان کی عظمت ہونے کے باوجود فی زمانہ ہندوستان کے سب سے بڑے مظلوم انسان تھے۔ لوگوں نے ان کی مظلومیت کا احساس واعتراف کیا ہے۔ ہندوستان میں بڑے بڑے لوگ ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ قدرت کا نظام یہی ہے کہ وہ انسانوں کی آبادیوں کو خلاء کا شکار نہیں ہونے دیتی، ہر دور میں بڑے آدمی پیدا کرتی ہے۔ مولانا کی موت سے وہ دروازہ بند نہیں ہوا۔ ہندوستان آئندہ بھی بڑے آدمی پیدا کرتا رہے گا۔ البتہ ہم ان کی رحلت سے ایک زبردست خلاء کا شکار ہو گئے ہیں۔ آزادی سے پہلے ہم غلام ہندوستان کی جدوجہد میں اور آزادی کے بعد آزاد ہندوستان کی تگ ودو میں جب مسائل کی پیچیدگیاں ہمارے لیے سد سکندری بن جاتی تھیں تو ہم سوچتے تھے کہ آیئے مولانا سے حل دریافت کریں۔ حیرت ہوتی کہ وہ دم زدن میں ہر اٹکاؤ دور کر دیتے، ہر گتھی سلجھا دیتے، ہر سوال کا مسکت جواب عنایت فرماتے اور ہر مسئلے کا حل بتاتے۔ ہم ان کی ذہانت سے فیض یاب ہوتے۔ اور ان کی بدولت ہمیشہ ناؤ منجدھار سے نکال کر سلامتی وثبات اور فہم وفراست کے کناروں پر لے جاتے، ہمارا غم ان کی مفارقت کا غم تو ہے ہی لیکن ایک بڑا غم یہ ہے کہ ہم ایک عظیم دانش ور کی رہنمائی سے محروم ہو گئے ہیں۔''

(ابوالکلام آزاد، از شورش کاشمیری، ص ۴۷۱، ۴۷۲)

ڈاکٹر راجندر پرشاد:

ڈاکٹر راجندر پرشاد ہندوستان کے صدر رہے ہیں ۔مولانا کے دیرینہ ساتھی تھے۔ شورش کاشمیری نے مولانا کے بارے میں ان کے تاثرات اپنی کتاب ''ابوالکلام آزاد'' میں درج کیے ہیں۔ (صفحہ ۴۷۷ تا ۴۸۱)

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے شورش کاشمیری سے کہا کہ:

مولانا کی شخصیت میں اتنا جذب اور کشش ہے کہ ان کی ہر جگہ تعظیم کی جاتی ہے۔اور ان سے بڑھ کر کانگرس میں اور کوئی معاملہ فہم سیاستدان اور سیاسی جوڑ توڑ کرنے والی شخصیت نہیں ہے۔موتی لعل نہرو اور سی آر داس ان سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ علم اللسان میں اپنی نظیر آپ ہیں۔سحر خطابت سے عوام پر جادو کر دیتے ہیں۔لیکن عوام سے کنی کراتے ہیں۔اور ملاقاتیوں سے پرہیز کرتے ہیں۔عوام سے ان کے اجتناب کا واحد سبب ان کا تبحر علمی ہے۔وہ قلم کاغذ اور کتاب کی تنہائی کو عظیم سے عظیم مجمع پر ترجیح دیتے ہیں۔وہ کسی حالت میں بھی اپنی انفرادیت ترک نہیں کرتے۔

(صفحہ ۴۷۸)

گفتگو کا اختتام ان الفاظ پر ہوا۔

مولانا ہندوستان کی پندرہ سو سالہ تاریخ کے اسلامی و آریائی ارتقاء کا نچوڑ ہیں۔آج ہندوستان کی عمارتوں میں سب سے زیادہ خوبصورت عمارت تاج محل ہے اور انسانوں میں سب سے زیادہ خوبصورت انسان ابوالکلام آزاد ہیں۔میں آپ کے اس قلق سے متفق ہوں کہ ان کے ہم مذہبوں نے ان کی قدر نہیں کی۔فی الواقع وہ ہندوستان کے شوالے میں وہی اذان ہیں جو گنگا اور جمنا کے کناروں پر قافلہ اسلام کی آمد سے پہلی بار گونجی تھی۔ (صفحہ ۴۸۱)

علامہ شبلی نعمانی:

علامہ شبلی نعمانی اپنے دور کے یکتا اور علم وفضل میں متفق علیہ عالم تھے۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو حافظہ کی غیر معمولی نعمت سے نوازا تھا۔تاریخ اسلام اور اور تمدن اسلامی سے بہت

واقف تھے۔ اردو ادب سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ ان کا مطالعہ بہت زیادہ وسیع تھا۔ اُردو کے علاوہ فارسی ادب پر بھی بہت زیادہ عبور تھا۔ ان کی علمی، ادبی اور قومی وملی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بانیوں میں سے تھے۔ آپ اصول میں معتزلی تھے اور اشاعرہ کے سخت مخالف تھے۔ ان کی تصانیف میں سیرت النبیؐ، الفاروقؓ، سیرت النعمان، المامون، الغزالی، شعر العجم، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر مشہور کتابیں ہیں۔ آخری عمر میں سیرۃ النبی ﷺ لکھنی شروع کی لیکن اس کی پہلی جلد مکمل کی۔ اور دوسری جلد لکھ رہے تھے کہ ان کا پیمانہ حیات لبریز ہوگیا۔ سیرۃ النبی ﷺ کے بارے میں ان کے دو اشعار ہیں:

عجم کی مدح کی اور عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتمؐ
اور یوں میرا خاتمہ بالخیر ہونا تھا

علامہ شبلی اخلاق و عادات کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ وارفع انسان تھے۔ ضیاء الدین احمد برنی لکھتے ہیں:

''ان کی گفتگو انتہائی درجہ دلچسپ اور شگفتہ ہوتی تھی وہ آہستہ آہستہ اور اطمینان کے ساتھ باتیں کرنے کے عادی تھے۔ عجلت پسندی ان کے مزاج میں مطلق نہ تھی، ان کا طرز تکلم اس قدر شیریں تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔'' (عظمت رفتہ، ص ۲۶۹)

علامہ نے ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ مطابق نومبر ۱۹۱۴ء میں اعظم گڑھ میں رحلت فرمائی۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ شبلی نعمانی کے درمیان تعلقات کب استوار ہوئے اور ان دونوں کے درمیان پہلی ملاقات کب ہوئی۔ اس بارے میں جو شہادت ملتی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے مولوی عبدالرزاق کانپوری مصنف ''البرامکہ'' کو خط لکھا۔ اس میں مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ:

''اعظم گڑھ میں مولانا شبلی کا عمدہ کتب خانہ ہے۔ گذشتہ کانفرنس میں (جو کلکتہ میں

جلسہ ہوا تھا) مولانا شبلی صاحب سے نیاز حاصل ہوا تھا۔ تو میں نے عرض کیا کہ آپ کے کتب خانہ سے خادم مستفیض ہونا چاہتا ہے۔ مولانا موصوف نے فرمایا تھا کہ میں فہرست بھیجوں گا۔ شاید فرصت نہیں ہوئی، اس لیے ارسال نہیں کی۔"

(خطوط ابوالکلام آزاد، مرتبہ مالک رام، ص ۱۸)

مولانا آزاد کا یہ خط ۱۹۰۰ء کا ہے۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں دسمبر ۱۸۹۹ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس سے مولانا آزاد اور علامہ شبلی کی اولین ملاقات کی تاریخ تو متعین ہو جاتی ہے لیکن تعلقات میں استواری ۱۹۰۳ء میں شروع ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو جو اس وقت ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ تھی۔ علامہ شبلی کو اس کا سیکرٹری بنایا گیا۔ اور مولانا آزاد اس وقت اپنا رسالہ "لسان الصدق" نکال چکے تھے۔ "لسان الصدق" کے مقاصد میں ایک مقصد انجمن ترقی اردو کو فعال اور مضبوط بنانا تھا، اس لیے مولانا آزاد کو انجمن کا اسسٹنٹ سیکرٹری بنایا گیا تو تعلقات قریبی ہو گئے۔ لیکن زیادہ قریبی تعلقات کا دور ۱۹۰۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب مولانا ابوالکلام آزاد کو ماہنامہ "الندوہ" لکھنو کا مدیر معاون بنایا گیا۔ علامہ شبلی "الندوہ" کے مدیر تھے۔ مولانا آزاد اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک "الندوہ" کے مدیر معاون رہے۔ مولانا آزاد اس وقت تک علمی حلقوں میں متعارف ہو چکے تھے۔ علامہ شبلی اور مولانا آزاد ۶ ماہ تک لکھنو میں رہے تو دونوں کے تعلقات اور زیادہ قریبی اور مستحکم ہو گئے۔

مولانا کا پہلا مضمون "مسلمانوں کا ذخیرہ علوم اور یورپ" اکتوبر ۱۹۰۶ء کے "الندوہ" میں چھپا۔ اس کے بعد "المرأۃ المسلمہ" کے نام سے قاسم بک اور فرید وجدی نے مسلمان عورتوں کی بے پردگی پر جو کچھ لکھا تھا، اس پر مفصل و مدلل تبصرہ لکھا۔ جو "الندوہ" میں بالاقساط عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔ "الندوہ" کے مضامین نے پورے ملک میں ابوالکلام کے نام کا ایسا غلغلہ بلند کیا کہ دنیائے صحافت میں ہر طرف سے ان کی مانگ ہونے لگی۔ چنانچہ مارچ ۱۹۰۶ء میں اس زمانے کے مشہور اخبار "وکیل امرتسر" میں چلے گئے۔

(سید سلیمان ندوی (شخصیت وادبی خدمات)، ص: ۳۴۴)

علامہ شبلی اور مولانا آزاد کی ملاقات کے بارے میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

''یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا......شبلی اور آزاد کی عمروں میں تقریباً ۳۱ سال کا فرق تھا۔لیکن علمی ذوق اور طبیعتوں کی مناسبت نے دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کردیا۔''

تعلقات کا اندازہ لگانے کے لیے دونوں (شبلی اور آزاد) کی خط و کتابت کو پیش نظر رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ علامہ شبلی مولانا آزاد کے علمی تبحر، ذوق مطالعہ اور وسعت معلومات (علمی، ادبی، تاریخی) وغیرہ سے واقف ہو چکے تھے۔ مولانا آزاد کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

''جس قدر آپ کی عنایت و محبت کا یقین زیادہ ہوتا جاتا ہے اُسی قدر آپ کی نکتہ سنجی اور نقادی کی طرف میری طبیعت بے اختیار بڑھتی جاتی ہے کہ آپ میری صحبت کو لطف انگیز اور یقیناً دوسروں کے مقابلے میں قابل ترجیح سمجھتے ہیں۔''

(مکاتیب شبلی، جلد اول، ص ۲۶۶)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری لکھتے ہیں کہ:

''بات دراصل یہ ہے کہ شبلی کو ابوالکلام کی شخصیت سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ ان کی عبقریت سے شبلی کا ایسا جہاندیدہ کیسے ناواقف رہتا۔ شبلی جانتے تھے کہ یہ نوجوان مستقبل کا بڑا آدمی ہوگا۔ آزاد نے شبلی کی محبت سے پورا پورا فیض اُٹھایا۔ آخری دنوں میں جب کہ شبلی سیرۃ النبی ﷺ کی تکمیل کا کام نہ کر سکے تو ان کی نظر میں ابوالکلام ہی کی شخصیت تھی جو اس اہم کام کو سرانجام دے سکتی تھی۔ چنانچہ انتقال سے چار روز قبل ایک تار آزاد کے نام روانہ کیا تھا کہ وہ اس اثنا میں مل جائیں تاکہ سیرت نبوی کی اسکیم کا کچھ انتظام ہو جائے۔''

افسوس کہ آزاد وقت پر نہ پہنچ سکے اور شبلی کے ساتھ آخری لمحات نہ گزار سکے لیکن آزاد شبلی کی صحبتوں کو کیسے فراموش کر دیتے۔ ان کے دل میں مولانا شبلی کی بڑی عزت تھی۔ ابوالکلام کا ایک مکتوب قابل ملاحظہ ہے جو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ۲۶

۷ر اکتوبر ۱۹۴۰ء کو تحریر فرمایا تھا۔

مولانا ابوالکلام لکھتے ہیں:

''فی الحقیقت مولانا مرحوم کی ذات نبوغ و کمال کے رنگا رنگ مظاہر کا ایک مجموعہ تھی۔ جیسا کہ فارسی میں لکھتے ہیں سرتا مغز بے پوست تھی۔ بہ مشکل کوئی ایسا مہینہ گزرتا ہے کہ دو تین مرتبہ ان کی یاد ناخن بہ دِل نہ ہوتی ہو، وہ کیا گئے علم و فن کی صحبتوں کا سرتا سر خاتمہ ہو گیا۔ مولانا مرحوم نے سحر خیزی کا عادی بنا دیا تھا۔ اس اشتراک عادت نے ایک خاص رشتہ انس پیدا کر دیا تھا۔ جب کبھی یک جائی ہوتی تو صبح چار بجے کا وقت عجب لطف و کیفیت کا وقت ہوتا۔ چائے کا دور چلتا، علم و فن اور شعر و ادب کے چرچے رہتے۔ ہر وادی میں وہ اپنے ذوق و فکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے چند بزرگ دوست اور عقیدت مند، ص ۵۰، ۵۱)

علامہ شبلی سے مولانا آزاد کے تعلقات اس وقت شروع ہوئے جب وہ صرف گیارہ بارہ سال کے تھے اور جب تعلقات دن بدن زیادہ استوار ہونے لگے تو لوگوں نے یہی سمجھا کہ مولانا آزاد شبلی کے شاگرد تھے اور یہ غلط فہمی عرصہ تک قائم رہی۔ مولانا عبداللطیف سوہدروی نے گونڈہ جیل میں مولانا سے پوچھا:

''مولانا! کیا علامہ شبلی آپ کے استاد تھے۔''

مولانا نے جواب دیا:

''نہیں میرے بھائی وہ میرے استاد نہیں دوست تھے۔''

(مولانا ابوالکلام اور ان کے عقیدت مند، ص: ٦٨)

علامہ شبلی کو مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت زیادہ تعلق خاطر تھا۔ مولانا ابوعلی اثری لکھتے ہیں کہ:

''مولانا شبلی اپنے وسیع حلقہ احباب میں جن میں نواب محسن الملک، عماد الملک، سید حسین بلگرامی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا عبداللہ ٹونکی، مولانا

شاہ سلیمان صاحب پھلواروی جیسی مقدس اور صاحب علم ہستیاں شامل تھیں۔
سب سے زیادہ تعلق مولانا ابوالکلام سے رکھتے تھے۔ اور ان سے اپنا کوئی راز چھپاتے نہیں تھے۔ اپنے تمام معاملات میں خواہ وہ قومی ہوں یا ملی، سیاسی ہوں یا علمی، ان کا تعلق علی گڑھ سے ہو یا ندوہ سے، تصنیف و تالیف سے ہو یا تعلیم و تربیت سے، پبلک سے ہو یا حکومت سے زیادہ انہی پر اعتماد کرتے تھے۔''

(امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، از ابوعلی اثری، ص: ۹۹)

مولانا ابوالکلام آزاد بھی علامہ شبلی کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ اور شبلی کی زندگی کے آخر تک ان کو اپنا مربی، سرپرست اور ہمدرد سمجھتے رہے۔ ندوہ کے معاملہ میں ان کا پورا ساتھ دیا۔ جب مولانا شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ لکھنی شروع کی تو اس کی اہمیت اور ضرورت پر ''الہلال'' میں مضمون لکھا۔ جب علامہ شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ کا مقدمہ ''الہلال'' میں اشاعت کے لیے بھیجا تو اس کو ''الہلال'' میں شائع کیا۔ جس کی صدائے بازگشت سے سارا ہندوستان گونج اُٹھا۔ اور ہر شخص علامہ شبلی کے اس مقدس کام سے واقف ہو گیا۔

پروفیسر مسعود الحسن عثمانی نے اپنے ایک مضمون ''شبلی اور ابوالکلام'' میں مولانا کا ایک خط نقل کیا ہے جو مولانا آزاد نے علامہ شبلی کے انتقال کے بعد لکھا۔

مولانا لکھتے ہیں:

''مجھے ان صحبتوں سے بہت فائدہ ہوا۔ مولانا مرحوم کے انتقال سے جہاں کتنی ہی خوبیاں اور کمالات ان کے ساتھ مدفون ہو گئے۔ وہاں ایک سب سے بڑی چیز یہ پُر لطف جنت تھی، جو ان کے بعد ایک مرتبہ بھی مجھے کہیں کسی گوشے اور کسی حلقے میں میسر نہ آئی۔ ان کا علمی ذوق جو بہت وسیع تھا۔ ایک ساتھ ہی مدفون ہو چکا۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد اور اس کے عقیدت مند، ص: ۶۴)

علامہ شبلی ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم تھے۔ اور آپ ندوہ کے نصاب تعلیم میں کچھ تبدیلیاں کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے۔ طلبائے ندوہ علامہ شبلی کے اس اقدام سے متفق تھے۔ لیکن ارباب حل وعقد اس کے مخالف تھے۔ اس لیے ارباب حل و

عقد ندوہ اور علامہ شبلی کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ اور علامہ اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ ۱۴، شعبان ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹، جولائی ۱۹۱۳ء کو آپ نے معتمدی سے استعفیٰ دے دیا۔ علامہ کے استعفیٰ سے طلبائے ندوہ نے اسٹرائک کر دی۔ علامہ اس وقت بمبئی میں مقیم تھے۔ طلبائے ندوہ نے علامہ کو تار دیے کہ آپ اپنا استعفیٰ واپس لیں لیکن علامہ اپنے عزم پر قائم رہے۔ انہوں نے بدستور ایک رکن کی حیثیت سے ندوہ کی خدمت کرنے کا وعدہ کیا۔ ۸/دسمبر ۱۹۱۳ء کو علامہ شبلی لکھنو تشریف لائے۔ اور مارچ ۱۹۱۴ء تک لکھنو میں اقامت گزیں رہے۔ یہاں طلباء آپ سے استفادہ کرتے رہے اور اس کے ساتھ استعفیٰ واپس لینے پر زور دیتے رہے۔ لیکن علامہ اپنے موقف پر قائم رہے اور استعفیٰ واپس لینے پر راضی نہ ہوئے۔ جب طلبائے ندوہ نے دیکھا کہ علامہ شبلی استعفیٰ واپس لینے پر رضا مند نہیں ہو رہے تو اسٹرائک ختم نہ کرنے کا اعلان کر دیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

> ”یہ ندوہ کی وہ تاریخی اسٹرائک ہے جس نے سارے ملک کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اور وہ اس وقت کے تعلیم یافتہ حلقوں کا ایک زندہ اور سنجیدہ مسئلہ بن گیا۔ ملک کے متعدد کثیر الاشاعت اور آزاد خیال پرچوں نے جو نوجوانوں میں بہت زیادہ مقبول تھے اس اسٹرائک کو ایک قومی و ملی مسئلہ بنا دیا۔ ہمدرد دہلی، زمیندار لاہور، مسلم گزٹ لکھنو، الہلال کلکتہ کے صفحات گویا علامہ شبلی کی حمایت اور طلباء کی ہمدردی کے لیے وقف تھے۔ سب سے بڑھ کر مولانا ابوالکلام آزاد کے آتش ریز اور طوفان خیز قلم نے ایک ہلچل مچا رکھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عالم اسلامی کا سب سے بڑا حادثہ پیش آیا ہے۔ اور ملت اسلامی کا عروج و ترقی ندوہ کی اصلاح پر موقوف ہے جس کی راہ میں چند استبداد پسند اور قدامت پرست علماء حائل ہیں۔ ملک میں جا بجا جلسے ہو رہے تھے۔ جن میں ندوہ کی اصلاح اور طلباء کے ساتھ انصاف کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔“

(حیات عبدالحی، ص: ۱۷۲)

مولانا ابوالکلام آزاد علامہ شبلی کے استعفیٰ کے بعد مستقل طور پر مصالحت کی کوشش میں مصروف رہے۔ اور انہی کی کوششوں سے ایک ''مجلس اصلاح ندوہ'' کا قیام عمل میں آیا۔ اور ملک کے بڑے بڑے عمائدین اور مشاہیر نے اس کی رکنیت قبول کی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اس موقع پر مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں مرحوم نے مسیحائی کی اور اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انہوں نے دہلی میں ایک مجلس مشاورت کی دعوت دی۔ مولانا محمد علی جوہر نے بھی اس میں پوری دلچسپی لی۔ وہ پہلے اس کے حق میں تھے کہ اسٹرائک پہلے ختم ہو۔ پھر مطالبات پر غور کیا جائے۔ لیکن جب طلباء نے ان کے اعتماد اور ذمہ داری پر اسٹرائک ختم کر دینے کا اعلان کیا تو انہوں نے اصطلاحی کمیٹی میں شرکت کی۔''

۱۰، مئی ۱۹۱۴ء کو دہلی میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کی صدارت میں اصلاحی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، خواجہ غلام الثقلین، حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام، مرزا حیرت دہلوی، سید جالب دہلوی، مولانا عبدالوہاب بہاری وغیرہ نے شرکت کی۔ ایک سب کمیٹی بنائی گئی، جس کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ ندوہ کے لیے ایک دستور العمل بنائے۔ جس میں کسی کو بلا مشورہ اپنی رائے سے کارروائی کا موقع نہ ملے۔ دستور کے بنانے کا کام پیرزادہ محمد حسین (پنشنر جج دہلی) کے سپرد ہوا۔ اور حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، خواجہ غلام الثقلین، نواب علی حسن خاں، اور حکیم عبدالولی (جھوائی ٹولہ لکھنو) ممبر منتخب ہوئے۔ پیرزادہ صاحب نے یہ کام مکمل کر دیا۔

(حیات عبدالحی، ص:۱۷۴، ۱۷۵)

پروفیسر مسعود الحسن عثمانی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا شبلی کے استعفیٰ کے بعد مولانا آزاد مستقل طور پر مصالحت کی کوشش کرتے رہے۔ اور انہی کوششوں سے ایک مجلس اصلاح ندوہ کا قیام عمل میں

آیا۔ وہ خود بھی اس کے ممبر تھے۔ لیکن مولانا شبلی کی زندگی میں وہ اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ شبلی کے انتقال کے بعد اگرچہ ہوا وہی جو وہ چاہتے تھے۔ مولانا ابوالکلام مسلسل کوشش کرتے رہے اور بالآخر سارے مسائل اس وقت طے ہوئے جب مولانا شبلی اس دنیا میں موجود نہیں تھے۔ ایک عام جلسے میں ندوہ کے تمام اختلافات کے خاتمے کا اعلان مولانا آزاد ہی نے کیا۔ لیکن بقول سید سلیمان ندوی ''افسوس اس منظر کو دیکھنے کے لیے ہم میں وہ موجود نہ تھا جس کو اس کے دیکھنے کی سب سے زیادہ آرزو تھی۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے عقیدت مند، ص: ۶۵)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ، مولانا ابوعلی اثری، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری اور پروفیسر مسعود الحسن عثمانی کی تحریروں سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام کے آپس میں کیسے تعلقات تھے۔

سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ:

علامہ سید سلیمان ندوی علوم اسلامیہ کا بحر زخار تھے۔ اور ان کا شمار برصغیر کے نامور علماء میں ہوتا تھا، اور پورے برصغیر میں جو چوٹی کے مصنف اور فاضل ہوئے ہیں۔ ان میں بھی ان کا نام سرفہرست ہے۔ آپ ایک جامع اور ہمہ گیر شخصیت تھے۔ آپ جامع الصفات والکمالات تھے۔

سید صاحب بیک وقت مفسر قرآن بھی تھے اور محدث بھی۔ مؤرخ بھی تھے اور محقق بھی، فقیہہ بھی تھے اور فلسفی بھی، معلم بھی تھے اور متکلم بھی، ادیب بھی تھے اور دانشور بھی، نقاد بھی تھے اور مبصر بھی، ادیب بھی تھے اور شاعر بھی، صحافی بھی تھے اور مصنف بھی، نعت نویس بھی تھے اور صوفی بھی اور سب سے بڑھ کر آپ سیرت نگار بھی تھے غرض ان کے قلم کی جولانیوں سے کوئی میدان بھی محروم نہیں رہا۔ ادب وتنقید کا میدان ہو، یا تاریخ نویسی کا، سیاسی موضوعات ہوں یا دقیق علمی مباحث، ہر موضوع پر ان کا اشہب قلم یکساں جولانی دکھاتا تھا۔

عقیدۃً سید صاحب کا رجحان ابتداء میں اہلحدیث کی جانب تھا۔

''تراجم علمائے حدیث'' کے مصنف مولوی ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی مقدمۂ کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

''اس میں بعض ایسے علماء حدیث کے حالات بھی شامل ہیں جو غلو وافراط سے خالی، توحید وسنت کے متبع اور سلف صالحین کے پیرو ہیں۔ اور حق کو کسی امام خاص میں منحصر نہیں سمجھتے۔ باقی اپنی نسبت کیا کہوں:

دوستاں ایں تہمت شیوہ بمانیز کنند

میں شدت کا پیرو اور توحید خالص کا معتقد ہوں ......شدت کو دلیل مانتا ہوں اور علماء کے لیے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھلا مانتا ہوں اور حق کو ائمہ سلف میں کسی ایک میں منحصر نہیں سمجھتا۔ اب آپ اس پر مجھے جو چاہے سمجھ لیں:

آزاد رَو ہوں اور میرا مسلک ہے صلح کل
ہر گز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

(تراجم علمائے حدیث ہند، ص:۳۴)

۱۹۴۲ء میں سید صاحب مولانا عبدالماجد دریا بادی کی تحریک پر مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے اور ان سے بیعت کرلی۔ تاہم سید صاحب مقلد جامد نہ تھے۔

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی لکھتے ہیں:

''حقیقت امر یہ ہے کہ سید صاحب نے عقاید کے معاملہ میں سلف صالحین کا کامل تتبع کیا ہے لیکن فقہیات میں کسی ایک مجتہد کی پوری تقلید نہیں کی۔ بلکہ دلائل کی تنقید کے بعد فقہا کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے مگر کبھی کوئی ایسی راہ اختیار نہیں کی جس کی تائید ائمہ حق میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو۔ مسائل کی تشریح میں حافظ ابن قیم، حافظ ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کی تحقیقات پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔''

(علامہ سید سلیمان ندوی (شخصیت و ادبی خدمات، ص ۱۲۶)

سید صاحب اپنے علمی تبحر کی وجہ سے تمام مکاتب فکر میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے جاتے تھے۔ جمعیۃ العلماء ہند جو علماء کی سب سے بڑی جماعت ہے۔ اور اس میں غالب اکثریت علمائے دیوبند کی ہے کے رکن تھے۔ علمائے اہلحدیث بھی سید صاحب کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا عبدالقادر قصوری، شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی وغیرہ سے ان کے تعلقات تھے۔

(حیات سلیمان، ص: ٦٧٦)

سید صاحب کا شمار نامور مصنفین میں ہوتا ہے اور ان کی تمام تصانیف اہل علم میں مقبول ہیں۔ سیرۃ النبیؐ (جلد سوم تا ہفتم)، خطبات مدراس، سیرۃ عائشہؓ، حیات امام مالک، خیام، عرب و ہند کے تعلقات وغیرہ ان کی بلند پایہ کتابیں ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی ندوۃ العلماء میں ۱۹۰۱ء میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۶ء میں سند فراغت حاصل کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک ''الندوہ'' کے سب ایڈیٹر رہے۔ اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد سے تعارف ہوا۔ اس تعارف نے بعد میں دوستی اور پھر رفاقت کی صورت اختیار کر لی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے ''الہلال'' جاری کیا، تو سید صاحب کو ندوۃ العلماء سے بلوا کر ''الہلال'' کے ادارۂ تحریر میں شامل کیا۔ سید صاحب اس وقت ندوۃ العلماء میں عربی ادب کے اُستاد تھے۔

سید صاحب ''الہلال'' میں زیادہ عرصہ نہیں رہے۔ ۱۹۱۴ء کے شروع میں آپ دکن کالج پونہ میں فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نہیں چاہتے تھے کہ سید صاحب ''الہلال'' سے علیحدہ ہوں۔ لیکن سید صاحب علامہ شبلی کے دباؤ سے پونہ چلے گئے۔ پونہ میں آپ کی تقرری علامہ شبلی کی کوششوں سے ہوئی تھی۔ بہر حال جب سید صاحب ''الہلال'' کو چھوڑ کر پونہ چلے گئے تو مولانا آزاد نے آپ کو لکھا کہ:

''آپ نے پونہ میں پروفیسری قبول کر لی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو درس و تعلیم مدارس سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لیے بنایا ہے۔ خدا کے لیے میری سنیے

اور مجھے اپنا ایک مخلص بھائی تصور کیجیے۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور خدا شاہد ہے کہ آپ کی محبت دل میں رکھتا ہوں ...... کیا حاصل اس سے کہ آپ نے چند طالب علموں کو فارسی و عربی سکھلا دی۔ آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھلا سکتے ہیں۔''

سید صاحب نے اس خط کا جواب دیا یا نہیں دیا۔ لیکن اس وقت کے حالات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ سید صاحب اور مولانا آزاد کے درمیان کافی عرصہ تک خط و کتابت نہیں ہوئی۔ ''الہلال'' ۱۳، جولائی ۱۹۱۲ء کو جاری ہوا تھا۔ ۱۶ نومبر ۱۹۱۴ء کو دس ہزار کی ضمانت جمع نہ کرانے کی وجہ سے بند ہو گیا؛ ۱۳ر نومبر ۱۹۱۵ء کو ''البلاغ'' جاری کیا۔ جو اپریل ۱۹۱۶ء کو مولانا آزاد کے صوبہ بدر ہو جانے کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اور ساتھ ہی مولانا کو رانچی (بہار) میں چار سال کے لیے نظر بند کر دیا گیا۔ اور یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا کو رہائی ملی۔ رہائی کے بعد مولانا ابوالکلام کا ہندوستان کی داخلی سیاست میں بہت زیادہ عمل دخل شروع ہو گیا۔ آپ نے مختلف سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے جلسوں میں شرکت کرنی شروع کی۔ کئی جلسوں میں خطبہ ہائے صدارت ارشاد فرمائے۔ کئی جلسوں میں تقریروں کا سلسلہ جاری رہا آل انڈیا نیشنل کانفرنس کے کئی اجلاسوں کی صدارت کی، کئی بار اسیر زنداں بھی ہوئے۔ یہ سلسلہ ۲۰، ۲۲ سال تک چلتا رہا۔ تا آنکہ ۹، اگست ۱۹۴۲ء کو آپ کو گرفتار کر کے قلعہ احمد نگر میں نظر بند کر دیا گیا۔ جہاں سے آپ کو ۱۵، جون ۱۹۴۵ء کو رہائی ملی۔

مولانا ابو علی اثری اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

''مولانا ابوالکلام آزاد کے قلعہ احمد نگر جیل سے نکلنے کے ساتھ ہی ہندوستان کے سیاسی حالات میں بڑی تیز رفتاری بلکہ برق رفتاری کے ساتھ تبدیلیاں شروع ہو گئیں اور مولانا کانگرس کی مسند صدارت پر فائز ہونے کی وجہ سے ان میں ایسا مشغول ہوئے کہ دوست احباب، اعزا و اقارب سے خط و کتابت تو درکنار کسی اور غیر سیاسی کام کی طرف ان کو متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ قلعہ احمد نگر جیل سے رہا ہوئے تو ورکنگ کمیٹی کا پورا قافلہ ان کی رہنمائی میں

ویول کانفرنس میں شرکت کے لیے شملہ روانہ ہو گیا۔ کانفرنس کا سلسلہ ویول صاحب کی صدارت میں ہفتوں جاری رہا۔ مگر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا اور ویول کانفرنس ناکام ہو گئی۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد کے چند بزرگ دوست، ص: ۷۵)

"الہلال" مولانا ابوالکلام آزاد کا شہرہ آفاق اخبار تھا۔ اور مختلف حیثیتوں سے اُردو صحافت میں ایک نیا باب تھا۔ یہ اخبار صحیح معنوں میں برصغیر کی اردو صحافت میں سنگ میل ثابت ہوا۔ اور یہ بات سوفی صد صحیح ہے کہ اس کی عہد آفریں شہرت وعظمت اور مقبولیت کا سہرا مولانا ابوالکلام کی نابغہ شخصیت کے سر ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سید صاحب کا بھی اس میں نمایاں حصہ ہے اور "الہلال" کو بدر کامل بنانے میں سید سلیمان ندوی نے نمایاں خدمات انجام دیں۔

سید صاحب نے اپنے قیام "الہلال" کے دوران بیشتر مضامین "الہلال" میں تحریر کیے۔ "الہلال" میں مضمون نگار کا نام نہیں شائع ہوتا تھا۔ اس لیے "الہلال" میں جتنے مضامین شائع ہوتے تھے، وہ سب مولانا ابوالکلام آزاد کے تصور کیے جاتے تھے۔ چنانچہ جب "الہلال" کے منتخب مضامین کتابی صورت میں "مضامین الہلال" یا "مقالات الہلال" یا "انتخاب الہلال" یا نگارشات آزاد یا تصریحات آزاد وغیرہ کے نام سے شائع ہوئے تو یہ سب مضامین ومقالات مولانا ابوالکلام کی طرف منسوب کر دیے گئے۔ حالانکہ ان میں بیشتر مضامین دوسرے اصحاب کے تھے۔

ان مضامین میں کشف ساق، اسوہ نوحی، اور اسوہ ابراہیمی، علامہ عبداللہ عمادی کے، الحرب فی الاسلام، مولانا عبدالسلام ندوی اور انسانیت موت کے دروازے پر "مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی کاوش فکر کا ثمرہ ہیں۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ:

"الہلال" میں میرا نام نہیں چھپتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "عالم انسانیت موت کے دروازے پر" کے جتنے مضامین نکلے، انہیں لوگوں نے مولانا کی تصنیف

قرار دے کر کتابی صورت میں شائع کر دیا۔''

(ذکر آزاد، ص: ۲۳۴)

خود سید صاحب نے بھی اپنے بعض مضامین کے بارے میں تصریح کی ہے کہ:

''الہلال'' میں چونکہ مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے۔ اس لیے ''الہلال'' کے مضمونوں کے مجموعے شائع کرنے والوں نے بلا تحقیق ہر مضمون کو مولانا ابو الکلام آزاد کی طرف منسوب کر دیا۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ الحریت فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی اسرائیل، مشہد اکبر اول وغیرہ میرے مضامین ہیں۔''

(معارف اکبر، ۱۹۴۷ء)

الحریت فی اسلام کے بارے میں مولانا ابو الکلام آزاد نے خود اعتراف کیا ہے کہ یہ مضمون سید سلیمان ندوی کا ہے۔ جیسا کہ مولانا سید صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''الحریت فی الاسلام'' کے چند نمبر جو آپ نے لکھے تھے شاید آپ لے گئے، انہیں ضرور بھیج دیجیے۔ اسی طرح چھپ جائے گا۔ اور سلسلہ مکمل ہو جائے گا۔''

(معارف جنوری ۱۹۵۴ء ص ۷۶)

''الہلال'' کے مضامین کے متعلق بحث کئی اخبارات و رسائل میں چل نکلی تو ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے مئی ۱۹۵۲ء میں سید صاحب کو براہ راست ایک خط لکھا جس میں سید صاحب سے استفسار کیا گیا تو سید صاحب نے جواب میں لکھا کہ:

''مسجد کان پور کے واقعہ کے زمانے میں ایڈیٹر صاحب کسی مصلحت سے مہینہ دو مہینہ کے لیے مسوری تشریف لے گئے۔ ان کی غیر حاضری میں میری اور عمادی صاحب کی تحریریں شائع ہوئیں۔ ان تحریروں میں مشہد اکبر، تذکار نزول قرآن، قصص بنی اسرائیل وغیرہ میرے مضامین ہیں۔''

جہاں تک یاد آتا ہے۔ حریت فی الاسلام کے سلسلہ میں اسلام کے نظام سیاسی کا مضمون میں نے لکھا تھا۔ جو اس سے پہلے ''الندوہ'' میں ''اسلام اور اشتراکیت'' کے عنوان

سے چھپ چکا ہے۔ پھر بعض دوسرے لوگوں کے لکھے ہوئے مضامین کی نشاندہی کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''مگر ناشرین نے ان سب کو ابوالکلام کے نام سے شائع کر دیا ہے اس میں ابوالکلام کا قصور خاموشی کے سوا کچھ دوسرا نہیں ہے۔ ظاہر ہے وہ اپنی شہرت کے لیے ہمارے قلم کے محتاج نہیں ہیں اور ہم لوگ بھی ان کے محتاج نہیں۔ مگر واقعہ واقعہ ہے۔''

سیّد صاحب اور مولانا آزاد کے تعلقات میں سرمو فرق نہیں آیا۔ سید صاحب نے جس کامیابی کے ساتھ دارالمصنفین کی آبیاری کی۔ مولانا ابوالکلام نے اپنے خطوط میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے بحیثیت وزیر تعلیم ہند دارالمصنفین کے لیے گراں قدر امداد ملی۔ اور یہ سب کچھ سید صاحب اور مولانا کے تعلقات کی وجہ سے تھا۔

مولانا ابوعلی اثری لکھتے ہیں کہ:

''سید صاحب کا جب تک دارالمصنفین میں قیام رہا۔ ان کی دعوت اور مولانا کی عذر خواہی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ان کو اپنی بے پناہ مشغولیتوں، سیاسی سرگرمیوں، پھر اس کے بعد وزارتی مصروفیتوں سے نہ کبھی فرصت ملی، اور نہ وہ دارالمصنفین آئے۔ اور سید صاحب یہ حسرت اپنے ساتھ کراچی لے گئے۔ سید صاحب کے پاکستان چلے جانے کے بعد تو کارکنان دارالمصنفین کی اُمیدوں اور تمناؤں کے وہی تنہا مرجع ہو گئے تھے۔ اس دور میں دارالمصنفین کو ان سے بڑی گرانقدر امداد ملی۔''

الہلال کے مضامین کے سلسلہ میں اخبارات و رسائل میں جو بحث چلی اس کے متعلق مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں کہ:

''ان دونوں بزرگوں (مولانا آزاد اور سید سلیمان) کے باہمی تعلقات کس درجہ خوشگوار اور دوستانہ تھے۔ سید صاحب نے معارف میں اپنے قلم سے مولانا ابوالکلام کی اس قدر تعریف کی ہے کہ مولانا کا بڑے سے بڑا مداح بھی اس

سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ دوسری جانب اگر مولانا کسی معاصر کی تعریف میں سخت کوتاہ قلم واقع ہوئے تھے۔ اور اس پر وہ فخر بھی کرتے تھے بایں ہمہ ان کو سید صاحب سے اور سید صاحب کے دارالمصنفین سے کیا تعلق تھا۔ اس کا اندازہ ان خطوط سے ہو سکتا ہے جو معارف میں شائع ہو چکے ہیں۔ نیز اس سے کہ مولانا نے شدید ترین مالی مشکلات کے زمانہ میں دارالمصنفین کی مدد کس جرأت اور فیاضی سے کی۔ اس بنا پر ان دونوں بزرگوں کے مرحوم ہو جانے کے بعد اب جو حضرات اس قسم کی تلخ اور ناگوار بحثیں اُٹھا رہے ہیں، وہ نہ اس ذریعہ سے علم و ادب کی کوئی خدمت انجام دے رہے ہیں، اور نہ ملت اسلامیہ کے ان دونوں گوہر ہائے تابندہ کے ساتھ انصاف کر رہے ہیں۔ بلکہ ان دونوں کی روحوں کے لیے تکالیف واذیت کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔''

(ماہنامہ برہان دہلی۔ مئی ۱۹۶۰ء)

عبدالسلام ندوی رحمہ اللہ:

مولانا عبدالسلام ندوی دبستان شبلی کے گل سرسبد تھے۔ تمام علوم اسلامیہ پر ان کا تبحر علمی مسلم تھا۔ مورخ اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے ادیب اور ناقد تھے۔ شعر و سخن کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ندوۃ العلماء میں فراغت کے بعد علامہ شبلی نے ان کو ندوہ میں ہی اُستاد مقرر کر دیا تھا۔ مارچ ۱۹۱۰ء تا اپریل ۱۹۱۱ء ندوۃ العلماء کے آرگن ''الندوہ'' کے سب ایڈیٹر رہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے کئی ایک مذہبی، دینی، علمی، تاریخی، ادبی اور تنقیدی مضامین ''الندوہ'' میں لکھے۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے ''الہلال'' جاری کیا تو مولانا کی تحریک پر ''الہلال'' کے ادارہ تحریر میں شامل ہو گئے۔

علامہ شبلی ان کے مضامین پڑھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ اور انہوں نے پیش گوئی کی تھی کہ مولانا عبدالسلام مستقبل میں ایک بہت بڑا عالم اور مصنف بنے گا۔ چنانچہ علامہ شبلی کی یہ پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ الہلال میں بھی آپ نے کئی ایک علمی و تاریخی اور

مذہبی مضامین لکھے۔ ''الہلال'' میں مضمون نگاروں کے نام نہیں چھپتے تھے، علامہ شبلی نے ان کو خط لکھا:

''تمہارے مضامین ''الہلال'' میں دیکھتا ہوں۔ مولوی ابو الکلام صاحب اجازت دیں تو نام لکھا کرو۔ ایسے مضامین گمنام ٹھیک نہیں۔ اس سے کیا فائدہ کہ ایک شخص کی زندگی گم ہو جائے۔''

(مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۷۹)

۱۹۱۵ء میں علامہ سید سلیمان ندوی نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی بنیاد رکھی تو سید صاحب نے مولانا عبدالسلام ندوی کو جو اُس وقت ''الہلال'' سے علیحدہ ہو چکے تھے لیکن کلکتہ میں قیام پذیر تھے، اعظم گڑھ بلا لیا۔ دارالمصنفین مولانا مسعود علی ندوی کے انتظامی تعاون اور مولانا عبدالسلام ندوی کے علمی اشتراک سے قائم ہوا۔

مولانا عبدالسلام ۱۹۱۵ء میں اعظم گڑھ آئے۔ اور ۱۹۵۶ء اپنی رحلت تک دارالمصنفین سے وابستہ رہے۔ اور اعظم گڑھ ہی اپنے اُستاد علامہ شبلی کے پہلو میں سپرد خاک کیے گئے۔ مولانا عبدالسلام ایک کامیاب مصنف تھے۔ ان کی تصانیف میں شعر الہند، اقبال کامل، امام رازی، سیرت عمر بن عبدالعزیز اور حکمائے اسلام مشہور کتابیں ہیں۔ مولانا عبدالسلام عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی بہت مہارت رکھتے تھے۔ ان کی کئی کتابیں عربی سے اُردو میں ترجمہ کی ہوئی ہیں۔ تاریخ فقہ اسلامی بھی عربی سے اُردو میں ترجمہ ہے۔ علاوہ ازیں آپ کی تصنیف اسوہ صحابہ جو دو جلدوں میں ہے۔ ان کی شہرت کا سبب بنی۔

مولانا عبدالسلام خاندانی اہلحدیث تھے۔ سینے پر ہاتھ باندھتے تھے۔ آٹھ رکعت تراویح کے قائل تھے اور اسی کو صحیح سمجھتے تھے۔ دارالمصنفین میں بیس رکعت تراویح کا اہتمام تھا۔ لیکن یہ آٹھ رکعت پڑھ کر چلے آتے تھے اور زندگی کے آخری ایام تک یہی معمول رہا۔ علامہ شبلی کے خاص تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا لیکن اپنے اُستاد کا مسلک اختیار نہیں کیا۔

مولانا ابو علی اثری لکھتے ہیں کہ:

مولانا عبدالسلام کی ابتدائی تعلیم مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں ہوئی تھی۔ جہاں

کے تعلیمی اسٹاف میں اہلحدیث اساتذہ بھی تھے۔ ندوہ میں مولانا شبلی کی ترغیب سے آئے اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کی بدولت مولانا شبلی کے مقرب ہو گئے۔ لیکن اس تقرب واختصاص کے باوجود انہوں نے مولانا کا مسلکی اثر قبول نہیں کیا۔ سید صاحب ہمیشہ ان کو ''وھبڑے'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ جس مسئلے میں بھی وہ ان سے تبادلہ خیالات فرماتے تھے اس میں ہمیشہ وہ اہل حدیث مسلک ہی کے مطابق رائے دیتے تھے۔

(چند رجال اہلحدیث، ص: ۹۷، ۹۸)

مولانا عبدالسلام کے مولانا ابوالکلام سے دوستانہ تعلقات ''الہلال'' کے زمانہ سے ہو گئے تھے۔ اور مولانا ابوالکلام، مولانا عبدالسلام کی علمی قابلیت کے معترف تھے۔ اور ہمیشہ ان کو عزت ومحبت سے یاد کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جب بھی مولانا سید سلیمان ندوی کو خط لکھتے تو ان کی خیریت معلوم کرنے کے ساتھ ان کے علمی مشاغل کے بارے میں ضرور دریافت کرتے تھے۔ جب مولانا عبدالسلام نے ڈاکٹر لیبان کی ایک عربی کتاب ترجمہ ''سر تطور الامم'' کا اُردو میں ''انقلاب الامم'' کے نام سے ترجمہ کیا تو اس کا ایک نسخہ مولانا ابوالکلام کو بھیجا گیا تو مولانا آزاد سید صاحب کو لکھتے ہیں کہ:

> ''مولانا عبدالسلام صاحب نے اصل کتاب کا ترجمہ اتنا پرزور، موثر اور دلچسپ کیا ہے کہ اس سے بہتر نہیں ہوسکتا۔ خوشی اس کی ہے کہ ایک عمدہ اور علمی کتاب اردو میں شائع ہوگئی۔''

مولانا عبدالسلام ندوی نے مولانا ابوالکلام آزاد سے اپنے تعلق خاطر کی بنا پر ۱۱ر جون ۱۹۵۶ء کو ایک خط لکھا۔ جس میں اپنی پیرانہ سالی، اور بیماری وغیرہ کا تذکرہ کیا۔ اور ساتھ ہی اپنی علمی مصروفیات کا بھی ذکر کیا۔ اور آخر میں ملاقات کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی مصروفیات بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ وزارت تعلیم کے زمانہ میں مولانا کو ملک کے اہل علم وادب جو خطوط لکھتے تھے۔ ان کا جواب مولانا اپنے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خاں سے لکھواتے تھے۔ خود نہیں لکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا عبدالسلام کے خط کا جواب بھی محمد اجمل خاں نے دیا:

مکرمی! تسلیم

''مولانا کو آپ کا خط ملا۔ ناسازیٔ مزاج کا حال معلوم ہوا۔ فرماتے ہیں کہ بہت دن ہوئے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی اگر آپ دہلی آئیں تو ملیں۔''

(محمد اجمل خاں)

ندوۃ العلماء لکھنو میں جب طلباء نے اسٹرائک کردی۔ جس سے پورے ملک میں ایک ہیجان سا پیدا ہوگیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا سید نواب علی حسن خاں جیسے اکابرین نے ندوہ کی اسٹرائک میں دلچسپی لی اور اسٹرائک کو ختم کرایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اسٹرائک کے سلسلہ میں ''الہلال'' میں پے در پے کئی مضامین لکھے۔ لیکن علماء میں ایک طبقہ اس کا سخت مخالف تھا اور اس کو بدعت سمجھتا تھا۔ اس کے سرخیل مولانا شبیر احمد عثمانی تھے۔ جس کا جواب مولانا عبدالسلام ندوی نے بہت پُر زور دلائل کے ساتھ دیا۔ اور ان کا مضمون الہلال میں ''الاعتصاب فی الاسلام'' کے نام سے چار قسطوں میں شائع ہوا۔

مولانا عبدالسلام ندوی کا یہ مضمون طلبائے ندوہ کی حمایت اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین (جو الہلال میں اسٹرائک کے متعلق تھے) کے دفاع میں لکھا گیا۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی وفات پر جو تعزیتی مضمون لکھا تھا اس میں اسٹرائک کی طرف اشارہ کیا ہے۔

سید صاحب لکھتے ہیں:

''۱۹۱۳-۱۴ کی بات ہے کہ ندوہ میں مولانا شبلی کے استعفیٰ پر ایک عظیم الشان اسٹرائک ہوئی تھی۔ جس میں علی گڑھ اور دیوبند وغیرہ ندوہ کے اہل اہتمام کے ساتھ تھے اور ملک وقوم کے آزاد اخبارات مولانا ابوالکلام کی رہنمائی میں طلباء کی تائید میں تھے۔ اس وقت مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کا ایک مضمون ''الاعتصاب فی الاسلام'' کے عنوان سے ''الہلال'' میں نکلا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا شبیر احمد صاحب کا مضمون اسی الہلال میں نکلا تھا۔ جس میں

اسٹرائک کو خلاف اصول بتایا تھا۔ پھر جب دیو بند کے احاطے تک اسٹرائکوں کا سیلاب آپہنچا تو ان کا یہ مضمون مجھے یاد آیا۔"

(یادرفتگاں ج،ص: ۳۹۸)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مولانا عبدالسلام کے علم و فضل کے معترف تھے۔ اور مولانا عبدالسلام بھی مولانا آزاد کی مذہبی، دینی، علمی، ادبی اور سیاسی خدمات کے معترف تھے۔ جیسا کہ مولانا عبدالسلام نے اپنے خط میں مولانا سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اور اپنی کتاب "حکمائے اسلام" خود دہلی لے جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اور مولانا سے ملاقات کی حسرت اپنے دل میں لے کر اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی رحمہ اللہ:

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد کے خاص رفقاء میں سے تھے۔ اور انہیں مولانا سے بہت زیادہ عقیدت اور محبت تھی۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مولانا کی رفاقت میں بسر ہوا۔ تعلیم کا آغاز ندوۃ العلماء لکھنو سے کیا۔ بعد ازاں ۱۹۱۴ء میں قاہرہ (مصر) چلے گئے۔ وہاں آپ نے شیخ محمد عبدہ کے تلمیذ رشید سید رشید رضا (مدیر المنار) کے مدرسہ میں داخلہ لیا۔ اور تفسیر قرآن وادب عربی میں تکمیل کی۔ ۱۹۱۸ء میں واپس آئے اور دوبارہ ندوۃ العلماء میں داخل ہو کر حدیث کی تحصیل کی۔

۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد سے تعلق ہوا اور بلا انقطاع مولانا کی وفات (۱۹۵۸ء) تک قائم رہا۔ ۱۹۲۱ء میں مولانا آزاد نظر بند ہوئے تو ان کے ساتھ دوسرے سیاسی لیڈر بھی تھے۔ ان میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی بھی شامل تھے۔ ان ایام اسیری میں مولانا ملیح آبادی نے مولانا آزاد کو کسی نہ کسی طرح تذکرہ کی دوسری جلد لکھنے کے لیے آمادہ کر لیا۔ چنانچہ مولانا آزاد بولتے جاتے تھے اور ملیح آبادی لکھتے جاتے تھے۔ چنانچہ یہ کتاب مولانا ابو الکلام آزاد کے انتقال کے بعد اپریل ۱۹۵۸ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" (بروایت ملیح آبادی) شائع ہوئی۔

۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد نے کلکتہ میں ''مدرسہ اسلامیہ'' قائم کیا تو مولانا عبدالرزق ملیح آبادی کو مدرسہ کا مہتمم بنایا۔ ستمبر ۱۹۱۱ء کو ہفت روزہ ''پیغام'' جاری کیا تو مولانا اس کے نگران تھے اور ملیح آبادی اس کے ایڈیٹر۔ اپریل ۱۹۲۳ء میں مولانا آزاد نے عربی رسالہ ''الجامعۃ'' جاری کیا تو ملیح آبادی اس کے ایڈیٹر تھے اور مولانا نگران تھے۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا نے دوبارہ ''الہلال'' جاری کیا تو اس کا نظم ونسق اور اس کی ترتیب وتسوید سب مولانا ملیح آبادی کرتے تھے۔ مولانا آزاد کا نام بطور نگران شائع ہوتا رہا۔

آزادی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے حکومت ہند کی طرف سے ایک عربی رسالہ ''الثقافۃ الہند'' جاری کیا۔ اس کے مدیر اعلیٰ بھی مولانا ملیح آبادی تھے۔ مولانا ملیح آبادی نے خود آزاد ہند کے نام سے کلکتہ سے ایک روزنامہ جاری کیا۔ یہ اخبار مولانا ملیح آبادی کی وفات (۱۹۵۹ء) کے بعد بھی ان کے فرزند اکبر احمد سعید ملیح آبادی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔

مولانا ملیح آبادی کو عربی زبان پر بہت زیادہ عبور حاصل تھا۔ ۱۹۲۷ء کے ''الہلال'' میں ان کے کئی علمی وتاریخی مضامین شائع ہوئے۔ ''انسانیت موت کے دروازے پر'' (یہ کتاب مولانا آزاد کی تالیف بتائی جاتی ہے اور انہی کے نام سے شائع ہو رہی ہے) کے عنوان سے مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ اور ''الہلال'' کی کئی قسطوں میں چھپا۔ اس طویل مضمون کے بارے میں مولانا ابوعلی اثری لکھتے ہیں کہ:

> ''مولانا ملیح آبادی نے ''انسانیت موت کے دروازے پر'' کے عنوان سے ایک مضمون کا سلسلہ دوسرے دور (۱۹۲۷ء) کے الہلال میں شروع کیا تھا۔ اس کی ابتداء آنحضرت ﷺ کی وفات سے کی تھی۔ الہلال کے بند ہو جانے سے یہ سلسلہ رک گیا اور مکمل نہ ہو سکا۔ اس کا ابتدائی حصہ ''رحلت مصطفیٰ ؐ'' کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔ یہ اردو میں اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو بہت مقبول ہوئی، اور کئی بار چھپی۔ یہ اُردو میں اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد کتاب ہے۔ اس سے کتب سیرۃ کے ذخیرہ میں بہت قیمتی اضافہ ہوا ہے۔

یہ اس قدر پر سوز اور رقت انگیز ہے کہ اس کے پڑھنے سے موت کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔"

(امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ص ۱۵۱)

مسلک کے اعتبار سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اہلحدیث تھے۔ مولانا ابوعلی اثری لکھتے ہیں کہ ایک بار مولانا ملیح آبادی دارالمصنفین اعظم گڑھ تشریف لائے۔ اور یہ کہہ کر مجھ ناچیز کا ان سے تعارف کرایا کہ یہ آپ کے ہم مسلک ہیں۔ مسکرائے اور بہت ہی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے مولانا ابوالکلام آزاد سے اپنی عقیدت و محبت کے پیش نظر "ذکر آزاد" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ یہ کتاب مولانا ملیح آبادی اور مولانا آزاد کی ۳۸ سالہ رفاقت کا نچوڑ ہے۔ اور یہ کتاب مولانا ملیح آبادی کی وفات (جون ۱۹۵۹ء) کے بعد ان کے صاحبزادے احمد سعید ملیح آبادی نے کلکتہ سے شائع کی۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یہ کتاب مولانا کی سوانح حیات نہیں ہے۔ اور نہ ان کے کارناموں کی داستان ہے۔ بلکہ یہ صرف اس طویل رفاقت کی دلچسپ و دلآویز کہانی ہے جو مرحوم کو مولانا آزاد کے ساتھ رہی تھی۔ اگرچہ مولانا کے علم و فضل اور سیاسی فکر و تدبر کا تذکرہ بھی ضمناً آ گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں بڑی بات یہ ہے کہ مولانا کی بعض خاص تحریریں جواب تک طبع نہیں ہوئی تھیں، یا طبع ہو چکی تھیں مگر نایاب ہوگئی تھیں۔ اس کتاب میں محفوظ ہوگئی ہیں۔"

(برہان، اگست: ۱۹۶۰ء)

مولانا ابوعلی اثری لکھتے ہیں کہ:

"ذکر آزاد" مولانا ابوالکلام آزاد اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کے باہمی تعلقات کی داستان ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا کے بہت سے غیر مطبوعہ مضامین، تحریریں اور خطوط جو اُنھوں نے مولوی عبدالرزاق صاحب کو لکھے

تھے۔اس میں آگئے ہیں۔''

(امام الہند، مولانا ابوالکلام آزاد، ص ۱۵۳)

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی مولانا آزاد سے بہت زیادہ محبت تھی۔اوران کے علم وفضل ،فکر وتدبر،فہم وبصیرت ، اصابت رائے ، سیرت کی پختگی اور محاسن اخلاق کے بہت زیادہ قائل تھے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری لکھتے ہیں: کہ ۱۹۲۱ء میں مولانا گرفتار ہوئے اوران کے ساتھ مولانا ملیح آبادی بھی اسیر زنداں ہوئے تو مولانا آزاد نے جیل کی زندگی کیسے گزاری، اس کو مولانا ملیح آبادی دیکھ کران کی عظمت کے بہت زیادہ معترف ہو گئے۔ڈاکٹر صاحب کے الفاظ درج ذیل ہیں:

'جیل کی زندگی اور قیدو بند کی حالت میں مولانا کے اطمینان وسکون ،انشراح قلب ، ذہن وفکر کی آسودگی ، اوقات کے نظم وانضباط ،معمولات کی ترتیب ، ظرف کی بلندی ،قلب کی کشادگی ،طبیعت کی شگفتگی ، ذوق کی لطافت ،مطالعے کے شوق،عبادت کے شغف کو دیکھ کران کی عظمت کے اور بھی قائل ہو گئے۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد کے چند بزرگ دوست، ص ۱۳۵)

مولانا محمد علی جوہر:

برصغیر (پاک و ہند) کی تحریک آزادی میں مولانا محمد علی جوہر کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔مولانا محمد علی ریاست رام پور کے باسی تھے۔اورافغانوں کی شاخ ککے زئی سے تعلق رکھتے تھے۔دو سال کے تھے کہ ان کے والد عبدالعلی خاں انتقال کر گئے۔عبدالعلی خاں کا شماررام پور کے عمائدین میں ہوتا تھا۔مولانا محمد علی کی تعلیم وتربیت ان کی والدہ نے کی۔علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انگلستان چلے گئے۔اورآئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوئے۔لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔تاہم بی اے کی ڈگری لے کر واپس آگئے۔

انگلستان سے واپسی کے بعد کچھ عرصہ تک رام پور کے محکمہ تعلیم میں ملازمت کی۔لیکن رام پور زیادہ نہ ٹھہر سکے۔اور ریاست بڑودہ چلے گئے۔اور وہاں محکمہ افیون میں ملازم ہو

گئے۔ اور پانچ برس کے بعد ریاست بڑودہ کی بھی ملازمت چھوڑ دی۔ اور یہ واقعہ ۱۹۱۰ء کا ہے۔

مولانا محمد علی انگریزی اور اُردو کے مایہ ناز ادیب تھے۔ اور اس کے ساتھ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ بڑودہ سے واپس آکر مولانا محمد علی کلکتہ چلے گئے۔ اور وہاں سے آپ نے ۱۹۱۱ء میں ہفت روزہ انگریزی اخبار ''کامریڈ'' جاری کیا۔ ''کامریڈ'' اخبار بہت اونچے درجے کا اخبار تھا۔ انگریز اس اخبار کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ اور اس کی لیڈی ہارڈنگ کامریڈ کے بہت شوقین تھے۔

۱۹۱۱ء میں شاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کا جشن دہلی میں ہوا۔ اور اس ملک کا دارالخلافہ کلکتہ سے دہلی منتقل ہوگیا۔ مولانا محمد علی بھی کلکتہ سے دہلی آگئے۔ اور ''کامریڈ'' کا دفتر بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ اور اسی کے ساتھ مولانا محمد علی نے دہلی سے روزنامہ ''ہمدرد'' بھی جاری کیا۔ اور ''ہمدرد'' ٹائپ میں شائع ہونے لگا۔ ''ہمدرد'' ایک کامیاب روزنامہ تھا۔

ضیاءالدین احمد برنی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا محمد علی ''ہمدرد'' کو عوام میں سیاسی بیداری پھیلانے کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ اور جب تک وہ اخبار زندہ رہا، وہ اسی مطمحِ نظر کے قریب ترین رہا۔

جب ''ہمدرد'' نکالنے کے سارے انتظامات مکمل ہوگئے تو مولانا نے اپنے دوست ڈاکٹر اقبال کو پیغام کے لیے لکھا۔ یہ پیغام پہلے نمبر میں نہ نکل سکا۔ دیر سے موصول ہونے کی وجہ سے ۲۵ فروری ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

وہ پیغام یہ ہے:

تجھے کیونکر فکر ہے اے گل دل صد چاکِ بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کرلے
اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا
جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطع آرزو کرلے
تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں

تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے
تنک بخشی کو استغناء سے پیغام خجالت دے
نہ رہ منت کش شبنم نگوں جام و سبو کر لے
نہیں ہے یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے
چمن میں غنچۂ گل سے یہ کہہ کر اُڑ گئی شبنم
مذاق جور گلچیں ہو تو پیدا رنگ و بو کر لے

(عظمت رفتہ ص ۴۹، ۵۰)

مولانا محمد علی کا شمار آل انڈیا کانگرس کے اکابرین میں ہوتا تھا۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اپنے زمانے کی تمام تحریکوں کے ممتاز لیڈروں میں شمار ہوتا تھا۔

جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے ہفت روزہ ''الہلال'' جاری کیا تو اس وقت مسلم یونیورسٹی کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ ''الہلال'' نے اول روز سے ہی اس تحریک کی حمایت میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ مولانا محمد علی کو اس تحریک (مسلم یونیورسٹی) سے کچھ اختلاف تھا۔ اور اس کی مخالفت کرتے تھے۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی اپنے ایک مقالہ ''مولانا محمد علی اور مولانا آزاد'' میں لکھتے ہیں کہ:

مولانا آزاد نے ''مسلم یونیورسٹی کمیٹی'' کے عنوان کے تحت لکھا:

''ہم کو معلوم ہے کہ ہمارے دوست وہی محمد علی ہیں جنھوں نے نواب محسن الملک کے زمانے میں اپنے کالج سے نئے نئے خطابات حاصل کیے تھے۔ اور پھر وہی محمد علی ہیں جنھوں نے ہمیشہ کالج کی زر پرستی کی مخالفت کی۔ اور ٹرسٹیوں کی دائمی نگرانی کے مسئلے کو چھیڑا۔ وہ گو ہمیشہ علی گڑھ میں رہے مگر ہم نے تو ہمیشہ ان کو اس کے باہر ہی دیکھا ہے اور اب تو میلوں دور دیکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے

جب چاہا تھا کہ آذر کے بتکدے کو توڑے تو خود اسی کے گھر میں خلیل بت شکن کو پیدا کر دیا تھا۔ ہم کو یقین ہے کہ محمد علی بھی علی گڑھ سے اس لیے اُٹھائے گئے ہیں تاکہ اپنے گھر کی دیواروں سے بت پرستی کے نقوش مٹا دیں۔

محمد علی سے ہمارے تعلقات اب صرف دوستانہ ہی نہیں بلکہ ایسے قریبی اور عزیزانہ ہیں کہ ان کی نسبت رائے قائم کرنے کا پورا موقع رکھتے ہیں۔ ہم نے اچھی طرح اندازہ کر لیا ہے کہ ان کے دل میں آزادی اور جوش دونوں چیزیں ہیں۔ یونیورسٹی کمیٹی کے متعلق عام طور پر موجودہ حالات نے بے اعتمادی اور شکوک پیدا کر دیے ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر وہ حق گوئی اور بے لاگ سچائی کی قدر و قیمت کو پیش نظر رکھ کر اپنی معلومات ظاہر کر دیں۔ وہ ابتداء سے شریک کار رہے ہیں اور ہم کو شکوک اور سوءِ ظن سے نجات دے سکتے ہیں۔''

(ماہنامہ جامعہ دہلی، اپریل ۱۹۷۹ء)

مولانا محمد علی نے مولانا آزاد کے اس مضمون کے جواب میں ''الہلال'' میں ایک مکتوب شائع کر دیا۔ جس میں مولانا محمد علی نے لکھا تھا:

''مانا کہ ''الہلال'' افق عالم پر اس وقت نمودار ہوا تھا مگر آزادی کے بدر کامل کو یہ کیسا گہن لگا کہ آج کامل ایک سال بعد ظلمت علی گڑھ پر نور ایمان غالب آیا ہے۔''

(الہلال ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' کی اسی اشاعت میں مولانا محمد علی کی اس تحریر کا جواب دیا۔ مولانا نے لکھا:

''آپ نے آزادی کا بدر کامل، اگر محض ''ہلال'' کا ضلع نبھانے کے لیے لکھا ہے تو اس زور عبارت سے خود بھی مزہ لیتا ہوں۔ لیکن اگر طنز ہے تو مزاح سے الگ ہو کر مجھے کہنے دیجیے کہ آزادی اور آزاد بیانی کے درجہ کو تو اپنی بساط سے بہت بلند سمجھتا ہوں۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے جن قربانیوں اور خود فروشیوں کی ضرورت ہے۔ وہ ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہو سکتیں۔ میرے

دل میں تو ایک لمحہ کے لیے بھی اس دعویٰ کا خطرہ نہیں گزرا۔ مگر میری محرومی سے آزادی کی آواز دُنیا سے معدوم نہیں ہوسکتی۔ اس کو مجھ میں نہ ڈھونڈیے۔ البتہ اس کی آواز اُٹھے تو کانوں کو بند نہ کیجیے۔"

بہر حال مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں مولانا آزاد اور مولانا محمد علی کے مابین کشمکش کا سلسلہ جاری رہا۔ تا آنکہ ۱۷، دسمبر ۱۹۲۰ء کو مسلم یونیورسٹی کا علی گڑھ میں افتتاح ہوگیا، اس سے پہلے مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے علی گڑھ کالج پر دھاوا بول دیا تھا۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں کہ:

"۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی، شوکت علی اور گاندھی جی وغیرہ نے علی گڑھ کالج پر دھاوا بول دیا۔ ملک کا اعتدال پسند طبقہ۔ جس میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے تعلیمی بائیکاٹ کے خلاف تھا۔ لیکن علی گڑھ کے طلباء کی ایک جماعت نے جس میں طلباء اور اساتذہ دونوں شامل تھے اور آزادی کے جوش سے زیادہ معمور تھے کالج چھوڑ دیا۔ اور کالج کے ارباب حل وعقد نے کچھ دنوں کے لیے کالج بند کردیا۔ اس سے کالج کو کچھ نقصان ضرور پہنچا مگر وہ ٹوٹنے سے بچ گیا۔ گاندھی جی اور مولانا محمد علی کالج میں تو ایک حد تک کامیاب ہوگئے مگر پنڈت مدن موہن مالویہ نے ہندو یونیورسٹی کے احاطہ میں کسی کو قدم نہ رکھنے دیا۔"

(حیات سلیمان ص ۲۷۳)

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی نے اس کا افتتاح کیا۔ اس کے اصل بانی مولانا محمد علی، حضرت شیخ الہند اور مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں تھے۔ اور اس کے ارکان میں مولانا سید سلیمان ندوی بھی شامل تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی کے مابین جو کشمکش جاری رہی، وہ ذاتی نہیں تھی بلکہ ایک قومی و سیاسی اختلاف تھا لیکن دونوں ایک دوسرے کے مداح اور قدردان تھے۔

مولانا محمد علی نے ایک بار فرمایا کہ:

''اسلام میں نے دو بزرگوں سے سیکھا، ایک شکوہ، جواب شکوہ کے مصنف اقبال سے، اور دوسرے ''الہلال'' کے مدیر مسئول مولانا ابوالکلام آزاد سے۔''

مولانا محمد علی نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح بھی لکھا کہ:

''میں نے لیڈری ابوالکلام آزاد کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی۔''

مولانا عبداللہ العمادی:

مولانا عبداللہ العمادی جون پور کے قریب ایک قصبہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد اور والدہ دنوں علوم اسلامیہ سے آشنا تھے۔ اس لیے انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر ہی حاصل کی۔ اور ان کے دادا بھی جید عالم دین تھے۔ ان سے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، لغت، ادب اور منطق وفلسفہ میں تعلیم حاصل کی۔ عربی زبان پر ان کو بہت عبور حاصل ہو گیا تھا۔ اپنے قصبہ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد لکھنؤ آ گئے۔ اور عربی ادب کی تحصیل مولانا عبدالعلی آسی مدراسی لکھنوی سے کی۔ مولانا آسی عربی میں رسالہ ''البیان'' نکالتے تھے۔ انہوں نے آپ کو ''البیان'' کا ایڈیٹر مقرر کر دیا اور آپ کافی عرصہ البیان کے ساتھ وابستہ رہے۔

ندوۃ العلماء لکھنو کا آرگن ''الندوہ'' علامہ شبلی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ مولانا ابوالکلام ''الندوہ'' سے علیحدہ ہو کر اخبار ''وکیل'' امرتسر میں چلے گئے تو علامہ شبلی نے مولانا سید سلیمان ندوی کو ''الندوہ'' کا سب ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ سید صاحب اپریل ۱۹۰۶ء سے مارچ ۱۹۰۸ء تک سب ایڈیٹری کی ذمہ داری نبھاتے رہے۔ اپریل ۱۹۰۸ء میں مولانا عبداللہ عمادی اس کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اور جون و جولائی ۱۹۰۸ء کے دو نمبر عمادی صاحب کی ادارت میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد سید صاحب دوبارہ ''الندوہ'' کے سب ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔

مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''۱۹۰۶ء میری تعلیم کا آخری سال ہے۔ مولانا ابوالکلام کے امرتسر جانے کے بعد مولانا شبلی نے ''الندوہ'' کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر رکھ دیا۔ جس کو میں نے مارچ ۱۹۰۸ء تک انجام دیا۔ اس کے بعد اپریل ۱۹۰۸ء سے یہ پھر عمادی صاحب کے سپرد ہوا۔ اور جون جولائی ۱۹۰۸ء کے دو نمبر ان کی ادارت

میں نکلے تھے کہ وہ پھر میرے حوالہ کر دیا گیا۔ اگست ۱۹۰۸ء سے فروری ۱۹۰۸ء تک میں نے دوبارہ اس کی ادارت کا فرض انجام دیا۔''

(حیات شبلی ص ۴۴۵)

لکھنو سے مولانا عبداللہ العمادی اخبار ''وکیل'' امرتسر میں چلے گئے۔ مولانا ابوالکلام بھی وہاں تھے، اور امرتسر میں ہی دونوں کے تعلقات استوار ہوئے۔ جب مولانا آزاد نے جولائی ۱۹۱۲ میں کلکتہ سے ''الہلال'' جاری کیا تو مولانا نے عمادی صاحب کو ''الہلال'' میں بلا لیا۔ ''الہلال'' میں آپ نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے۔ وہ بھی عام طور پر پسند کیے گئے۔ اہل علم نے ان کی قدر کی اور ان کے قلم کی پختگی کی داد دی۔

(امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، از ابو علی اثری، ص ۱۲۲)

''الہلال'' سے علیحدگی کے بعد مولانا عبداللہ العمادی حیدر آباد دکن چلے گئے۔ اور دارالترجمہ سے منسلک ہو گئے۔ حیدر آباد دکن میں آپ کا قیام بہت عرصہ رہا۔

مولانا عمادی صاحب مصنف تھے۔ ان کی تصانیف میں کئی کتابیں عربی سے ترجمہ ہیں۔ ان کی کتابوں کی تعداد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی نے انیس (۱۹) بتائی ہے۔ جن میں بعض کتابیں ابھی تک طبع نہیں ہوئیں۔ چند مشہور کتابیں یہ ہیں:

(۱) علم حدیث (۲) تاریخ عرب قدیم (۳) فلسفۃ القرآن (۴) کتاب الزکوۃ (۵) بدعات المحرم (۶) ترجمہ طبقات ابن سعد (۷) معارف الہند (عربی) (۸) کتاب الحریت والاستبداد (عربی) (۹) قول فیصل فی الرد علی الشیعۃ (۱۰) ترجمہ مروج الذہب للمسعودی (۱۱) ترجمہ الملل والنحل ابن حزم اندلسی۔

مولانا عبداللہ عمادی کو علوم اسلامیہ پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں کہ:

''شیخ عبداللہ عمادی دوسرے علوم و آداب میں بھی ماہر تھے۔ اور فنونِ حدیث وتفسیر، فقہ و اصول وعلم الکلام ان کے لیے سب برابر تھے۔ فی البدیہہ عربی، اُردو و فارسی میں لکھ سکتے تھے۔ آپ کی طبیعت شعر گوئی میں رواں تھی اور کتابت

وترجمہ میں آپ کا قلم رواں تھا، بہت سے علمی مضامین پر دسترس رکھتے تھے۔ بہترین مجلسیں قائم کرنے والے، شعر و ادب پر تنقید کرنے والے اور کتب مؤلفات پر بہت زیادہ باخبر بھی تھے۔''

(نزہۃ الخواطر جلد ۸ اُردو ص ۳۸۷)

مولانا ابوالکلام آزاد مولانا عمادی کے علم وفضل کے بہت زیادہ معترف تھے۔ اور ان پر مکمل اعتماد رکھتے تھے۔ مولانا ابوعلی اثری نے بھی مولانا عمادی کے علم وفضل کی توثیق کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''شرکائے ''الہلال'' میں بعض تو مضمون نگاری سے آگے نہیں بڑھے اور مضمون نگار اور صحافی ہی رہ گئے۔ اور بعض اُردو کے بہت بڑے مصنف اور ابوالکلام ہی کی طرح ادب وزبان کی دنیا میں بڑی شہرت کے مالک ہو گئے۔ انہیں میں ایک ''البیان'' عربی اور ''الندوہ'' اردو کے سابق ایڈیٹر مولانا عبداللہ العمادی تھے۔ جن کو اُردو اور عربی لکھنے پر یکساں قدرت حاصل تھی۔''

(امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، ص ۱۲۵)

شاعرِ مشرق علامہ اقبال:

علامہ اقبال ایک عظیم مفکر، حکیم الامت، مصور پاکستان اور فارسی و اُردو کے بہت بڑے شاعر تھے۔ وہ ایک عظیم فلسفی اور انگریزی، عربی اور فارسی زبانوں پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ وہ نہ صرف برصغیر (پاکستان و ہندوستان) بلکہ مشرق ومغرب میں ایک عظیم مفکر تسلیم کیے گئے ہیں۔ برصغیر کی تحریک آزادی میں ان کی خدمات سنہری حروف سے لکھی گئی ہیں۔ ان کو عام اسلام میں ایک عدیم النظیر محبوبیت حاصل تھی۔ ان کی اسلام دوستی اور ملت پروری مسلم تھی۔

ضیاء الدین احمد برنی لکھتے ہیں کہ:

علامہ اقبال بیگم عطیہ فیضی کی دعوت پر بمبئی تشریف لائے۔ وہاں دعوت کا انتظام کیا گیا۔ بیگم عطیہ فیضی نے معزز مہمانوں سے علامہ کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد علامہ نے ایک

مختصر تقریر کی اور اس کے ساتھ ان سے درخواست کی گئی کہ وہ کوئی پیغام دیں، علامہ نے اپنا ایک فارسی شعر سنایا۔ اور فرمایا یہی میرا پیغام ہے۔

وہ شعر یہ ہے:

چناں بزی کہ اگر مرگ تست مرگِ دوام
خدا نہ کردہ خود شرمسار تو گردد

جو لوگ فارسی سمجھتے تھے۔ وہ اس پیغام سے گہرے طور پر متاثر ہوئے۔ جو لوگ فارسی سے نابلد تھے۔ انہوں نے علامہ کو گھیر لیا۔ اور اصرار کیا کہ وہ اس شعر کا انگریزی میں ترجمہ لکھوا دیں۔ علامہ نے کھڑے کھڑے ترجمہ لکھوا دیا، وھو ہٰذا:

"LIVE SO BEAUTIFULLY THAT IF DEATH IS THE END OF ALL, GOD HIMSELF MAY BE PUT TO SHAME FOR HAVING ENDED THY CAREER."

(عظمت رفتہ ص ۲۷۵)

علامہ اقبال نے ۲۱، اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ پورے برصغیر اور عالم اسلام میں علامہ کی وفات کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ قرار دیا گیا۔ اخبارات و رسائل نے علامہ کی یاد میں خاص نمبر نکالے اور تعزیتی مقالے لکھے۔

مولانا سید سلیمان ندوی جن سے علامہ اقبال کے دیرینہ تعلقات تھے۔ اور علامہ اقبال انہیں "اُستاد الکل" فرمایا کرتے تھے، اپنے رسالہ معارف مئی ۱۹۳۸ء میں "ماتم اقبال" کے عنوان سے ایک تعزیتی مضمون لکھا۔ جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا۔ آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی۔ ایسا عارف فلسفی، محبّ رسول شاعر، فلسفہ اسلام کا ترجمان، اور کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو۔ اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق، اس کے شعر کا ہر پرپرواز بالِ جبریل تھا۔ اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی۔ لیکن اس کی زندگی کا ہر

کارنامہ جاوید نامہ بن کران شاءاللہ باقی رہے گا۔ امید ہے کہ ملت کا یہ غم خوار شاعراب عرش الٰہی کے سایہ میں ہوگا۔ اور قبول ومغفرت کے پھول اس پر برسائے جارہے ہوں گے۔ خداوندا۔ اس کے دلِ شکستہ کی جوملت کے غم سے رنجور تھا غم خواری فرما۔ اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کی قلب حزیں کو مسرور کر۔'

مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لیے ایک نیا پیام لایا تھا۔ وہ توحید خالص کا پرستار، دین کامل کا علمبردار، اور تجدید ملت کا طلبگار تھا۔ اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسول انام ﷺ کا عشق پیوست تھا۔ اور اس کی آنکھیں جسم اسلام کے ہر ناسور پر اشک بار رہتی تھیں۔ اس نے مستقبل اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا۔ اسی خواب کی تعبیر میں اس کی ساری عمر ختم ہوگئی۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں''

(یادرفتگان ص ۱۸۱)

ضیاء الدین احمد برنی نے علامہ کی وفات پر اپنے مضمون میں لکھا کہ:

''اقبال کی وفات سے اسلام کا ایک فقید المثال مفکر، مجتہد، فلسفی اور شاعر دنیا سے اُٹھ گیا:

عمر ہا درکعبہ و بت خانہ می نالد حیات

تا ز بزم عشق یک ''دانائے راز'' آید بروں

(عظمت رفتہ ص ۲۷۶)

اب یہاں علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جماعت اہلحدیث کے نامور مورخ اور سوانح نگار مولانا محمد اسحاق بھٹی نے اپنی کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں مولانا ابوالکلام آزاد کے حالات صفحہ ۱۷ تا صفحہ ۱۳۶ تک لکھے ہیں۔ اس میں مولانا آزاد اور علامہ اقبال کا تذکرہ صفحہ ۶۸ تا ۸۳ کیا ہے۔ میں یہاں بزم ارجمنداں سے چند ایک واقعات کا ذکر کرتا ہوں۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں کہ:

''بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کی کبھی باہم ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ مولانا بے شمار شعراء کے اشعار اپنی مختلف کتابوں میں درج کرتے ہیں لیکن اقبال کا کوئی شعر درج نہیں کرتے۔''

(بزم ارجمنداں ص ۶۸)

لاہور میں میاں عبدالعزیز مالواڈہ (بارایٹ لا) کی کوٹھی بیرون یکی دروازہ کو کسی زمانے میں برصغیر کے سیاسی رہنماؤں کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ مختلف اوقات میں قائداعظم محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا انور شاہ کشمیری، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، حکیم محمد اجمل خاں، موتی لعل نہرو اور جواہر لعل نہرو کئی دفعہ تشریف لائے۔ علامہ اقبال تو لاہور سے تعلق رکھتے تھے۔ اور کہنا چاہیے کہ میاں صاحب کا گھر ان کا اپنا گھر تھا۔

میاں عبدالعزیز مالواڈہ کے صاحبزادے میاں عبدالمجید بیان کرتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد لاہور تشریف لاتے تو علامہ اقبال سے ملاقات کے لیے تشریف لے جاتے اور نہایت خوشگوار ماحول میں مختلف مسائل پر سلسلہ کلام جاری رہتا تھا۔

اپریل ۱۹۰۵ء میں مولانا آزاد انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں تشریف لائے، اُس وقت مولانا ''لسان الصدق'' نکالتے تھے۔ اور عمر ۱۷ سال کی نہیں ہوئی تھی۔ مولانا نے ایک جامع تقریر کی۔ اور علامہ اقبال سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔

جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا آزاد نے ''الہلال'' جاری کیا تو علامہ اقبال نے اس میں پوری دلچسپی لی اور اس کا حلقہ اشاعت بڑھانے میں پوری معاونت کی۔ مولانا نے ''الہلال'' ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء کے صفحہ اول پر جو نوٹ تحریر فرمایا۔ اس میں لکھا کہ جناب شیخ محمد اقبال بیرسٹرایٹ لاء (لاہور) نے ''الہلال'' کے دس خریدار بنائے ہیں۔

افضل حق قرشی نے اپنی کتاب ''اقبال کے ممدوح علماء'' کے صفحہ ۲ پر لکھا ہے کہ:

''۱۹، فروری ۱۹۱۴ء کو مولانا آزاد انجمن ہلال احمر قسطنطنیہ کے وفد کے ہمراہ

لاہور آئے۔ اور اقبال سے بھی ملاقات ہوئی۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے 1915ء میں "البلاغ" جاری کیا تو اس کے پہلے شمارے میں صفحہ اول پر ادبیات کے تحت علامہ اقبال کی مشہور نظم "عرفی" کے عنوان سے چھپی۔

"محل ایسا کیا تعمیر عُرفی کے تخیل نے
تصدق جس پر حیرت خانۂ سینا و فارابی
فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی
میسر جس سے ہیں آنکھوں کو اب تک اشک عنابی
میرے دل نے یہ اک دن اس کی تربت سے شکایت کی
نہیں ہنگامۂ عالم میں اب سامانِ بے تابی
مزاج اہل عالم میں تغیر آگیا ایسا
کہ رخصت ہوگئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی
فغانِ نیم شب شاعر کی بارگوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشم محفل آشنائے لطف بے خوابی
کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیوں کر
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی
صدا تربت سے آئی شکوۂ اہل جہاں کم گو
نوارا تلخ تری زن چوذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تری خواں چو محمل راگراں بینی

(بانگ دراص ۲۳۸)

بھٹی صاحب مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:

"ایک دفعہ مولانا ابوالکلام آزاد لاہور تشریف لائے، علامہ اقبال سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ علامہ اقبال کے ہاں چودھری شہاب الدین بھی تھے۔ چودھری شہاب الدین علامہ اقبال کے بے تکلف دوست تھے۔ علامہ

اقبال نے مولانا آزاد سے کوئی بات پوچھی تو مولانا نے اس کا تفصیل سے جواب دیا۔ علامہ مطمئن ہو گئے۔ اور اس کے بعد خاموش ہو گئے۔''

چودھری شہاب الدین عموماً علامہ اقبال سے پنجابی میں بات کرتے تھے۔ اور پنجابی میں علامہ سے کہا:

اوئے ساڈے نال اوکھا ہوندا سیں ہن کر گل

مولانا آزاد تو ان کی بات سمجھ نہ پائے۔ لیکن دوسرے حاضرین مجلس چودھری کے انداز کلام سے بہت محظوظ ہوئے۔

علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کی خط و کتابت بھی رہی ہے۔ اور علامہ اقبال کی مولانا سید سلیمان ندوی سے جو خط و کتابت رہی ہے اس میں کئی خطوط میں علامہ اقبال نے مولانا ابوالکلام کا ذکر کیا ہے۔ یہاں چند ایسے خطوط کا حوالہ دیا جاتا ہے جن میں علامہ اقبال نے مولانا کا ذکر کیا ہے:

۱......۲۸، اپریل ۱۹۱۸ء

''والا نامہ ابھی ملا ہے، ''رموزِ بیخودی'' میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی۔ ریویو کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آج مولانا ابوالکلام کا خط آیا ہے انہوں نے بھی میری اس ناچیز (کتاب) کو بہت پسند فرمایا ہے۔''

(اقبالنامہ ج اص ۱۰۰)

۲......۳۰، اپریل ۱۹۱۹ء

''والا نامہ ملا۔ جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ الحمد للہ کہ مولانا آزاد کو آزادی ملی۔ (مولانا ابوالکلام آزاد رانچی کی نظر بندی سے جنگ عظیم کے بعد رہا ہوئے تھے۔) مولانا آزاد اب کہاں ہیں۔ پتہ لکھیے کہ ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔''

(اقبالنامہ، ج اص ۱۱۰،۱۰۱)

۳.....۱۰، نومبر ۱۹۱۹ء

''کئی دنوں سے آپ کو خط لکھنے کا قصد کر رہا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا، بہت دلچسپ کتاب ہے۔''

(اقبالنامہ ج ا ص ۱۱۰)

۴.....۱۸، اگست ۱۹۲۴ء

''حال ہی میں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی (کولمبیا) نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے ''مسلمانوں کے نظریات متعلقہ مالیات'' اس کتاب میں لکھا ہے کہ اجماع امت نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے.....مگر اُس نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ آپ سے یہ امر دریافت طلب ہے کہ کیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے۔ امر دیگر یہ ہے کہ آپ کی ذاتی رائے اس بارے میں کیا ہے۔ میں نے مولوی ابوالکلام صاحب کی خدمت میں عریضہ لکھا ہے۔''

(اقبالنامہ ج ا ص ۱۳۲)

۵.....۷، اگست ۱۹۳۶ء

''والا نامہ ابھی ملا۔ آپ کی صحت کی خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کو دیر تک زندہ و سلامت رکھے۔
الحمد للہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیانات چھپوائے ہیں مگر حال کے روشن خیال علماء کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔''

(اقبالنامہ ج ا ص ۱۹۹)

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال نے وفات پائی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ایک خط مجریہ ۲۵، اپریل ۱۹۳۸ء بنام مولانا محی الدین احمد قصوری لکھتے ہیں کہ:

''اقبال کی موت سے نہایت قلق ہوا۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں طیار بیٹھے ہیں۔''

ان الفاظ کے حاشیے میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ:

''مولانا نے اس قلق انگیز واقعے پر ایک بیان بھی دیا تھا۔ یہ چند الفاظ ہیں، لیکن دیکھئے ان میں درد دل کس طرح کھنچ آیا ہے۔''

(تبرکاتِ آزاد، ص۲۴۷)

پروفیسر افضل حق قرشی نے اپنی کتاب ''اقبال کے ممدوح علماء'' میں مولانا کا تعزیتی بیان نقل کیا ہے:

''یہ تصور کس قدر المناک ہے کہ اقبال ہم میں نہیں۔ جدید ہندوستان اُردو کا اس سے بڑا شاعر پیدا نہیں کرسکتا۔ ان کی فارسی شاعری کا بھی جدید فارسی ادب میں اپنا ایک مقام ہے۔ یہ تنہا ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ پورے مشرق کا نقصان ہے۔ ذاتی طور پر میں ایک پرانے دوست سے محروم ہو گیا ہوں۔''

مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب مولانا ابو الکلام آزاد اور علامہ اقبال کے مراسم سے متعلق لکھتے ہیں:

''کوئی اہم مسئلہ درپیش ہو تو علامہ خود بھی مولانا سے دریافت کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی ان کے علم وفضل سے مستفید ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ان کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور اپنی تصانیف ان کو بھجواتے ہیں۔ ان کے اخبار (الہلال) کے لیے خریدار مہیا کرتے ہیں، مولانا بھی ان کے فکر وفن، شاعرانہ کمالات اور فلسفہ وحکمت کے قدر دان ہیں اور برملا اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے اُردو کلام کو عربی کا جامہ پہناتے ہیں، اپنے اخبار (البلاغ) کے صفحہ اول پر ان کا کلام شائع کرتے ہیں۔ جب کہ ان کے علاوہ اس سے قبل یا بعد کسی بڑے سے بڑے شاعر کا کلام ''الہلال'' یا ''البلاغ'' کے پہلے صفحے پر چھپنے کا اعزاز حاصل نہیں کر پایا۔''

اپنی معروف کتاب ''غبار خاطر'' میں ان کا شعر درج کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کتاب

میں ان کے کسی معاصر شاعر کا کوئی شعر درج نہیں ہوا۔[1] ان کی وفات پر بیان دیتے ہیں۔ جس میں گہرے حزن وملال کا اظہار کیا جاتا ہے۔

معلوم نہیں بعض لوگ کیوں ان کو باہم لڑانے اور ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے پر زور دیتے ہیں۔ جبکہ یہ دونوں دوست ہیں۔ اور ایک دوسرے سے محبت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ (بزم ارجمنداں ص ۸۴، ۸۵)

مولانا عبدالقادر قصوری رحمہ اللہ:

مولانا عبدالقادر قصوری ایک جید عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ پنجاب کے مشہور وکیل بھی تھے۔ اور سیاسی لحاظ سے آل انڈیا کانگرس کے چوٹی کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ اور پنجاب کانگرس کے ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۰ء تک صدر رہے۔ مسلکاً اہلحدیث تھے۔ اور شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی جماعت مجاہدین سے بھی خاصا تعلق تھا۔ برصغیر کی تحریک آزادی میں ان کی نمایاں خدمات ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں تحریک ترکِ موالات میں حصہ لیا۔ اور وکالت چھوڑ دی جب کہ اس وقت ان کی آمدنی ہزاروں روپے ماہوار تھی۔

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ:

''ترک موالات میں وکالت چھوڑ دی تو ان کی آمدنی ہزاروں روپے ماہوار تھی۔ ۲۵-۱۹۲۴ء میں ترک موالات کی تحریک عملاً ختم ہو چکی تھی۔ اور ان کے

---

(۱) شعر یہ ہے:

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ، ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

(غبارِ خاطر طبع دہلی ص ۲۲۷)

مالک رام لکھتے ہیں:

''اقبال کا شعر ہے۔ (زبورِ عجم ص ۱۰۱)۔ سید مقبول حسین بلگرامی نے اقبال سے درخواست کی تھی کہ مرقع (وصل کا ماہانہ رسالہ) کے سرورق پر چھاپنے کے لیے کوئی شعر عنایت فرمایے۔ اس پر اقبال نے یہ شعر لکھ کر بھیجا تھا۔ چنانچہ تین برس تک یہ مرقع کے سر پر چھپتا رہا۔''

(غبارِ خاطر طبع دہلی ص ۳۷۰)

بہت سے رفیق وکالت شروع کر چکے تھے۔ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے وفد ان کے پاس پہنچے اور اصرار کرتے رہے کہ دوبارہ وکالت شروع کر دیں۔ لیکن وہ جس کام کو غیر مناسب سمجھتے ہوئے ایک مرتبہ ترک کر چکے تھے دوبارہ اس کو اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔"

(سرگزشت مجاہدین ص ۶۱۲)

مولانا عبدالقادر قصوری دس سال تک پنجاب کانگرس کے صدر رہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پنجاب مجلس خلافت کے بھی روح رواں تھے اور مجلس خلافت پنجاب کی صدارت بھی ان کے سپرد تھی۔

مولانا عبدالقادر قصوری کے سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود فرمانروائے سعودی عرب سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ جب حج کے لیے تشریف لے گئے اور سلطان عبدالعزیز سے ملاقات ہوئی، اور نظام حکومت سے متعلق بڑی تفصیل سے گفتگو ہوئی، سلطان عبدالعزیز ان کی گفتگو سے بہت متاثر ہوئے کہ انہیں اپنا مشیر بنانے کی پیشکش کی لیکن مولانا عبدالقادر نے صاف انکار کر دیا۔

جب واپس آئے تو ایک مجلس میں سلطان بن سعود کی پیشکش کا ذکر کیا تو کئی احباب نے بالاتفاق کہا کہ آپ کو سلطان کی پیشکش کو قبول کر لینا چاہیے تھا۔ ان میں آپ کے فرزند مولانا محمد علی قصوری بھی شامل تھے۔

مولانا عبدالقادر نے جواب دیا:

"سنو! محمد علی، مجھے خدمت قبول کر لینے کا مشورہ دیتے ہو، تو پہلے میرے لیے تین ہزار روپے ماہوار کا مستقل انتظام اپنے پاس سے کر دو۔ میں واپس جا کر خدمت اپنے ذمے لے لیتا ہوں۔ لیکن سلطان سے تنخواہ لے کر خدمت کرنا میرے لیے ممکن نہیں، اسلام و مسلمین کی بہتری یا ملکی اصلاح کے پیش نظر جو کچھ ضروری ہوگا، اسی صورت میں سلطان سے صاف صاف کہہ سکوں گا۔ جب اس کا یا اس کی حکومت کا کوئی احسان مجھ پر نہ ہوگا ورنہ ہو سکتا ہے کہ حق گوئی یا حق

نمائی کی بجائے صرف اپنی ملازمت کی حفاظت میر انصب العین رہ جائے۔ اس طرح خدمت کا حقیقی شرف کیونکر قائم رہ سکے گا۔ یا آج خدمت کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کل اسے چھوڑنا پڑے۔ اصل مقصد یوں بھی پورا نہ ہوگا۔''

(سرگزشت مجاہدین ص ۶۱۳-۶۱۴)

مولانا عبدالقادر قصوری کا جماعت مجاہدین چمرکند سے بھی خاص تعلق تھا۔ وہ مجاہدین کی بہت مالی امداد کرتے تھے۔ مولانا قصوری ابتدائی دور میں جماعت مجاہدین سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان کے پاس جماعت کے کارکن آتے تھے۔ لیکن مولانا ان کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتاتے تھے۔ یہ معاملہ نہایت رازداری کا تھا اور راز میں ہی رہتا تھا۔

(قصوری خاندان ص ۲۸)

۱۹۲۶ء میں جب سلطان عبدالعزیز نے حجاز پر قبضہ کرلیا اور انہوں نے تمام قبے جو مکہ اور مدینہ میں تھے ان کو گرادیا تو ہندوستان میں سلطان کے اس اقدام کی سخت مذمت کی گئی۔ اور مخالفت کرنے والوں میں مولانا محمد علی جوہر پیش پیش تھے۔ جو فقہی اعتبار سے احناف کے بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا محمد علی نے سلطان عبدالعزیز کی بادشاہت کی بھی مخالفت کی۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ حجاز کو ایک بین الملّی انتظامی ادارے کی تحویل میں دے دیا جائے۔

لیکن مولانا محمد علی کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ بھی تھا جنہوں نے سلطان ابن سعود کے اس اقدام (انہدام قبہ) کی حمایت کی تھی۔ اور مولانا محمد علی سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ جس گروہ نے سلطان کے اقدام کی حمایت کی تھی۔ ان میں پنجاب سے مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا ظفر علی خاں، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالواحد غزنوی، مولانا سید اسماعیل غزنوی اور بہت سے دوسرے حضرات تھے۔ دہلی اور یوپی وغیرہ کے اصحاب علم میں مولانا سید سلیمان ندوی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی وغیرہ اور ان کے رفقاء شامل تھے۔

ان سب حضرات نے مولانا محمد علی کی تجویز کو مسترد کر دیا اور سخت مخالفت کی۔ انہوں

نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں مولانا محمد علی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ دوسری طرف مولانا محمد علی اپنی مخالفت میں پنجاب کے حضرات کو فوقیت دیتے تھے۔ اور خاص کر مجلس خلافت پنجاب کو اور اس میں اصل ہدف مولانا عبدالقادر قصوری تھے۔

(قصوری خاندان ص ۳۲-۳۳)

سلطان ابن سعود نے ۱۹۲۴ء میں مؤتمر عالم اسلامی کا اجلاس مکہ مکرمہ میں طلب کیا۔ مجلس خلافت نے اس میں اپنا تین رکنی وفد مولانا سید سلیمان ندوی کی سربراہی میں مکہ مکرمہ بھیجا۔ اس وفد کے دوسرے دو ارکان مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا عبدالقادر قصوری تھے۔

مولانا عبدالقدر قصوری جید عالم دین تھے۔ شیخ اسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تصانیف کے شیدائی تھے۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا عبدالقادر قصوری کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ ایک مستند عالم دین تھے اور ملکی سیاست کے علاوہ ان کا مطالعہ دینیات بھی بڑا وسیع تھا ...... وہ تفسیر، حدیث اور فقہ میں گہری نظر رکھتے تھے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن قیم رحمہ اللہ کی تصنیفات سے ان کو خاص طور سے لگاؤ تھا۔ اور اس زمانے میں ان دونوں حضرات کی جو کتابیں کسی طرح میسر آسکتی تھیں، مولانا انہیں خریدتے اور اپنے مطالعہ میں لاتے تھے۔''

(قصوری خاندان ص ۲۳)

مولانا عبدالقادر قصوری اخلاق و عادات کے اعتبار سے بلند مرتبہ کے حامل تھے۔ وہ نہایت مرنجاں مرنج اور وضع دار بزرگ تھے۔ ذاتیات پر اُترنا اور کسی کو حریف بنانا ہرگز ان کا شیوہ نہ تھا۔ جو شخص بھی ان کے پاس کسی کام کے لیے گیا اس کا کام کرنے یا کرانے میں ہر ممکن مدد کرتے تھے۔

مولانا مہر لکھتے ہیں کہ:

''جو بھی ان کے پاس پہنچ جاتا اس کے ہر کام میں ہر ممکن مدد دیتے۔ خواہ

سیاسی وعوامی دائرے میں اس سے کتنا ہی اختلاف ہوتا۔ وہ واحد بزرگ دیکھے جنہوں نے سیاسی اختلافات اور ذاتی تعلقات کو ہمیشہ الگ الگ رکھا۔ اور اختلاف کی انتہائی شدت میں بھی ذاتی تعلقات کو اس شان سے نبھایا گویا کبھی کوئی اختلاف پیش ہی نہیں آیا تھا۔ جن لوگوں نے قومی کاموں میں تکالیف اُٹھائیں اور نقصان برداشت کیے ان کی بے حد مدد فرماتے۔''

(سرگزشت مجاہدین ص ۴۱۵)

مولانا عبدالقادر قصوری نے ۱۶، نومبر ۱۹۴۲ء کو لاہور میں وفات پائی۔ اور قصور میں سپرد خاک کیے گئے۔

مولانا عبدالقادر کی وفات پر مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف دسمبر ۱۹۴۲ء میں لکھا کہ:

''پنجاب کے نامور عالم اور وکیل و مجاہد سیاسیات مولانا عبدالقادر صاحب قصوری کی وفات کی خبر سے بڑا صدمہ ہوا۔ قصور ضلع لاہور ان کا وطن تھا۔ اور وہیں وکالت کرتے تھے اور اچھے نامور وکیل تھے۔ عربی کے عالم، دینیات کے فاضل اور انگریزی سے واقف تھے۔ مولانا ابوالکلام کی ''الہلال'' والی تحریک سے ان کو دلچسپی تھی ...... مرحوم مسلکاً اہلحدیث تھے۔ نہایت دین دار، متواضع، ملنسار، پابند وضع، علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی تصانیف کے بڑے شائق تھے۔ اور انہی کی تحقیقات پر ان کا عمل تھا۔ خلافت حجاز اور کانگرس میں بیش از بیش حصہ لیا۔''

(یادرفتگاں ص ۲۴۱)

مولانا ابوالکلام آزاد سے مولانا عبدالقادر قصوری اور ان کے فرزندان گرامی مولانا محی الدین احمد قصوری و مولانا محمد علی قصوری اور بھائی مولانا عبداللہ قصوری کے دیرینہ تعلقات تھے۔ مولانا آزاد نے مولانا عبدالقادر قصوری کے خاندان کو ''خاندان سادات قصور'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ مولانا آزاد نے ان کے نام کئی ایک خطوط لکھے تھے۔ ان میں دو خط مولانا غلام رسول مہر نے تبرکات آزاد میں شائع کر دیے ہیں۔ (خط نمبر ۱۹ محریہ ۱۹، جون ۱۹۳۸ء صفحہ ۷۸، اور دوسرا خط نمبر ۲۴، محریہ ۲، جنوری ۱۹۳۹ء صفحہ ۸۴)

خط نمبر ۲۴ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا آزاد کے نزدیک مولانا عبدالقادر قصوری کس درجہ احترام وتکریم کے مستحق تھے۔

مولانا عبدالقادر قصوری انجمن پنجاب کے صدر بھی رہے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری ناظم اعلیٰ تھے۔

مولانا محی الدین احمد قصوری رحمہ اللہ:

مولانا محی الدین احمد قصوری مولانا عبدالقادر قصوری کے فرزند اکبر تھے۔ علوم اسلامیہ کے معتبر عالم دین تھے۔ اور عصری تعلیم بی اے تھی اور بی اے ان کے نام کا لاحقہ بن گیا تھا۔ اور یوں مولانا محی الدین احمد قصوری بی اے کے نام سے شہرت پائی۔ بی اے کرنے کے بعد مجبوب عالم اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے اور تقریباً ڈیڑھ سال بعد سکول کی ملازمت چھوڑ دی۔

اس کے بعد کچھ مدت متفرق مشاغل میں بسر کرنے کے بعد کلکتہ چلے گئے۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' میں کچھ عرصہ کام کیا۔ اس دوران ''الہلال'' میں ان کا ایک مضمون ''صدائے ملت، الہلال کی دعوت کی نسبت'' سے شائع ہوا۔ کچھ عرصہ بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورہ سے کلکتہ سے روزنامہ ''اقدام'' جاری کیا۔ مولانا آزاد اس کے نگران تھے اور مولانا محی الدین احمد اس کے ایڈیٹر تھے۔ اور یہ واقعہ ۱۹۱۵ء کا ہے۔ مارچ ۱۹۱۶ء میں حکومت بنگال نے مولانا آزاد کو صوبہ بدر کر دیا اور مولانا رانچی بہار چلے گئے۔ یہاں مرکزی حکومت نے انہیں تین سال کے لیے نظر بند کر دیا۔ مولانا آزاد کے نظر بند ہو جانے سے روزنامہ ''اقدام'' بند ہو گیا اور مولانا محی الدین احمد قصور تشریف لے آئے۔ قصور سے انہیں لاہور بلایا گیا۔ اور آنا فانا گرفتار کر کے لاہور جیل میں بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد آپ کو دسوہہ ضلع ہوشیار پور بھیج دیا گیا اور فروری ۱۹۱۹ء میں رہائی ملی۔

مولانا آزاد رانچی میں نظر بند تھے اور اس نظر بندی میں آپ اپنی کتاب ''تذکرہ'' لکھ رہے تھے کہ مولانا کو مولانا محی الدین احمد کی گرفتاری اور نظر بندی کی اطلاع ملی۔ کتاب مکمل ہو چکی تھی۔ تاہم مولانا آزاد نے تذکرہ کے آخر میں درج ذیل الفاظ میں مولانا محی الدین

احمد کا ذکر کیا ہے۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ ڈاک ملی اور اخبارات سے معلوم ہوا کہ عزیزی مولوی محی الدین احمد بی اے کو قصور میں تلاشی کے بعد گرفتار کر لیا گیا ہے۔ شاید نظر بندی کا معاملہ پیش آئے۔ ان تمام ایام جلاوطنی میں یہ پہلا دن ہے کہ اس واقعہ کے سننے سے دل کو مضطر اور دماغ کو پراگندہ پاتا ہوں۔

عزیز موصوف بلکہ ان کا پورا خاندان اپنے خصائص ایمانی و جوش اسلامی و ایثار اللہ و فی اللہ کے اعتبار سے عہد سلف کے واقعات زندہ کرنے والا ہے اور علی الخصوص اس عزیز کی طلب صادق اور استعداد کامل سے تو اپنی چند در چند اُمیدیں وابستہ تھیں۔ افسوس فتنہ حوادث نے اس کو بھی نہ چھوڑا۔ مجھے اس سے کب انکار تھا کہ میرے پاؤں میں ایک کے بدلے دس زنجیریں ڈال دی جائیں۔ لیکن دوسروں کو اس میں کیوں شریک کیا جاتا ہے، بظاہر عزیز موصوف کا اس کے سوا کوئی جرم نہیں کہ مجھ خانماں خراب سے رسم وراہ رکھتے ہیں۔ سبحان اللہ! اپنی آشنا پروری اور دوست نوازی بھی قابل تماشا ہے۔ جب تک اپنا کوئی دشمن نہ بن جائے ہمارا دوست نہیں ہو سکتا:

اے ہم نفسان آشتم از من بگر یزید
ہر کس کہ شود ہم رہ ما دشمن خویش است

پرسوں ایک عزیز کو خط لکھتے ہی یہ رباعی یاد آئی تھی:

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی
اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
مے خانہ نے رنگ روپ بدلا ایسا
مے کش، مے کش رہا نہ ساقی ساقی

(تذکرہ)

نظر بندی ختم ہوئی۔ تو قصور واپس آئے۔ تو رولٹ ایکٹ کے سلسلے میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ ان ہنگاموں میں مولانا عبدالقادر اور مولانا محی الدین احمد دونوں گرفتار ہوئے۔

اور ایک عرصے تک جیل میں رہے۔

اس ابتلاء سے نجات ملی تو پونا میں ایک یتیم خانے کا انتظام سنبھالا اور اس کے ساتھ ''جمعیت دعوت و تبلیغ'' کے نام سے ایک جماعت بنائی اور دعوت و تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ اس وقت ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد علی قصوری بمبئی میں تجارت کرتے تھے۔ انہوں نے دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں دو ہزار روپے ماہانہ دینے شروع کر دیے۔

مولانا محی الدین احمد کا جماعت مجاہدین سے بھی تعلق تھا۔ اور مجاہدین کی ہر قسم کی امداد کرتے تھے۔ وہ مولوی ولی محمد فتوحی والے کے حلقہ ادارت میں شامل تھے۔

مولانا مہر لکھتے ہیں کہ:

''مولوی محی الدین احمد اور مولوی عبداللہ دونوں بقدر فرصت مجاہدین کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ان دونوں نے مولوی ولی محمد (فتوحی والا) کے ہاتھ پر بیعت بھی کی تھی۔ غرض اس خاندان کے بیشتر افراد جماعت مجاہدین سے کم و بیش وابستہ رہے اور دینی خدمات کی بجا آوری میں تو کسی نے بھی حتی الامکان کوتاہی نہ کی۔ مولانا عبدالقادر نے حب دین اور عشق آزادی کا جو چراغ روشن کیا تھا۔ اس سے خاندان کے ہر ایک فرد نے کسب ضیاء کا شرف حاصل کیا۔''

(سرگزشت مجاہدین ص ٦١٨)

عادات و اخلاق کے اعتبار سے مولانا محی الدین احمد قصوری اپنے اسلاف کے تمام اوصاف حمیدہ سے متصف تھے۔ زہد و ورع کا نمونہ، بہت زیادہ ملنسار اور خوش اخلاق تھے۔ جن دنوں باغ جناح لاہور میں ہر اتوار بعد نماز مغرب درس قرآن دیا کرتے تھے، راقم کبھی کبھی ان کے درس قرآن میں شریک ہوتا۔ مصافحہ کے لیے درس سے پہلے یا بعد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو بڑی گرمجوشی سے مسکراتے ہوئے مصافحہ کرتے اور حال احوال و خیریت پوچھتے تھے اور دعائیں دیتے تھے۔

مولانا محی الدین احمد اچھے مصنف اور مضمون نگار تھے۔ ان کا ایک مضمون ''تیرہویں صدی کا مجدد اعظم'' ہفت روزہ ''توحید'' امرتسر میں جو مولانا سید داؤد غزنوی رحمہ اللہ کی

ادارت میں شائع ہوتا تھا، کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ راقم نے یہ مکمل مضمون توحید امرتسر میں پڑھا ہے، اس کا عربی ترجمہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے ترجمہ ''السید الامام'' کے نام سے کیا جو مجلّہ المنار قاہرہ (مصر) میں شائع ہوا۔

مولانا محی الدین احمد کے مولانا ابوالکلام آزاد سے دیرینہ تعلقات تھے۔ مولانا آزاد اور مولانا محی الدین کے مابین خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب ''تبرکاتِ آزاد'' میں مولانا کے ۲۷ مکاتیب جن میں بیشتر مکتوب ان کے نام ہیں اور دو تین خطوط مولانا عبدالقادر قصوری کے نام ہیں۔ شائع کر دیئے ہیں۔

(صفحہ ۱۵ تا ۸۶)

ایک خط بطور تبرک درج ذیل ہے:

۲۴ ستمبر ۱۹۳۶ء

عزیزی

''دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ترجمان القرآن جلد دوم کا کوئی نسخہ اب یہاں باقی نہیں رہا ہے۔ میں نے تھوڑے سے نسخے دوستوں کو دینے کے لیے رکھ لیے تھے۔ وہ سب ختم ہو گئے۔ میں اس خط کے ساتھ ایک خط شیخ مبارک علی کے نام لکھے دیتا ہوں۔ انہیں بھیج کر منگوا لیجیے۔ قیمت وہ میرے حساب میں سے منہا کر لیں گے۔''

والسلام

ابوالکلام

(برکاتِ آزاد ص ۶۲)

مولانا مہر اس پر حاشیہ لکھتے ہیں کہ ترجمان القرآن جلد دوم تمام کا تمام شیخ مبارک علی نے خرید لیا تھا۔

مولانا ظفر علی خاں:

جب ہم تاریخ دیوبند پر نظر ڈالتے ہیں تو فوراً ہمارے سامنے مولانا سید انور شاہ

کشمیری، مولانا سیّد حسین احمد مدنی، اور مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہم کی تصویریں آجاتی ہیں۔ یا مولانا سید انور شاہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی کا نام سنتے ہیں تو تاریخ دیوبند اور دارالعلوم دیوبند کا پورا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی کا نام سامنے آتا ہے تو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کی مساعی وخدمات جلیلہ کا خاکہ نظروں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ جب مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا نام سنتے ہیں تو ندوۃ المصنفین دہلی کی علمی خدمات کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ جب مولانا محمد علی جوہر کا ذکر کیا جاتا ہے تو مجلس خلافت کی پوری تاریخ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ جب مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا تذکرہ ہوتا ہے تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مکمل خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ جب مولانا سید مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمات کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو جماعت اسلامی کی مساعی اور کوششوں کا پورا خاکہ سامنے آجاتا ہے، علامہ مشرقی کا نام سامنے آئے تو خاکسار تحریک کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، جب شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اور مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی وغیرہم کا ذکر کیا جاتا ہے تو اہلحدیث جماعت کی مکمل تاریخ اور اکابرین سلف کی بے لوث خدمات اور آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس کی سعی وکوشش کا نقشہ ذہنی تصور میں آجاتا ہے جب مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی وغیرہم کا نام لیا جاتا ہے تو جمعیۃ العلماء ہند کی مکمل تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ جب مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا سید داؤد غزنوی اور مولانا ظفر علی خاں کے نام لیے جاتے ہیں تو مجلس احرار کی پوری تاریخ ذہن میں آجاتی ہے۔

مولانا ظفر علی خاں برصغیر (پاک و ہند) کے عظیم سیاسی رہنما تھے۔ برصغیر کی تحریک آزادی میں ان کی خدمات سنہری حروف سے لکھی جائیں گی۔ آپ ایک بلند پایہ خطیب و مقرر، انگریزی اور اردو کے مایہ ناز ادیب، عظیم قومی وملی رہنما۔ قادر الکلام شاعر، مصنف، دانشور، نقاد، مورخ، مبصر، مترجم اور نامور صحافی تھے۔ اور سب سے بڑھ کر آپ بہت بڑے محبّ رسولؐ تھے۔ آپ ایک جامع الصفات والکمالات شخصیت کے حامل تھے۔ اور ایک غیر

معمولی دل اور دماغ کے مالک تھے۔

مولانا ظفر علی خاں اسلام کے بہت بڑے سپاہی تھے۔ ان کا قلم ان کی تلوار اور ڈھال کا کام دیتا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی زبان دانی، انشاء پردازی، اور خطابت کے کمالات سے کسی دشمن کو بھی انکار نہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ:

''ظفر علی خاں اگر سیاست سے الگ رہتے تو دوسرے اقبال ہو سکتے تھے۔ ظفر علی خاں کی شخصیت میں اسلام سے بے پناہ محبت کی استعداد تھی۔ جن کی زندگی کا ایک ہی مشن تھا یعنی ہندوستان کی آزادی اور اسلام کا فروغ۔''

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے قول کے مطابق ظفر علی خاں قادر جیسا الکلام شاعر اور نثر نگار اس صدی میں اب تک پیدا نہیں ہوا۔

اُردو ادب میں ان کا مقام بہت بلند تھا اور اُردو زبان پر ان کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا ظفر علی خاں اگر عربی ادبیات پر قلم اُٹھاتے تو حریری و ہمدانی ہوتے۔ فارسی میں لکھتے تو ابوالفضل اور فیضی ان کی نگارشات پر سر دُھنتے۔ انگریزی میں طبع آزمائی فرماتے تو ایڈیسن اور میکالے سے کم رتبہ کیا پاتے لیکن اُنہوں نے اظہار خیال کا ذریعہ ایسی زبان کو ٹھہرایا جس میں داد سے زیادہ تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے تاہم حالی مرحوم نے ان کی قوت تاثیر کو ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے:

ڈالا تیری پکار نے غل
جی اُٹھے وہ مردے جو تھے بے جان

مولانا ظفر علی خان کا شمار برصغیر کے ان رہنماؤں میں ہوتا ہے جنہوں نے برطانوی سامراج کی بیخ کنی کے ساتھ ہی ساتھ انگریز کے خود کاشتہ پودے یعنی قادیانیت کی پوری شدومد سے مخالفت کی۔ اور ساری عمر اس فرقہ ضالہ کی بیخ کنی اور اس کو نیست و نابود کرنے میں صرف کر دی۔ مولانا ظفر علی خاں نے نثر و نظم اور تقریروں کے ذریعے قادیانیت کی

تردید میں بے پناہ خدمات انجام دیں۔ اپنے اخبار زمیندار میں قادیانیت کی تردید میں بے شمار مضامین لکھے اور نظم میں ایک مستقل کتاب ''ارمغان قادیانیت'' کے نام سے لکھی۔ اس کتاب کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

گر تجھ کو منظور ہے سیر جہان قادیاں
اے مسلمانو! خریدو ارمغانِ قادیاں
میں نے دی اس کو لگام اور ہو گیا اس پر سوار
ورنہ کس کو مانتی تھی مادیانِ قادیاں

فتنہ قادیانیت کی بیخ کنی کے سلسلہ میں مولانا ظفر علی خاں کی مساعی کے متعلق حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

''مولانا انگریز کے ازلی حریف و مخالف تھے۔ ان کا اس امر پر یقین تھا کہ انگریز ہی نے پوری دنیائے اسلام میں سازشوں کا جال بُن رکھا ہے تاکہ ملت اسلامیہ بیدار ہو کر اپنے اصلی مقام سے آشنا نہ ہو جائے۔ بنا بریں وہ خوب سمجھتے تھے کہ مرزائیت انگریز کا خود کاشتہ پودا ہے۔ جس کا مقصد اپنے اغراض کے استعماری مقاصد کے لیے مسلمانوں کے دلوں سے جذبۂ جہاد کو ختم کر کے انہیں انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری پر تیار کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ مرزا بشیر الدین محمود اور ان کے ابا مرزا غلام احمد کو جو انگریزی حکومت کی وفاداری کو جزو ایمان سمجھتے اور اس لیے آیہ رحمت قرار دیتے تھے کہ ان کے سایہ میں ان کا کاروبار فروغ پا سکے۔ تحریک آزادئ ہند کی راہ میں زبردست روڑا سمجھتے تھے۔ لہٰذا اس کے فریب کارانہ عزائم سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا اپنا ملی فریضہ سمجھتے اور اس کی گوشمالی جزو ایمان تصور فرماتے تھے۔''

(ظفر علی خاں اور ان کا عہد ص ۳۹۲)

مولانا ظفر علی خاں نے اس فرقۂ ضالہ اور اس کے بانی آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کے خلاف بے شمار نظمیں لکھیں۔ بطور تبرک پانچ شعر درج ذیل ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں:

وہ بھاگتے ہیں اس طرح مباہلے کے نام سے
فرار کفر ہوا جس طرح مسجد الحرام سے
پکار کر کہہ رہا ہے زلزلہ بہار کا
بچ نہ سکے گا قادیاں خدا کے انتقام سے
مسیلمہ کے جانشین گرہ کٹوں سے کم نہیں
کتر کے جیب لے گئے پیمبری کے نام سے
سنا بھی تو نے اے ہم نشیں کہ قادیاں دمشق کی
ہوئی ہے جفت اندلس کے خنگ بدلگام سے
میں قادیاں سے کیا لڑوں کہ فرصت آج کل نہیں
رکوع سے، سجود سے، قعود سے، قیام سے

نعت گوئی میں مولانا ظفر علی خاں بے مثال تھے اور نعت لکھنے کا ان کا ایک مخصوص انداز تھا۔ ان کی نعت میں حقیقت ہوتی تھی۔ غلو نہیں ہوتا تھا۔

شورش کاشمیری اپنی کتاب ''ظفر علی خاں'' میں لکھتے ہیں:

''حضور سرور کائنات ﷺ سے انہیں جو محبت تھی وہ ان کی شاعری کی جان ہے۔ ان کی صنف شاعری محبت رسول اللہ ﷺ سے بھری پڑی ہے جو عقیدت انہیں اس نام اور اس ذات سے رہی، یہ نعتیں اس کا والہانہ اظہار ہیں ایسی بے داغ نعتیں شاذ ہی ملتی ہیں۔ خدائے لایزال نے جو کچھ حضور ﷺ کے بارے میں کہا۔ قرآن وحدیث کے اوراق سیرت طیبہ کا جو نقش پیش کرتے ہیں۔ مولانا کی نعتیں ہو بہو اس کی تصویر ہیں۔ جو قدرت کلام اس میں جھلکتی ہے اس کی مثال نہیں۔''

سرکار مدینہ ﷺ سے محبت وعقیدت ایمان کامل کی شرط قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

نماز اچھی ، حج اچھا ، روزہ اچھا ، زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود اس کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثرب کی عزت پر
خدا شاہد ہے ، کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا
عتاب انگریز کا ان سب میری باتوں کی قیمت ہے
قیامت تک میرا نرخ اس سے ارزاں ہو نہیں سکتا

مولانا ظفر علی خاں میر عثمان علی خاں نظام دکن کے اتالیق تھے ۔ اخبارات میں کسی نے یہ خبر لگا دی کہ نظام دکن شیعہ مذہب اختیار کر رہے ہیں ۔ مولانا ظفر علی خاں نے ایک نظم بعنوان '' میر عثمانی علی خاں والی دکن کے نام'' سے اپنے اخبار ''زمیندار'' کے پہلے صفحہ پر شائع کی ۔ نظم ملاحظہ فرمائیں:

اے کہ تیرے نام کا ڈنکا بجاتا ہے دکن
اے کہ تیری ذات ہے فخر سلاطین زمن
اے کہ تجھ سے ہے روایاتِ سلف کی آبرو
اے کہ تو نے کر دیا ہے زندہ آئین کہن
مجھ کو آلِ عبا سے ہے عقیدت بے حساب
میرے دل میں بھی تو ہے پیوست عشق پنجتن
اور پکار اُٹھتا ہوں میں بھی لافتیٰ اِلّا علیؓ
جب کسی میدان میں گھسان کا پڑتا ہے رَن
میرے اس خامہ کو لیکن چاہیے وسعت کچھ اَور
جس کی گنجائش نکالے گا میرا دیوانہ پن
میں ابو بکرؓ و عمرؓ پر بھی ہوں سو جان سے نثار
خواجۂ کونینؐ کی ہے پائتی جن کا وطن

لرزہ ہو جاتا تھا طاری کفر کے اندام پر
اَبروئے صدیق اکبرؓ پر جو پڑتی تھی شکن
جب عمرؓ کا نعرہ مستانہ ہوتا تھا بلند
نشہ ہو ہو جاتا تھا رُوما اور ایراں کا ہرن
اس میں ابوبکرؓ و عمرؓ ہوں یا عثمانؓ و علیؓ
یاں تو ان سب سے مہکتا ہے خلافت کا چمن
یہ سواد اعظم اسلام کی آواز ہے
اے کہ تیرے نام کا ڈنکا بجاتا ہے دکن

جب یہ نظم نظام دکن نے پڑھی تو ان کی طرف سے اخبارات میں یہ اعلان آ گیا کہ میرے شیعہ مذہب اختیار کرنے کی خبر غلط ہے، میں شیعہ نہیں ہو رہا۔ میرا تعلق اہل سنت مذہب سے ہے اور نظام نے اس نظم کو بہت پسند فرمایا۔

مولانا ظفر علی خاں بلند پایہ صحافی تھے۔ صحافتی دنیا میں انہیں ''بابائے صحافت'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی صحافتی زندگی نصف صدی کے قریب ہے۔

افسانہ اور دکن ریویو:

مولانا نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز جولائی ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد دکن سے کیا اور ''افسانہ'' کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ اس رسالہ میں آپ نے سلیس اور فصیح اردو میں دلچسپ اخلاقی اور نتیجہ خیز انگریزی ناولوں کے تراجم کا ماہوار سلسلہ شروع کیا جو انگریزی مہینہ کی پہلی تاریخ کو ۵۰ صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ یہ رسالہ تقریباً ڈیڑھ سال جاری رہا۔

جنوری ۱۹۰۴ء میں مولانا نے افسانہ کو بند کر دیا۔ اور ''دکن ریویو'' کے نام سے ایک نیا ماہوار رسالہ جاری کیا۔ ''دکن ریویو'' میں نظم و نثر کے ادبی و علمی مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ اور نئی کتابوں پر تبصرہ بھی ہوتا تھا۔

ڈاکٹر سیّد نظیر حسنین زیدی لکھتے ہیں:

''اس طرح یہ رسالہ ''افسانہ'' کے نام سے جولائی ۱۹۰۲ء میں جاری ہوا۔ پھر جنوری ۱۹۰۴ء میں ''دکن ریویو'' کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔ مارچ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے علم فلاحت وفن دباغت چرم کی تحصیل کے لیے رخصت کی درخواست پیش کر دی۔ اور ایک سال کی چھٹی لے کے سید محفوظ علی صاحب کے پاس صومالی لینڈ چلے گئے۔ ان کی چھٹی اغلباً جولائی ۱۹۰۵ء شروع ہوئی اور اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ختم ہوئی۔ نومبر ۱۹۰۶ء میں انہوں نے ایک نمبر اس کا بمبئی سے نکالا، بہر حال واپس آ کر نومبر ۱۹۰۶ء سے لے کر مارچ ۱۹۰۹ء تک یہ پرچہ نکلتا رہا۔ فروری کے مہینہ میں انہوں نے مضمون نگاروں کے لیے نقد معاوضہ کا بھی اعلان کیا تھا لیکن بعض حالات کے پیش نظر انہیں اس رسالے کی ادارت اور ملکیت سے دستبردار ہونا پڑا۔ اور اپریل ۱۹۰۹ء سے اس کی ادارت اور ملکیت مولانا مودود احمد قادری کے سپرد کر دینی پڑی اور اعلان کیا کہ وہ دکن ریویو کی قدیم پالیسی کو قائم رکھیں گے۔''

اکتوبر ۱۹۰۹ء کو انھیں ہمیشہ کے لیے حیدر باد کو خیر آباد کہنا بڑا۔ اس طرح ان کا یہ صحافتی دور ۱۹۰۲ء سے شروع ہو کر مارچ ۱۹۰۹ء میں ختم ہو جاتا ہے۔

(مولانا ظفر علی خاں بحیثیت صحافی ص ۷۱)

پنجاب ریویو:

مولانا ظفر علی خاں حیدر آباد دکن سے واپس اپنے آبائی گاؤں کرم آباد (متصل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ) آگئے۔ اور اگست ۱۹۱۰ء میں آپ نے کرم آباد سے ''پنجاب ریویو'' کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ یہ رسالہ ''رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور'' سے چھپتا تھا۔ ''پنجاب ریویو'' کے شمارہ مئی جون ۱۹۱۱ء (جلد اول شمارہ ۱۰-۱۱) کے مندرجات کی تفصیل ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی نے اپنی کتاب میں درج کی ہے۔ جس میں مولانا غلام رسول مہر کی ایک غزل بھی شائع ہوئی ہے۔ اور مولانا مہر کا نام اس طرح لکھا ہے:

''مسٹر غلام رسول مہر طالب علم اسلامیہ کالج لاہور۔''

ہفتہ وار زمیندار:

مولانا ظفر علی خاں کے والد مولوی سراج الدین احمد محکمہ ڈاک میں ملازم تھے۔ ۱۹۰۳ء میں اُن کی ریٹائرمنٹ ہوئی۔ اس کے بعد اُنہوں نے زمینداروں کی فلاح و بہبود کے لیے کرم آباد سے ہفتہ وار ''زمیندار'' جاری کیا۔ اس اخبار کی اشاعت کا مقصد صرف یہ تھا کہ زمینداروں میں بیداری اور قوتِ عمل کی روح پیدا کی جائے اور پنجاب کے زمینداروں کو تعلیمی، زراعتی اور اقتصادی لحاظ سے کامیابی کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچایا جائے چنانچہ مولوی سراج الدین احمد اپنے اس مشن میں خاصے کامیاب و کامران ہوئے۔

مولوی سراج الدین نے ۹، نومبر ۱۹۰۹ء کو وفات پائی اور وفات سے قبل انہوں نے مولانا ظفر علی خاں کو وصیت کی تھی کہ زمیندار کو ہر صورت میں جاری رکھا جائے۔

جنوری ۱۹۱۰ء میں ہفتہ وار ''زمیندار'' کا دورِ ثانی مولانا ظفر علی خاں کی ادارت میں شروع ہوا۔ مولانا نے اس اخبار کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی اس کی ادبی اور علمی حیثیت میں اضافہ کیا اور اس کو ایک بلند مقام تک پہنچا دیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے ''زمیندار'' کے پہلے صفحہ پر درج ذیل شعر کا اضافہ کیا:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

بہر حال مولانا ظفر علی خاں نے زمینداروں کے عام معاشرتی حالات درست کرنے کے لیے بڑی محنت کی۔ اور اس سلسلہ میں مختصر نوٹ، اداریے اور نظمیں بھی لکھیں۔

ہفتہ وار ''زمیندار'' کرم آباد سے شائع ہوتا تھا۔ یکم مئی ۱۹۱۱ء کو لاہور سے نکلنا شروع ہوا۔ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی رقم طراز ہیں:

''زمیندار یکم مئی ۱۹۱۱ء سے لاہور سے نکلنا شروع ہوا اور مولانا ظفر علی خاں کی عمدہ تحریروں اور دنیائے اسلام کے ساتھ ان کی بے مثال محبت اور معاصر ہندو اخباروں کی صحافتی چوٹوں کا جواب انہوں نے اس زور سے دینا شروع کیا کہ اس اخبار کے ساتھ لوگوں کی توجہ زیادہ ہوگئی۔ اس کے لطیف طنز میں چھپے

ہوئے فقرے، پاکیزہ زباں اور پر زور نظموں نے اس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ اس لیے اس اخبار میں انہوں نے خصوصیت سے دو چیزوں کا خاص خیال رکھا۔ ایک اسلام کے وقار کا تحفظ، اور اس کے لیے کسی بھی مصلحت کا ساتھ نہ دینا، دوسرے اُردو سے بے پناہ محبت، اور اس کی ترقی کے لیے علمی اور ادبی مضامین خود بھی لکھنا؛ اور دوسروں کے بھی شائع کرنا، اور انہیں نمایاں جگہ دینے کا ان کو ہمیشہ خیال رہا۔"

(مولانا ظفر علی خاں بحیثیت صحافی، ص ۱۰۱)

روز نامہ زمیندار:

۱۵، اکتوبر ۱۹۱۱ء کو مولانا ظفر علی خاں نے "زمیندار" کی اشاعت ہفتہ وار کی بجائے روزانہ کر دی۔ اور اب یہ اخبار لاہور سے روزانہ شائع ہونے لگا۔ یہ پہلا مسلمان اخبار تھا جس نے رائٹر سے براہِ راست خبریں حاصل کرنے کا انتظام کیا۔ اس اخبار نے ایک طرف برصغیر کے مسلمانوں کی ترقی اور بیداری میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے اس سے تاریخ کا ایک طالب علم بخوبی آگاہ ہے۔ دوسری طرف عالم اسلام کے لیے بھی اس اخبار کی خدمات بے مثال ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں کے اداریے اس اخبار کی جان ہوتے تھے جو حالات حاضرہ کی بہترین عکاسی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مولانا برصغیر اور عالم اسلام کے نامور اکابرین کے انتقال پر زبردست تعزیتی شذرات لکھتے تھے۔ جن میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کیا جاتا تھا۔

برصغیر میں جو بھی تحریکات اُٹھیں ان کے متعلق "زمیندار" نے اپنی ایک خاص پالیسی وضع کی تھی اور مولانا ظفر علی خاں ان پر اپنے مخصوص انداز میں اداریے لکھتے اور اپنی نظموں کے ذریعے بھی اظہار خیال فرماتے۔

زمیندار میں علمی، ادبی اور مذہبی مضامین و مقالات بھی شائع ہوتے تھے۔ انگریز کے خود کاشتہ پودے قادیانیت کی تردید بھی ہوتی تھی۔ مولانا نے "زمیندار" کا ایک مرزائی نمبر بھی شائع کیا تھا۔ جس میں اس فرقہ ضالہ کی اول تا آخر تاریخ بیان کی تھی۔ اور ان کے

ناپاک منصوبوں کی تفصیل بھی بیان کی تھی۔ بہر حال ''زمیندار'' واحد اخبار تھا جس نے برصغیر اور عالم اسلام کے مسلمانوں کے بقاء وتحفظ میں بے پناہ خدمات انجام دیں۔

''زمیندار'' کی عظمت وشہرت کا سہرا مولانا ظفر علی خاں کی نابغہ شخصیت کے سر ہے۔ جو بیک وقت علم وفضل، شعر وادب اور تاریخ وسیاست کے بحر ناپیدا کنار تھے۔ اور زبان و قلم کی شمشیر آبدار اور علم وفن کے مخزن بے مثال تھے۔ مولانا کے علاوہ اس کے ادارہ تحریر میں وقتاً فوقتاً برصغیر کے نامور اہل قلم شامل رہے ہیں جس کا اندازہ ذیل کے ناموں سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

> ''مولانا عبداللہ العمادی، مولانا وحید الدین سلیم، مولانا وجاہت حسین جھنجھانوی، نیاز فتح پوری، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، مرتضیٰ احمد خاں میکش، قاضی عدیل عباسی، چراغ حسن حسرت، مولانا اظہر امرتسری، قاضی احسان اللہ، شبلی بی کام، اور حاجی لق لق، مجید نظامی، میاں محمد شفیع اور آغا شورش کاشمیری وغیرہم۔''

''زمیندار'' کا تنوع مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ ساتھ ان ممتاز قلم کاروں کا رہین منت ہے، سید رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں کہ:

> ''ہندوستان کے اخبارات میں ''زمیندار'' نے قوم وملک کی راہ میں جن شدائد ومصائب کا مقابلہ کیا ہے اور جس حیرت انگریز استقامت اور استقلال کا ثبوت دیا ہے وہ ہر شخص مانتا ہے۔''

(سیرت محمد علی ص ۱۵۹)

مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی نے فرمایا تھا:

> ''ہندوستانی صحافت کا معزز ومقتدر اخبار ''زمیندار'' لاہور اپنی متانت وسنجیدگی اور مضامین کی روشنی کے لحاظ سے ایک روشن آفتاب ہے۔ حق وصداقت کی آواز کے لحاظ سے صدر حریت کہلانے کا مستحق ہے۔''

آغا شورش کاشمیری ''زمیندار'' کے بارے میں اپنی کتاب ''ظفر علی خاں'' میں لکھتے ہیں کہ:

''زمیندار پہلا اخبار تھا جس نے پنجاب کی سنگلاخ سرزمین میں نہ صرف انگریزی حکومت کے خلاف ۱۹۱۳ء میں نقد و احتساب شروع کیا بلکہ پرانی صحافت کا انجر پنجر ہلا ڈالا۔ ان دنوں لاہور سے جو اخبار نکلتے تھے، مولانا کا انداز بیان ان سے قطعی اجنبی تھا۔ انہوں نے متحد ہو کر ''زمیندار'' سے چھیڑ چھاڑ شروع کی لیکن مقابلہ کی تاب نہ لا کر چت ہو گئے۔''

زمیندار کی ضبطیاں:

مولانا ظفر علی خاں بیباک صحافی تھے۔ ان کا زندگی بھر یہی مطمحِ نظر رہا کہ انگریز مسلمانوں کا ازلی دشمن ہے اور اس کو مسلمانوں کے مذہب اسلام سے سخت کد ہے۔ اس لیے مولانا برطانوی سامراج کے خلاف ساری زندگی نبرد آزما رہے۔ سر مائیکل اڈوائر گورنر پنجاب مولانا کی سرگرمیوں سے سخت نالاں تھا وہ کہا کرتا تھا کہ:

''ظفر علی خاں اپنی ماں کے پیٹ سے بغاوت کا قلم لے کر پیدا ہوا ہے۔
اس کا اخبار آتش بار اخبار ہے اور اس کا ایڈیٹر بھی آتش بار ہے۔ میں اس کو جیل میں بار بار بند کر کے تنگ آ گیا ہوں۔ لیکن یہ تنگ نہیں آیا۔''

مولانا ظفر علی خاں ''زمیندار'' میں برطانوی سامراج کے خلاف سخت الفاظ میں تنقید کرتے تھے۔ اس لیے حکومت آئے دن اخبار سے ضمانت طلب کرتی اور مولانا ضمانت جمع کرا دیتے اور کئی بار حکومت نے ''زمیندار'' کی اشاعت پر پابندی بھی لگائی۔ اور پریس بھی ضبط کیا۔ ذیل میں زمیندار کی ضبطیوں کی تفصیل پیش خدمت ہے۔

پہلی ضبطی مارچ ۱۹۱۲ء میں ایک ہزار کی ضمانت کی ہوئی۔ اور دو ہزار کی ضمانت طلب کر لی گئی۔

جنوری ۱۹۱۳ء کو ''زمیندار'' کا ذاتی پریس بھی ضبط کر لیا گیا۔ اور دو ہزار کی ضمانت بھی ضبط کر لی گئی اور دس ہزار کی ضمانت طلب کی۔

۱۹۱۵ء میں مسلم پرنٹنگ پریس کے نام سے دوسرا پریس قائم ہوا۔ یہ پریس بھی سر مائیکل ایڈوائر کے حکم سے بند کر دیا گیا۔

۱۹۲۰ء میں اخبار دوبارہ نکالنے کی اجازت مل گئی لیکن دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی، ضمانت داخل کر دی گئی۔

جولائی ۱۹۲۰ء میں سابقہ ضمانت ضبط کر لی گئی اور نئی ضمانت مانگی گئی اور اس کے ساتھ مسلم پریس بھی ضبط کر لیا گیا۔ اس سال مولانا خود بھی گرفتار ہو گئے اور دسمبر ۱۹۲۰ء میں جب نیا اخبار نکلا، تو ضمانت طلب کر لی گئی۔

۱۹۲۵ء میں تیسرا پریس منصور اسٹیم پریس کے نام سے لگایا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں ''زمیندار'' کے نام نہاد ایڈیٹر سید دل شاہ کو ایک سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا اور ''زمیندار'' کی پانچ ہزار کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔

۱۹۲۷ء میں پلول کے ایک دریدہ دہن کی گستاخی پر مولانا ظفر علی خاں نے ''پلول کا گدھا'' ایک نظم لکھی۔ جس کے باعث پانچ ہزار کی ضمانت ضبط کر لی گئی...... ''زمیندار'' کی ضمانت کے بعد مولانا نے اکتوبر ۱۹۲۷ء کو حکم کا پورا متن مع ترجمہ اور وہ نظم دوبارہ ''زمیندار'' میں شائع کر دی۔ اس کی بنا پر پانچ ہزار کی ضمانت ضبط ہو گئی اور مزید تین ہزار کی ضمانت طلب کر لی گئی۔

۱۹۳۰ء میں تحریک نمک سازی میں مولانا ظفر علی خاں کو گرفتار کر کے گجرات جیل میں نظر بند کر دیا گیا اور ''زمیندار'' سے مزید تین ہزار کی ضمانت طلب کر لی گئی:

تم ضبط زمیندار کے نمبر نہیں کرتے
کرتے ہو حقیقت میں محمدؐ کا نشان ضبط

(۱۰، دسمبر ۱۹۳۰ء)

۱۹۳۱ء میں کشمیر ایجی ٹیشن شہید الٰہی بخش کے نام سے نظم لکھی۔ اخبار کے بارہ ایشو ضبط کر لیے گئے، پھر پانچ ہزار کی ضمانت بھی ضبط کر لی گئی اور دس ہزار کی نئی ضمانت طلب کر لی گئی۔

۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کے مسئلے پر دس ہزار کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ ۱۹۳۴ء میں ''تعزیر جرم عشق'' نظم پر اسٹیم پریس ضبط ہوا۔

۱۹۳۷ء مسلم لیگ کی تنظیم پر تین ہزار کی ضمانت ضبط کر کے پانچ ہزار کی ضمانت طلب کی گئی۔ جس کی وجہ سے چھ ماہ تک اخبار بند رہا۔ پھر دوبارہ ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا۔

۱۹۴۰ء میں خاکساروں پر گولی چلی۔ ''زمیندار'' نے سر سکندر پر زبردست تنقید کی جس کی وجہ سے پانچ ہزار کی ضمانت ضبط ہوگئی۔

ٹوانہ وزارت نے ''زمیندار'' کی ضمانت ضبط کی اور پانچ ہزار کی دوسری ضمانت طلب کی۔

''۱۹۴۶ء فسادات بہار کا قاتل کون ہے'' یہ اداریہ لکھنے پر پانچ ہزار کی ضمانت ضبط ہو گئی۔

۱۹۴۷ء میں ممدوٹ وزارت نے ۱۵ دن کے لیے اخبار بند کر دیا۔

۱۹۵۲ء میں سرکاری اشتہارات بند کر دیے گئے۔ اور ۱۹۵۴ء میں تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں ضمانت ضبط ہونے پر اخبار بند ہو گیا۔ اور اس کے بعد جاری نہ ہو سکا۔

۱۹۲۷ء میں مولانا نے ضبطی کے سلسلہ میں ایک نظم کہی تھی۔ جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

دل ضبط ، زبان ضبط، فغاں ضبط ، قلم ضبط
دنیا میں ہوئے ہوں گے یہ ساماں بھی کم ضبط

آنسو میری آنکھوں کے گئے پہلے ہی سے سوکھ
تھے وہ ورنہ اس فکر میں ان کا بھی ہونم ضبط

پنجاب میں جو ضبط ہوا آج زمیندار
بنگال میں جس طرح ہوا کرتے تھے بم ضبط

آزادی اسلام کی ضبطی پہ ہے خوش تو
ہو جائے کہیں یوں ہی نہ تیرا بھی منصرم ضبط

برطانیہ کا شیوہ رہا گر یہی کچھ روز
سن لو گے عزیزو کہ ہوئے دیر و حرم ضبط

(۱۹، نومبر ۱۹۲۷ء)

۱۹، اکتوبر ۱۹۳۴ء ''پلول کے گدھے'' نظم کا ایک حصہ شائع کیا گیا تھا جس سے اخبار کی جرأت کا اظہار ہوتا ہے:

ناموس پیمبر کا نگہبان ہے زمیندار
پلول کے گدھے کو بھی ہے اس جرم کا اقرار
اس عہد میں یہ جرم نہیں عفو کے قابل
گھورے نہ اسے کیوں نگہ قہر سے سرکار
حیرت ہے کہ مانگی گئی کیوں اس سے ضمانت
جب ایسے گناہوں کی سزا ہے درودیوار
حق بات کہنے سے یہ ہرگز نہیں ٹلتا
چھوڑے گا نہ اس اپنی روش کو یہ گنہگار

پہلی نظم شائع ہوئی تو اخبار کی ضمانت ضبط ہوگئی۔ اس نظم کی اشاعت پر منصور اسٹیم پریس ضبط ہوگیا۔ (مولانا ظفر علی خاں بحیثیت صحافی ص ۲۳۸ تا ۲۴۲)

ستارۂ صبح:

مولانا ظفر علی خاں نے ۸، اگست ۱۹۱۷ء کو یہ اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار علمی و ادبی نوعیت کا تھا۔ اس لیے اس اخبار کے اداریے اور مضامین سب علمی و ادبی ہوتے تھے۔ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی لکھتے ہیں کہ:

''اس اخبار کے اداریے اس لحاظ سے بے حد اہم تھے کہ ان اداریوں میں انھوں نے علمی اور ادبی مسائل کے علاوہ قادیانیت اور مصنوعی تصوف کے خلاف زبردست مقالے لکھے۔ ان مقالوں نے مخالف جماعتوں میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ اس طرح اُردو کی حمایت میں بھی انہوں نے انتہائی بے باکی اور جرأت کے ساتھ ہندو صحافت کا مقابلہ کیا۔ اور ان کی صحافتی ریشہ دوانیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔''

(مولانا ظفر علی خاں بحیثیت صحافی، ص ۱۲۲)

مولانا ظفر علی خاں نے علمی و ادبی لحاظ سے ''ستارہ صبح'' میں جو کچھ تحریر کیا اس کی علمی حلقوں میں دھوم مچ گئی۔ اور جس کا اعتراف سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ۱۹۵۲ء میں بیرون دہلی دروازہ لاہور مولانا ظفر علی خاں کے رخساروں کو بوسہ دیتے ہوئے ان الفاظ میں کیا کہ:

''ظفر علی خاں تیرے ''ستارہ صبح'' نے میرے جگر میں آگ لگا دی تھی۔''

''ستارہ صبح'' کی پیشانی پر حسب ذیل شعر رقم تھا:

من آں ستارہ صبحم کہ در عمل طلوع
ہمیشہ پیش رو آفتاب می باشم

''ستارہ صبح'' کے ادارہ تحریر میں اختر علی خاں، مولانا عبداللہ العمادی، سید وحید الدین سلیم، مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی، خواجہ عبدالحی، امان اللہ وزیر آبادی اور مرزا سید بیگ جیسے اصحاب علم اور اہل قلم شامل تھے۔

مولانا ظفر علی خاں کی صحافت:

مولانا ظفر علی خاں کی صحافت کے بارے میں ڈاکٹر پروفیسر غلام حسین ذوالفقار اپنی کتاب ''ظفر علی خاں بحثیت ادیب وشاعر'' میں لکھتے ہیں کہ:

''صحافت کے میدان میں ظفر علی خاں اس عہد کے سرخیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اُردو صحافت کے معیار کو بلند کرنے کے علاوہ اسے مقبول خاص و عام بنانے کے سلسلے میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ صحافت کا ایک زندۂ جاوید کارنامہ ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب ملک ایک سیاسی اور سماجی انقلاب کے دروازے پر پہنچ چکا تھا تو ضرورت اس امر کی تھی کہ اُردو صحافت میں بھی زندگی کی روح پھونکی جاتی اور اس کے معیار کو بلند کر کے اس کی اشاعت میں وسعت پیدا کی جاتی تاکہ یہ بیداریٔ جمہور کا ایک اہم ذریعہ بن جاتا۔ اس مقصد کے لیے ظفر علی خاں بہت موزوں ثابت ہوئے۔ انہوں نے اُردو صحافت کی رہنمائی کر کے اس بلندی پر پہنچا دیا جس کے آگے وہ بعض پہلوؤں میں ابھی تک نہیں بڑھ سکی۔ یہ ظفر علی خاں کا کارنامہ

خاص ہے کہ انہوں نے اُردو صحافت کے ننھے سے پودے کو تنا ور درخت بنا دیا۔ اور ایک مدت تک اس کے لیے وہ اپنے خون جگر سے آبیاری کرتے رہے۔''

آغا شورش کاشمیری مولانا کی صحافت کے بارے میں اپنی کتاب ''ظفر علی خاں'' میں لکھتے ہیں:

''مولانا کو بجا طور پر صحافت کے ثانوی دور کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اُردو کو بے شمار صحافتی الفاظ سے وسیع کیا۔ ان سے پہلے اُردو کا عوامی رسوخ محدود تھا۔ انہوں نے اس کے قبولِ عام کی راہیں پیدا کیں۔ اور ان علاقوں میں اُردو کا ڈول ڈالا جو آج مغربی پاکستان (پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان) کہلاتا ہے۔ مولانا سے پہلے روزانہ صحافت کا فنی لحاظ سے کوئی وجود نہ تھا۔ مولانا نے اس کے وجود کو قائم کیا بلکہ اس کی عزت میں اضافہ کیا۔''

پروفیسر حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا ظفر علی خاں کی پوری زندگی حق وصداقت کے لیے وقف رہی، اور قربانی وایثار کی عوام کے تعاون و ہمدردی سے ایک ایسی مثال قائم کی جس کی دوسری نظیر برعظیم ہندو پاک کی صحافت میں مفقود ہے۔ گویا ظفر علی خاں کی صحافت عوام کے جذبات کی حقیقی ترجمانی کرتی تھی۔''

(ظفر علی خاں اور ان کا عہد ص ۲۹۲)

زمیندار، الہلال اور ہمدرد:

زمیندار کے معاصر اخبارات میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' اور مولانا محمد علی جوہر کے ''ہمدرد'' کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان تینوں اخباروں نے برصغیر کی آزادی اور برصغیر کے مسلمانوں کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔ اور انہوں نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیے ان کے متعلق ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی اور پروفیسر حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی کی تحریریں قابل مطالعہ ہیں۔

ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، لکھتے ہیں:

''پاک و ہند میں تین ایسے صحافی تھے جو بہ یک وقت صحافی بھی تھے اور سیاست کے آزمودہ کار سپاہی بھی۔ ایک مولانا ابو الکلام آزاد، دوسرے مولانا محمد علی، اور تیسرے مولانا ظفر علی خاں، تینوں نے اخبار بھی نکالے، اور سیاست میں بھی عملی حصہ لیا۔ یہ تینوں اخبارات اپنی خصوصیت میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے ''الہلال'' وسط ۱۹۱۲ء میں جاری کیا جو نومبر ۱۹۱۴ء میں بند ہوا۔ ایک سال کے عرصے کے بعد نومبر ۱۹۱۵ء میں ''البلاغ'' کے نام سے جاری ہوا۔ اور اپریل ۱۹۱۶ء میں مولانا آزاد کی نظر بندی کے ساتھ ہی اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ دوسری مرتبہ جولائی ۱۹۲۷ء میں جاری کیا گیا لیکن اب حالات پہلے سے مختلف تھے۔ ''الہلال'' بھی پہلے جیسا نہیں تھا۔ اب وہ سیاسی و مذہبی جریدے کی بجائے علمی و ادبی جریدہ تھا۔ اس دور میں مولانا آزاد بھی اس پر پوری توجہ نہ دے سکے۔ اور وہ کبھی وقت پر نہ نکل سکا۔ آخر چھ مہینے جیسے تیسے جاری رہ کر بند ہو گیا۔

شروع کے دور میں مولانا آزاد نے ''الہلال'' کے لیے بہترین آدمیوں کو بلانے کی بہت کوششیں کیں، مولانا سلیمان ندوی، مولانا عبد السلام ندوی، اور عبداللہ عمادی کچھ دنوں تک شریک ادارت بھی رہے۔ اس کا یہ دور داعیانہ اسلوب خطابت کا حامل تھا۔ اور اس کے مضامین علمی اصطلاحوں سے پُر ہوتے تھے۔ اس پرچے نے دنیا کی دوسری تحریکات اسلامی کو عام لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ قرآنی مضامین اور بلند پایہ علمی مضامین کے سبب یہ عام لوگوں کی دست گاہ علمی سے بہت بلند تھا۔ مولانا کی رانچی کی نظر بندی نے ''الہلال'' کو بند کرا دیا۔ نومبر ۱۹۱۵ء میں ''البلاغ'' جاری ہوا۔ اس کا خاص مقصد بھی قرآن وسنت کے معارف و دعوت کو مخصوص طور پر پھیلانا تھا۔ اس کے ابواب مقالات، اسوۂ حسنہ، مذاکرۂ علمیہ، انتقاد تاریخ وسیر وغیرہ پر مشتمل تھے، لیکن مولانا کے

رانچی چلے جانے کے بعد کوئی پرچہ نہیں چھپا۔تحریک ترک موالات کے دور میں ہفتہ وار پیغام بغرض دعوت وارشاد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے تعاون سے نکلا تھا۔

مولانا محمد علی کا اخبار ''ہمدرد'' پہلی مرتبہ ۱۹۱۱ء میں جاری ہوا اور ۱۹۱۴ء تک جاری رہا۔ دوسری مرتبہ ۱۹۱۹ء میں جاری ہوا اور ۱۹۲۲ء تک جاری رہا۔ ''ہمدرد'' کو ''کامریڈ'' کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ اس کا سبب خود ان کے طویل اداریے ہوتے تھے۔ اس میں طویل اختلافی مسائل اتنی تفصیل سے بیان کیے جاتے تھے اور اس قدر شعلہ بیانی سے لکھے جاتے تھے کہ اس جذبے کی شدت نے خود مسلمانوں میں کئی مسائل پیدا کر دیے۔ اُردو اخبار میں طویل نویسی اور ریاستی کاموں میں گہری دلچسپی نے ''ہمدرد'' کے کام کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اراکین ادارہ اس سبب سے وقت پر اخبار شائع نہیں کر سکتے تھے۔ اسی سے ان کے کئی ساتھی کام چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ بلند پایہ سیاسی اخبار سیاسی مسائل پر بے لاگ تبصرے کرتا تھا۔ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت میں، ہندو مسلم جھگڑوں میں اور اتحاد ملی کے مسائل میں وقیع صورت اختیار کرتا لیکن نہ مولانا کو فرصت ملتی نہ اداریہ لکھا جاتا۔ اس لیے یہ بہت کم عرصے زندہ رہا اور مولانا محمد علی کی سیاست میں مشغولیت کے باعث مسلم صحافت کا آزاد ترجمان اخبار بند ہوگیا، مولانا محمد علی کی تحریروں میں ایک خاص خوبی یہ ہوتی تھی کہ انہوں نے کبھی بھی اپنے کسی حریف کی کمزوریوں کو اُچھالنے کی کوشش نہیں کی۔ دلائل سے اور پوری وضاحت سے مسائل پر تبصرے کیے۔ اور بے لاگ رائے دی۔ ''ہمدرد'' کے اداریے آج بھی پاک و ہند کی سیاست کو سمجھنے کے لیے اہم مقالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے اس کا رنگ زیادہ تر سیاسی تھا۔ اور ''الہلال'' کا رنگ زیادہ تر بلکہ سرتاسر علمی تھا۔ زمیندار ان دونوں کے درمیان ایک وسطی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ اپنی پالیسی اور باقاعدگی کے علاوہ عوامی مزاج کے اتنا قریب ہوگیا تھا کہ گویا عوام کی آواز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طویل عرصے تک ادبی، سیاسی، اور صحافتی خدمت کرتا رہا۔

(مولانا ظفر علی خاں بحیثیت صحافی ص ۲۴۳، ۲۴۴)

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی لکھتے ہیں کہ:

''زمیندار'' (لاہور) کو اپنے عہد میں بے اندازہ مقبولیت حاصل تھی۔ تاہم اس کی توجہ کا تمام تر مرکز ترکی تھا۔ اور اس کا عظیم ترین مقصد شہدائے بلقان کے پسماندگان کے لیے چندے کی فراہمی تھا۔ اندرون ملک کے معاملات اور یہاں کی داخلی سیاست سے اُسے بہت کم دلچسپی تھی .... ''

مولانا ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' ۱۳، جولائی ۱۹۱۲ء کو منصۂ شہود پر آیا۔ اس کی ضیا باری نے کلکتہ کے مطلع سے طلوع ہو کر شرق و غرب، شمال و جنوب سب علاقوں کو مطلع انوار بنا دیا۔ یہ اخبار اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک نئی آواز، نئی دعوت اور نیا پیغام تھا۔

(علامہ سید سلیمان ندوی، (شخصیت و ادبی خدمات) ص ۳۴۴)

پروفیسر حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی لکھتے ہیں:

''اُردو صحافت میں جن تین اخبار نویسوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ وہ ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں ہیں۔ ان میں ظفر علی خاں ایک ایسے صحافی ہیں جنہوں نے براہ راست عوام سے خطاب کیا۔ کچھ لوگ ظفر علی خاں کی صحافت پر جذباتی ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ظفر علی خاں نے جس وقت ''زمیندار'' سنبھالا۔ ملک و قوم کی کیا حالت تھی۔ ان میں زندگی و جرأت پیدا کرنے کے لیے اگر گرم لہجہ استعمال نہ کیا جاتا تو کیا وہ مقصد حاصل ہو سکتا تھا جس کا مطلب بیداری ملت سے ہے اور فرنگی سے نفرت و بیزاری سے ہے۔ ظفر علی خاں کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ساری عمر چومکھی لڑائی لڑتے رہے۔ مگر اپنے اصولوں سے نہ ہٹے۔ اور اس سلسلہ میں کسی مصلحت کو روا نہ رکھا۔ پنجاب میں جو برطانوی استعمار کی ریڑھ کی ہڈی تھا، اگر ظفر علی خاں اور ان کا ''زمیندار'' گرم لہجہ اختیار نہ کرتے، ایسے نوجوان کارکنوں اور صحافیوں کی وہ کھیپ کیسے پیدا ہو سکتی تھی جس نے آزادئ ملت کے سامان پیدا کیے۔ بلاشبہ ابوالکلام آزاد نے ملک کے علماء اور پڑھے لکھے طبقہ سے خطاب کیا۔ محمد علی کا

لہجہ بھی ایک حد تک استدلالی تھا۔مگر بیداری قوم کے لیے جس جذبہ کی ضرورت تھی۔ وہ صرف زمیندار کی تحریروں نے پیدا کیا، جو لوگ مولانا کی تحریروں میں نرا استدلال دیکھنا چاہتے ہیں وہ مسئلہ ارتداد پر مولانا کے ان ادارتی مقالات کا مطالعہ فرمائیں جو انہوں نے پندرہ سولہ اقساط میں مارچ ۱۹۲۶ء کے زمیندار میں تحریر فرمائے۔یا ''ازالۃ الخفاء'' کے نام سے مولانا کی ذاتی روداد کا مطالعہ فرمائیں تو انہیں ظفر علی خاں کے انداز استدلال کا صحیح اندازہ ہوگا۔''

(ظفر علی خاں اور ان کا عہد ص ۲۸۶)

مولانا ظفر علی خاں کے ہاں مولانا ابوالکلام آزاد کا مرتبہ و مقام کیا تھا۔علمی وادبی اور سیاسی لحاظ سے مولانا آزاد کیا مرتبہ و مقام رکھتے تھے۔ ذیل میں آغا شورش کاشمیری رحمہ اللہ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

شورش کاشمیری بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ شریک سفر تھا تو مولانا ظفر علی خاں نے فی البدیہہ ایک نظم ارشاد فرمائی جس کا مطلع تھا:

مجھے بھی انتساب ہے ادب کے اس مقام سے
ملی ہوئی ہے جس کی حد قدم گہ نظام ہے

دسواں یا گیارہواں شعر تھا:

جہاں اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہو گئی
ہے تجھ کو اس میں جستجو تو پوچھ ابوالکلام سے

راقم ہمراہ تھا، استفسار کیا:

''مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق آپ نے جو شعر کہا ہے وہ محض قافیہ کی بندش ہے یا فی الواقعہ آپ یہی سمجھتے ہیں۔

فرمایا:

جو کچھ میں نے کہا، وہ لفظاً ہی نہیں معناً بھی درست ہے۔

عرض کیا:

کیا مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر قرآن میں اسلاف کے پیرو اور اس عہد کے مجتہد ہیں

تو فرمایا:

بالکل اللہ تعالیٰ نے قرآن فہمی کے باب میں انہیں خاص ملکہ عطا کیا ہے ۔ وہ زمانہ حاضر کی فکری تحریکوں کو بخوبی سمجھتے اور قرآن کو ہر زمانے کی پیچیدگیوں کا حل قرار دے کر انسانی معاشرے کو اس کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں ۔ وہ قرآن کی ابدی دعوت پر نظام کائنات کی اساس رکھتے ہیں ۔ ان پر بفضل ایزدی علم القرآن کے دروازے اس طرح کھلے ہیں کہ ان سے کوئی سی راہ مسدود و منقطع نہیں ۔ ان کی آواز قرآن کی آواز ہے ۔

راقم مولانا کے ترجمہ و تفسیر میں بڑی خوبی کیا ہے اور وہ کون سا پہلو ہے جو دوسرے تراجم و تفاسیر کے مقابلہ میں منفرد ہے ۔

مولانا ظفر علی خاں:

ان کے ترجمہ و تفسیر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قرآن ہی کی زبان سے خطاب کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے ان کے الفاظ الوہیت اور نبوت کا جامہ پہنے ہوئے ہیں ۔ اور یہ صرف اللہ کی دین ہے، دوسرے تراجم جو اَب تک ہندوستان میں ہوئے ہیں وہ قرآن کے الفاظ کا لغوی تحتانی ترجمہ ہیں ۔ ان میں قرآن کے شکوہ کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ۔ عربی الفاظ کا ترجمہ اردو الفاظ میں کیا گیا ہے ۔ مطالب کی طاقت و پنہائی اوجھل ہو گئی ہے، آزاد کی تفسیر محض مقامی یا محض اسلامی نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی و بین الملّی ہے ۔ وہ الہٰیاتی زبان میں کائنات کو خطاب کرتے ہیں ۔

راقم ادب میں ان کا مقام کیا ہے ۔

مولانا ظفر علی خاں:

فی الواقعہ وہ ایک سحر طراز ادیب ہیں ۔ ان کا قلم تلوار ہے ۔ وہ قرنِ اوّل کے غزوات کی چہرہ کشائی کرتے اور عصر حاضر کی رزم گاہوں میں مسلمانوں کی فتح مندیاں ڈھونڈتے ہیں ۔ ان کا اسلوب بیان بے مثال ہے ۔ آدمی ان کے الفاظ سے مسحور ہوتا اور مطالب میں

ڈوب جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نکتہ آفرینی کے اعتبار سے اس وقت ہندوستان بھر میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ قلم کی نزاکت اور قلم کی طاقت، مبداء فیاض نے ان کے لیے ارزاں کر دی ہے۔

راقم ان کی زبان عوام کے لیے مشکل ہے۔

مولانا ظفر علی خاں:

کوئی زبان مشکل نہیں ہوتی، سوال ہمارے علم کا ہے کہ ہم کس حد تک اس سے بہرہ یاب ہیں، ان کی زبان قرآن کی زبان ہے۔ جو قرآن نہیں جانتے یا اس کی زبان سے نابلد ہیں ان کے لیے ان کی زبان فی الواقعہ مشکل ہے۔ ورنہ وہ آبشار کی طرح بہتی ہوئی اور چاندی کی طرح چمکتی ہوئی زبان لکھتے ہیں۔ وہ ہمارے عظیم ماضی کی زبان و بیان کے وارث ہیں۔

راقم ان کے عوام سے کٹ کے رہنے کی کیا وجہ ہے۔

مولانا ظفر علی خاں:

ہر طبیعت کا ایک اسلوب ہوتا ہے ان کی طبیعت عوام گریز واقع ہوئی ہے۔

راقم۔ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ان کی سیاست سے متفق نہیں، وجہ کیا ہے۔

(یہ ۱۹۳۶ء کی ایک مکالمت ہے)

مولانا ظفر علی خاں

مسلمانوں کی عمومی تاریخ ہی یہ ہے کہ اُن کی محراب عظمت میں ان کی موت کے بعد جبین اعتراف جھکاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں ان کے اعراض و انکار کی زد میں رہتے اور ان کی استبداد کی بھٹی میں پکتے ہیں۔ پھر جب وہ اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں تو ایک زمانہ گزرنے پر مسلمان ان کی عظمت کا احساس کرتے اور ان کی مرحوم شخصیت کے گرد جمع ہوتے ہیں۔ قرن اول سے یہی ہو رہا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے ائمہ کی رسوائی اپنے سلطانوں سے کرائی اور خود تماشائی بنے رہے۔ اب غلامی کے زمانے میں وہ اپنی دولت کو پوجتے اور طاقت کو مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک قربانی و استقامت کسی انسان کی اضافی اور علم و دیانت

ضمنی خوبیاں ہیں۔ مسلمان من حیث المجموع ایک ہنگامہ پرست قوم ہے وہ ہنگامہ گزر جانے کے بعد ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ اور عموماً انہی کی وہ دشمن ہوتی ہے، جو ابتلاء و آزمائش میں پیش پیش رہے ہوں۔ جو لوگ انگریزوں کی غلامی کا جواز ڈھونڈتے ہیں، اور ان کی طاعت کرتے ہیں۔ وہ ان لوگوں پر اعتراض کریں جو انگریزوں کے استبداد سے لڑتے ہیں تو یہ ایک دردناک المیہ ہے۔

راقم ان کی صحافت کے بارے میں کیا رائے ہے۔

مولانا ظفر علی خاں:

اب وہ صحافت ہی سے دستکش ہو چکے ہیں۔ لیکن ''الہلال'' بلاشبہ صور اسرافیل تھا۔ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کے دینی قبرستان میں قم باذن اللہ کہا، اور اس صدا سے انہیں جگا دیا تھا۔ ''الہلال'' محض جریدہ ہی نہیں، صحیفہ تھا کہ ہفتہ وار صحافت میں اس کا جواب نہ تھا۔

راقم مولانا کے ساتھ آپ کے روابط کیسے رہے۔

مولانا ظفر علی خاں:

میرے ساتھ انہیں ہمیشہ تعلق خاطر رہا۔ سر مائیکل اڈوائر نے ''زمیندار'' کو اپنے عتاب کا نشانہ بنایا تو ''الہلال'' میں انہوں نے کئی مقالے تحریر کیے اور حکومت کی روش پر نکتہ چینی کرتے ہوئے ''زمیندار'' کی آواز کو زندہ رکھنے کے لیے عامۃ المسلمین کو آمادہ کیا۔

راقم آپ مولانا سے ملتے تو گفتگو کس موضوع پر ہوتی۔

مولانا ظفر علی خاں:

ہر موضوع پر جو اس وقت ہندوستان میں قومی آزادی اور مسلمانوں کے استقلال کا موضوع ہوتا۔

راقم آپ نے ادب پر کبھی بات نہیں کی۔

مولانا ظفر علی خاں:

کئی دفعہ اس موضوع پر بات ہوئی۔ درحقیقت مولانا آزاد اُردو ادب کی رفتار موڑ دینے اور اس کو کاملاً انقلابی ڈگر پر لانے کے متمنی تھے۔

راقم وہ مزاجاً کس ڈگر کے انسان تھے۔

مولانا ظفر علی خاں:

مہادیو ڈیسائی انہیں مغلیہ تہذیب کا اجلا نقش کہتے ہیں لیکن وہ مغلیہ تہذیب سے زیادہ کہیں زیادہ عربی تہذیب کی اُردو تصویر ہیں۔ وہ دھلی مرحوم کے نہیں بغداد مرحوم کے انسان تھے۔ جب مسلمانوں کا وہاں طوطی بولتا تھا اور بغداد اس دور کی متمدن دنیا میں عروس البلاد تھا۔ مولانا نے اپنی بات سمیٹتے ہوئے کہا، رومیوں کے دمشق، عباسیوں کے بغداد، اور مغلوں کی دہلی میں ہوتے تو ان کا وجود جہاں ہوتے اس قرن یا عہد کے لیے مایۂ ناز ہوتا، وہ انسانی قامت میں ڈھلی ہوئی تاریخ کی ایک عظیم سچائی ہیں۔

راقم ان حالات میں مسلمان ان سے کیوں کر استفادہ کر سکتے ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں:

یہ سوال تمہاری ذہنی اپج ہے۔ علم جب مخاطبت کا میدان خالی پاتا اور عمل اپنوں کی بے رخی سے کبیدہ خاطر ہوتا ہے تو عبقری انسان کی خلوت ہی اس کی انجمن ہوتی ہے۔ آزاد اپنے تئیں دُور اُفتادہ صدا اور غریب الدیار انسان سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ اس عہد اور محل کے انسان نہیں۔ لیکن اس عہد اور محل میں پیدا ہو کر ناقدریٔ زمانہ کی دستبرد میں ہیں۔ وہ سیاستدان نہیں کیونکہ سیاستدان ہمیشہ اپنے مستقبل پر سوچتے ہیں۔ وہ مدبر ہیں اور مدبر انسان کے مستقبل پر سوچتا ہے۔ ہندوستان جن اقوام کا مجموعہ ہے۔ ان میں کوئی سی قوم اپنی بوقلمونیوں کے باعث آزاد سے متفق نہیں۔ وہ اپنے تئیں اس طرح محسوس کرتے ہیں جس طرح لالہ خودرَو کسی بیابان میں ہو۔

(ابوالکلام آزاد، ص۴۸۲ تا ۴۸۶)

مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ:

مولانا سید محمد داؤد غزنوی کا تعلق افغانستان کے شہر غزنی سے تھا۔ ان کے دادا مولانا سید عبداللہ غزنوی غزنی سے ہجرت کر کے مشرقی پنجاب کے شہر امرتسر میں آباد ہو گئے تھے۔ مولانا سید عبداللہ غزنوی ایک فقید المثال شخصیت تھے، اور ان کا شمار اہل اللہ میں ہوتا ہے

انہوں نے حق و صداقت کی راہ میں جو مصائب و آلام برداشت کیے، ان کے تصور سے کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ حکومت وقت نے ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ مگر ان کے پائے ثبات و استقلال میں خفیف سیاسی لرزش بھی رونما نہ ہوئی۔ مولانا سید عبداللہ غزنوی زہد و ورع، تقویٰ و طہارت، للّٰہیت اور علم دین میں یکتائے روزگار تھے۔ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''حضرت عبداللہ بن محمد بن محمد شریف الغزنوی شیخ تھے، امام تھے، عالم تھے، زاہد تھے مجاہد تھے، رضائے الٰہی کے حصول میں کوشاں تھے، اللہ کی رضا کے لیے اپنی جان، اپنا گھربار، اپنا مال، اپنا وطن، سب کچھ لٹا دینے والے تھے۔ علماءِ سو کے خلاف ان کے معرکے مشہور ہیں۔''

(نزہۃ الخواطر ۳۰۲/۷)

مولانا سید داؤد غزنوی کے والد حضرت الامام مولانا سید عبدالجبار غزنوی کا شمار علمائے ربانی میں ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فہم و بصیرت سے نوازا تھا۔ ان کی ساری زندگی قرآن وحدیث کی تدریس میں بسر ہوئی۔ بہت زیادہ عبادت گزار اور شب زندہ دار تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر بڑی یکسوئی اور باقاعدگی سے کرتے تھے۔

مولانا سید داؤد غزنوی اسی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے۔ زہد و ورع، اور تقویٰ و طہارت میں اپنے آباؤ اجداد کے مثل تھے۔ عالی قدر والد محترم اور بلند مرتبت دادا کا زہد و ورع، تقویٰ و طہارت اور فضل و کمال ان کی ذات میں سمٹ آیا تھا۔ اس اعتبار سے وہ ان کے صحیح جانشین تھے۔

فراغت تعلیم کے بعد اپنی آبائی درسگاہ مدرسہ غزنویہ امرتسر میں تفسیر و حدیث کی تدریس پر مامور ہوئے۔

۱۹۱۹ء میں مولانا داؤد غزنوی نے برصغیر کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۹۱۹ء کا سال انگریز کے جبر و استبداد کا دور تھا۔ ملک میں مارشل لاء نافذ تھا۔ جلیانوالہ باغ امرتسر کے حادثہ نے ان کو خاص طور پر سیاسی میدان میں آنے پر مجبور کیا۔

مولانا غزنوی نے برصغیر کی تمام سیاسی، دینی اور قومی وملی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۲۱ء میں جمعیت العلماء ہند کی تشکیل ہوئی تو اس کی تاسیس میں موثر کردار ادا کیا۔ ابتداء میں مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ بعد میں مدتوں نائب صدر رہے۔

تحریک آزادی کے سلسلہ میں کئی بار اسیر زنداں ہوئے۔ ۱۹۲۹ء مجلس احرار قائم ہوئی تو اس کے پہلے جنرل سیکرٹری بنائے گئے۔ ۱۹۴۲ء میں کانگرس میں شمولیت اختیار کی اور انہیں پنجاب کانگرس کا صدر منتخب کیا گیا اور کانگرس کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ سید ابوبکر غزنوی لکھتے ہیں کہ:

"یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت پورے پنجاب میں وہ تنہا تھے جو لیگی اُمیدوار کے مقابلے میں کانگرس کے ٹکٹ پر جیتے تھے۔ اور یہ بات ان کے عوام میں اثر ورسوخ اور ہر دلعزیزی کا واضح ثبوت ہے۔"

(مولانا سید محمد داؤد غزنوی ص ۲۴۷)

اگست ۱۹۴۶ء میں مولانا سید داؤد غزنوی نے کانگرس سے استعفٰی دے دیا۔ اور کانگرس سے استعفٰی کا سبب یہ تھا کہ کانگرس کی ہائی کمان برصغیر کے مسلمانوں کو ہر اسٹیج پر نقصان پہنچانے کے درپے تھی جیسا کہ آپ نے اپنے بیان میں کہا:

"آج کانگرس کا مفہوم اور مقصد صرف اس قدر رہ گیا ہے کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے ہندوؤں کی سیاسی اور اقتصادی بہبود اور ترقی کے لیے کوشاں ہے۔ تو ان مسلمانوں کے لیے اس میں ٹھہرنے کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے جو اس میں اس لیے شامل ہوئے تھے کہ یہ آزادی کے لیے انگریز سے لڑ رہی ہے۔"

کانگرس سے علیحدگی کے بعد مولانا غزنوی نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد مولانا غزنوی نے ہندوستان کے تقریباً بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا اور جلسوں سے خطاب کیا۔ اور جلسوں میں ہندو، اور انگریز دونوں کے مکارانہ عزائم اور مسلمانوں کے خلاف ان کی ریشہ دوانیوں سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ مولانا غزنوی کی تقریروں سے برصغیر کے مسلمان بہت متاثر ہوئے اور مسلم لیگ کو اس سے بڑی تقویت ملی۔

سید ابوبکر غزنوی لکھتے ہیں کہ:

''میں نے ایک بار آپ سے پوچھا کہ آپ نے لیگ میں شامل ہوتے وقت مولانا ابوالکلام آزاد سے مشورہ کیا تھا تو فرمانے لگے کہ اگر ان کے پاس مشورے کے لیے چلا جاتا تو مجھے کبھی مسلم لیگ میں شامل نہ ہونے دیتے۔''

تحریک آزادیٔ وطن میں ان کی خدمات کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا غلام رسول مہر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''وہ کانگرس میں بھی شامل تھے۔ کیونکہ آزادیٔ وطن ان کے نزدیک ایک اہم ملکی فرض ہی نہیں تھا، دینی فرض بھی تھا۔ وہ مجلس خلافت کے سربرآوردہ، رہنماؤں میں گنے جاتے تھے۔ کیونکہ جزیرۃ العرب کی تقدیس اور مملکت ترکیہ کی حفاظت کو ایک مقدس اسلامی خدمت سمجھتے تھے اور جمعیۃ العلماء کے بھی اکابر میں شمار ہوتے تھے۔ کیونکہ مسلمانوں کی دینی رہنمائی اس ذریعے سے بہتر طریق پر انجام پاسکتی تھی۔ اور مذہبی تنظیم کا صحیح راستہ یہی تھا۔''

(مولانا سید محمد داؤد غزنوی ص ۳۴)

شورش کاشمیری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

''اس حقیقت سے شاید کم لوگ واقف ہوں گے کہ پنجاب کے علماء میں وہ پہلے عالم دین تھے، جنہوں نے تحریک خلافت کے زمانہ میں انگریزی حکومت کے خلاف اپنا پرچم کھولا۔ آپ پہلے شخص تھے جنہوں نے امرتسر میں انگریزی حکومت کے خلاف وعظ وارشاد کا سلسلہ شروع کیا۔ اور یہ شرف تاریخ نے ان کے سپرد کر دیا۔ وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو منبر ومحراب کے جمود سے کھینچ کر جہاد وغزا کے میدان میں اُٹھا لائے۔ خود شاہ جی بھی اس کا اعتراف فرماتے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ امرتسر کی دینی زندگی میں سیاسی ہلچل ڈالنے کا آغاز انہی کی بدولت ہوا۔ انہیں پنجاب میں علماء کی جنگ آزادی کا پہلا سالار کہا جاتا ہے۔''

(مولانا سید محمد داؤد غزنوی ص ۶۴)

مولانا سید داؤد غزنوی علم وفضل کے اعتبار سے جامع الکمالات تھے ۔ تمام علوم اسلامیہ پر ان کو یکساں قدرت حاصل تھی ۔ تقریر و خطابت میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ تقریر کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آگ کے شعلے برسا رہے ہیں ۔ مسلک کے اعتبار سے سلفی المسلک تھے ۔ اور کتاب وسنت پر سختی سے عامل تھے ۔ اور اس میں کسی قسم کی مداہنت کے قائل نہ تھے ۔ مولانا ظفر علی خاں نے آپ کے بارے میں فرمایا ہے:

قائم ہے ان سے ملت بیضا کی آبرو
اسلام کا وقار ہیں داؤد غزنوی
رجعت پسند کہنے لگے ان کو دیکھ کر
آیا ہے سومنات میں محمود غزنوی

مولانا سید داؤد غزنوی کو مولانا ابوالکلام آزاد سے والہانہ محبت تھی ، اور دونوں ایک دوسرے کے علم وفضل کے معترف تھے ۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں کہ:

مولانا سید محمد داؤد غزنوی کا کتب خانہ بہت بڑا تھا ۔ تفسیر ، حدیث ، فقہ ، اصول فقہ ، شروح حدیث ، اصول حدیث ، ادبیات ، تاریخ ، فلسفہ ، منطق وغیرہ کی کتابیں اس میں موجود تھیں ، ہر کتاب کی خوبصورت ومضبوط جلد بندھواتے اور نہایت احتیاط سے بہترین الماریوں میں رکھتے ۔ مطالعہ اس قدر وسیع تھا کہ ہر کتاب کے اہم مقامات پر ان کے ضروری نوٹس مرقوم اور نشان ثبت ہیں ۔ وہ نیچے اپنے دفتر میں آکر مصروف مطالعہ ہو جاتے ۔ مسائل فقہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح ان کا زیادہ رجحان حنبلیت کی طرف تھا لیکن وسعت نظر کا یہ عالم کہ ہر قسم کا ذخیرہ ان کے سامنے ہوتا تھا ۔ اور اس موضوع پر اہل علم سے گفتگو کرتے تو بغیر کسی تکلف کے مختلف فقہی کتابوں کے زبانی حوالے دیتے ۔ اور ان کی عبارتوں کے عبارتیں پڑھتے چلے جاتے ۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کے تعلقات کی بڑی وجہ یہی اشتراک علم ومطالعہ تھا۔ فقہائے حنابلہ کے حالات پر مصر سے "طبقات الحنابلہ" (جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے) شائع

ہوئی تو مولانا غزنوی ہندوستان میں پہلے آدمی تھے جنھوں نے مصر سے یہ کتاب منگوائی۔ یہ آزادی سے بہت عرصہ قبل کی بات ہے۔ اس زمانے میں ان کا کتب خانہ امرتسر میں تھا۔ مولانا آزاد امرتسر تشریف لے جاتے تو مسجد غزنویہ میں نماز پڑھتے۔ جمعہ کا دن ہوتا تو خطبہ جمعہ اسی مسجد میں ارشاد فرماتے۔ پھر مولانا داؤد غزنوی کا کتب خانہ دیکھتے۔ ایک مرتبہ اس کتب خانے میں انھوں نے ''طبقات الحنابلہ'' دیکھی تو مسرت انگیز تعجب کا اظہار کیا۔ اور فرمایا، چند روز کے لیے میں یہ کتاب لے جانا چاہتا ہوں۔ مولانا غزنوی نے کتاب دے دی۔ لیکن پھر یہ کتاب واپس نہیں آئی۔ مولانا غزنوی نے اپنے کتب خانے کے لیے اس کا ایک اور نسخہ منگوایا۔ جواب تک ان کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

(نقوش عظمت رفتہ ص ۲۵-۲۶)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ:

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری برصغیر (پاک و ہند) کے نامور خطیب تھے۔ بقول شورش کاشمیری شاہ جی ہندوستانی مسلمانوں کے ویرانہ آباد میں قدرت کا عطیہ تھے۔ وہ خود ایک عہد، ایک تاریخ، ایک ادارہ، ایک تحریک اور ایک جماعت تھے۔ ان سے بڑا عوامی خطیب نہ اُردو زباں نے پیدا کیا ہے اور نہ مستقبل قریب میں اس کے آثار نظر آتے ہیں۔ شاہ جی ۱۹۱۶ء میں اپنی جنم بھومی پٹنہ سے امرتسر آ گئے۔ اور ایک مسجد میں وعظ و خطابت کا سلسلہ شروع کیا۔ سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۹ء میں مولانا سید داؤد غزنوی کے کہنے سے ہوا۔ تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ ۱۹۳۱ء میں مجلس احرار قائم ہوئی اور شاہ جی اس جماعت کے سرکردہ رہنما تھے۔

شاہ جی بہت اونچے مقرر تھے۔ جب تقریر کرتے تو ان کی تقریر سننے کے لیے لوگوں کا بے پناہ ہجوم ہوتا تھا۔ جس شہر، قصبہ میں ان کی تقریر ہوتی، لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوتا جیسے سارا شہر اُمنڈ آیا ہے۔ جب تقریر کرتے تھے تو سامعین واہ واہ کے نعرے لگاتے، ایک دفعہ دورانِ تقریر فرمایا:

''میں تقریر کرتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں واہ شاہ جی واہ، جیل میں بند کر دیا جاتا

ہوں تو کہتے ہیں، آہ شاہ جی آہ، میں واہ اور آہ کے درمیان پھنسا ہوا ہوں۔''

شاہ جی کو اللہ تعالیٰ نے لحن داؤدی عطا کیا ہوا تھا۔ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قرآن اب نازل ہو رہا ہے۔ غالباً الہ آباد جیل کا واقعہ ہے کہ شاہ جی رات کو سورۃ یوسف کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جیلر راؤنڈ پر آ گیا۔ اور جیلر ہندو تھا وہ شاہ جی سے قرآن مجید سن کر اتنا متاثر ہوا کہ اُسی وقت مسلمان ہو گیا۔

پروفیسر حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی بیان کیا کرتے تھے کہ شاہ جی علی گڑھ تشریف لائے۔ اور یونیورسٹی ہال میں تقریر کرنی تھی۔ لیکن یونیورسٹی کے طلباء نے آپ کو تقریر کرنے سے روک دیا۔ اور شاہ جی سے کہا:

''آپ پاکستان کے حامی نہیں ہیں۔ اور آپ کا شمار مخالفین پاکستان میں ہوتا ہے۔ اس لیے ہم آپ کو تقریر نہیں کرنے دیں گے۔ شاہ جی نے فرمایا۔ چلو میں تقریر نہیں کرتا۔ مجھ سے قرآن مجید سن لو۔ طلباء نے کہا، ضرور قرآن مجید سنایئے۔ شاہ جی نے قرآن سنایا۔ ایک دن نہیں تین دن سنایا۔ چوتھے روز طلباء نے کہا۔ شاہ جی تقریر کیجیے۔ ہم آپ کی تقریر سنیں گے۔ چنانچہ شاہ جی نے تقریر کی اور اپنی تقریر میں پاکستان کی ڈٹ کر مخالفت کی ......اور تقریر میں فرمایا کہ پاکستان بننے سے ہندوستان تقسیم نہ ہوگا۔ بلکہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمان تقسیم ہوں گے۔''

بہر حال یہ حقیقت ہے اور اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسا بلند پایہ مقرر وخطیب برصغیر میں پیدا نہیں ہوا۔ شاہ جی کی ساری زندگی دین اسلام کی نشر واشاعت، اور تحفظ ختم نبوت میں بسر ہوئی۔ فتنہ قادیانیت کی بیخ کنی میں برصغیر کے تین علماء نے جو خدمات انجام دیں، ان میں ایک مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے اور دوسرے شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری اور تیسرے مولانا ظفر علی خاں رحمہم اللہ اجمعین۔

مولانا ابو الکلام آزاد سے شاہ جی کے دیرینہ تعلقات تھے۔ شورش کاشمیری مرحوم نے شاہ جی سے مولانا آزاد کے بارے میں ایک ملاقات میں استفسار کیا۔ شاہ جی نے مولانا آزاد کے بارے میں جو ارشاد فرمایا۔ وہ درج ذیل ہے:

شورش کاشمیری لکھتے ہیں۔

راقم نے شاہ جی سے کہا۔

شاہ جی آپ نے زندگی میں کتنی دفعہ مولانا سے ملاقاتیں کی ہیں۔

فرمایا:

یاد تو نہیں۔لیکن بیسیوں دفعہ ان سے فیض حاصل کیا۔ہم نشین رہا۔ہم سفر رہا۔اور بارہا ملاقاتیں کی ہیں۔

راقم مولانا کی عبقریت کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے۔

شاہ جی نے فرمایا:

مولانا چونکہ مسلمان ہیں۔اس لیے ہر جہتی اعتراف مفقود ہے۔ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ابوالکلام آزاد کانگرس کی سب سے بڑی فراست کا نام ہے۔وہ کانگرس کو طوفان سے نکالتے اور مخالفین کے دلوں میں اُتارتے ہیں۔

اس کے بعد شاہ جی نے فرمایا:

احرار کی بنیاد مولانا ہی کے مشورے پر رکھی گئی۔لیکن ہم لاہور میں وہ کلکتے میں، ہم جلوت کے وہ خلوت کے، انہیں ملنا سرخ گندھک ڈھونڈنے کے مصداق تھا۔ہم ان سے دوستانہ بے تکلفی نہ رکھتے، ہمارے اور ان کے درمیان علم کا فاصلہ تو تھا ہی لیکن ان کا ادب و احترام بھی ایک طبعی فاصلہ تھا۔ہمارے سامنے روزمرہ کے عوارض تھے اور وہ ان کی طرف نگاہ ہی نہ کرتے تھے۔تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ احرار ''الہلال'' کی بازگشت ہیں۔

''الہلال'' کے بارے میں شاہ جی نے فرمایا:

''الہلال نے ان کی شریانوں میں لہو دوڑایا۔اور ایک محرک انسان کی طرح قرن اوّل کی طرف لوٹ گئے۔پھر وہاں سے بال و پر لے کر ہندوستان کے افق پر پرواز کی۔''الہلال'' نے قرآن فہمی کے ذوق میں انہیں وسعت و تنوع دیا۔اور ان کی کایا کلپ ہوگئی، ان کی خطابت کا اسلوب اور ان کے مختلف زاویے ''الہلال'' کے مرہون منت ہیں۔آزاد ان کے ذہنی مرشد تھے۔ان

سے بہت سی ملاقاتوں میں فیضان حاصل کیا۔ ہر ملاقات علم ونظر کی ایک نئی دریافت ثابت ہوئی ۔آزاد جس موضوع پر بولتے معلوم ہوتا انہی کا خانہ زاد ہے ۔انہیں قرآن کی تفسیر میں منفرد پایا۔ترجمے میں یکتا، حدیث میں یگانہ، فقہ میں بے مثال، ادب میں بحرنا پیدا کنار، شاعری کا معدن اور نثر میں رستم و اسفندیار، گھنٹوں بولتے ۔لیکن تکرار عنقا، فنونِ لطیفہ میں ان کا جوڑ نہ تھا۔امام الہند فن موسیقی پر زبان کھولتا تو گل فشانی گفتار سے لالہ زار کھل جاتا۔غبار خاطر کا آخری خط ان کے اسی ذوق عظیم کی نشاندہی کرتا ہے، ہندوستان کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے مختلف تصویروں پر ان کے تشریحی حاشیے لاجواب ہیں ۔ میں نے ایک تقریب میں مصوری سے متعلق ان کو ایک تقریر سنی ہے ملک بھر کے نامور مصور جمع تھے، اور وہ ان کی معلومات پر سر دھن رہے تھے ۔سنگ تراشی کے بارے میں ایک دن تاج محل کا ذکر کیا تو دنیا بھر میں گھماتے پھرے۔ سنگ تراشی و معماری کے ارتقاء، تہذیب کی تاریخ اسی طرح بیان کی کہ مخصوص اصطلاحوں کے ساتھ خوبصورت الفاظ کی لہریں اچھل اچھل کر بہہ رہی تھیں ۔ ایک دن مختلف قوموں کے فواکہات ومشروبات کی طلسم ہوش ربا بیان کی تو گفتگو کئی گھنٹوں تک پھیل گئی۔ہم حیران تھے کہ جاپان اور میکسیکو کے فواکہات و مشروبات کی جزئیات تک سے بھی آشنا ہیں ۔ایک دفعہ کبوتروں کا ذکر چھڑ گیا تو ان کی نسلوں اور خوبیوں کا مرقع سناڈالا ۔پھر چرندو پرند کی عادتوں پر روشنی ڈالی تو ایک تہائی دن اس کی نذر ہوگیا۔کسی نے غالب کا ذکر چھیڑا تو سبحان اللہ گویا خود غالب ہیں یا ان کے ساتھ عمر گزاری ہے ۔وہ ولی دکنی سے لے کر عصر حاضر کے ہر شاعر کو جانتے اور ان کے بعض چیدہ چیدہ اشعار بھی حفظ تھے۔ ادب کے ہر شعبہ میں ان کی نگاہ تھی ۔ایک دن رستم زماں گاماں پہلوان ملنے آگئے ۔ہم لوگ وہیں تھے ۔اب جو پہلوانی کی تاریخ بیان کی تو ہم دنگ رہ گئے۔ گویا رستم واسفندیار کے ساتھ ڈنٹر پیلتے رہے ہیں ۔بنوٹ پر گفتگو کی تو پوری

کتاب کہہ ڈالی ۔مولانا محمد علی الہ آباد میں سنگم پر کشتی رانی کے لیے چلے گئے، واپس آئے تو ان سے یہی موضوع چھیڑ دیا۔ وہ گر بتائے کہ فن کی پوری تاریخ سامنے آگئی ۔تمبا کو پر روشنی ڈالی تو کہاں سے کہاں نکل گئے ۔ پان کا تذکرہ کیا تو پتے سے لے کر کتھے تک اور سپاری سے لے کر قوام تک جانے کیا کچھ بیان کیا۔ہم ششدر رہتے ۔الہ العالمین ،ابوالکلام ہیں کہ صحیفہ کائنات ۔"

اس کے بعد شاہ جی نے کہا: ابوالکلام !

(۱) اس زمانے میں ملت اسلامیہ کے سب سے بڑے عبقری ہیں ۔اورفی الواقعہ ابوالکلام ہیں ۔

(۲) ان کا وجود قدرت کا عطیہ اوران کا دماغ معجزۂ الٰہی ہے۔

(۳) وہ مسلمانوں کی اس لیڈر شپ کے میر قافلہ ہیں جو تحریک خلافت کے زمانے میں اُبھری اور قربانی و استقامت کی مظہر ہوگئی ۔ اوراب بھی مسلمانوں کی ناقدری کے باوجود ہندوستان میں سرگرم جہد ہے۔

(۴) وہ قرن اول کے حجاز کی آواز ہیں جو صدیوں کی مسافت کے بعد ہندوستان پہنچ کر خود مسلمانوں کے لیے اجنبی ہوگیا۔

(۵) ان کے ذہنی کمالات اس وجہ سے عوام میں نہیں آئے کہ مسلمان ہیں ۔مسلمان انہیں مانتے نہیں ،اور ہندوؤں کے لیے ایک مسلمان کی پوجا (ورشپ) کیوں کر ممکن ہے۔

(۶) وہ ہندوستان میں اسلام کی صدائے رستا خیز تھے ۔لیکن برطانوی عہد میں مسلمانوں کو رزم کے حدی خواں کی نہیں بزم کے نغمہ خواں کی ضرورت رہی ہے۔اور وہ ہمیشہ گفتار کے غازی ہی کا اتباع کرتے رہے ہیں۔

(۷) مولانا نے مسیح کی مانند صلیب پائی اور سقراط کی طرح زہر کا جام پیا ہے۔

شاہ جی نے کہا: مولانا نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے ۔ممکن تھا ہندوستان کوئی اور کروٹ لیتا اور مسلمانوں کی سیاسی رفتار بیابانوں کی سمت مڑ جاتی ۔ بہرحال مسلمانوں نے مولانا سے جو سلوک کیا وہ "مصحفے درمیان زندیقان" کے مصداق ہے۔

(ابوالکلام آزاد ص ۴۹۰ تا ۴۹۶)

خان عبدالغفار خان:

خان عبدالغفار خاں مشہور کانگرسی لیڈر تھے۔ زندگی کے آخری ایام تک کانگرس سے وابستہ رہے۔ آپ تقسیم ملک کے مخالف تھے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی ان کی مخالفت کا سلسلہ جاری رہا۔ اور پاکستان میں قید و بند کے مصائب برداشت کیے لیکن اپنے موقف سے نہیں ہٹے اور ان کی مخالفت اس درجہ تک پہنچ گئی ہوئی تھی کہ انہوں نے وصیت کی تھی کہ مجھے پاکستان کی سرزمین میں دفن نہ کیا جائے۔ چنانچہ انہیں جلال آباد (افغانستان) میں دفن کیا گیا۔ آغا شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ:

> ''پاکستان میں اپنی طویل قید سے بادشاہ خان اچانک رہا کر دیے گئے تو ابتداء میں ان کا سرحد میں داخلہ ممنوع تھا۔ اور وہ راولپنڈی سے رہا ہو کر لاہور پہنچے۔ اور راقم کے ہاں مقیم ہوئے ...... راقم نے بادشاہ خان سے کانگرس کی ہائی کمان کے مستقل ارکان کی بابت پوچھنا شروع کیا تو انہوں نے فرداً فرداً ہر شخص کے مختلف خصائص بیان کیے۔''

راقم نے گاندھی جی، جواہر لعل نہرو، سردار پٹیل، راجندر بابو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں استفسار کیا۔

بادشاہ نے ہر ایک بارے میں اپنا عندیہ ظاہر کیا اور بتایا کہ ان کے خصائص کیا تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں بادشاہ خان نے کہا:

مجھے سیاسی چسکہ ''الہلال'' نے ڈالا اور میری زندگی کا دھارا بدل دیا۔ ''الہلال'' اور ''زمیندار'' یہی دو اخبار تھے جو مجھے سیاست کی وادی میں لائے۔ اور میں ہمیشہ کے لیے قومی جدوجہد کا ہو گیا، میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے ابتداء مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کے قلم کی جولانیوں نے اس درجہ متاثر کیا کہ برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد عمر بھر کا سفر ہو گئی۔

کوئی سولہ سترہ برس مولانا آزاد کے ساتھ کانگرس ورکنگ کمیٹی میں رہا اور یہ ساتھ اس وقت چھوٹا، جب ملک تقسیم ہو کر آزاد ہو گیا۔ ایک زمانے میں ان سے مصافحہ کرنے کی

حسرت تھی۔ پھر سالہا سال ان کی رفاقت میں بسر کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کانگرس میں شہ دماغ شخصیت تھے۔ وہ ہماری طرح منکسر المزاج اور درویش انسان نہیں تھے۔ لیکن ان کی گھٹی میں فقر و استغناء پڑے تھے۔ وہ علم کے بل پر مزاج کے شہنشاہ تھے، کسی پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کے نتیجے پر پہنچنا ان کے لیے مشکل نہ تھا، آن واحد میں مسئلے کے حل تک پہنچ جاتے اور جہاں تک کسی مسئلے یا موضوع کے بیان کرنے کا تعلق تھا وہ ایک بہتے ہوئے مقدس دریا کی طرح تھے۔ انسان ان کے کلام کی طاقت سے مغلوب ہوتا۔ اوران کی شیوہ بیانی سے مفتوح ہو جاتا۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی عبقریوں کا مجموعہ تھی۔ لیکن مولانا آزاد سب پر چھائے رہتے، کوئی شخص ان کی زبان و دماغ کی تاب نہیں لاسکتا تھا۔ بسا اوقات کئی تجویزیں گاندھی جی کی تالیف ہوتیں لیکن آل انڈیا کانگرس کمیٹی سے منوانے کے لیے مولانا کی طلاقت لسانی کام آتی اور مجوز سے کہیں زیادہ ان کا زور بیان توثیق کا باعث ہوتا۔

میں نے پوچھا: مولانا کے متعلق آپ کا اجتماعی تاثر کیا ہے؟

بادشاہ خان نے کہا:

مولانا ایک ہمہ گیر انسان تھے اور ہر موضوع پر اس جامعیت کے ساتھ بولتے کہ سب ہمہ تن گوش ہوتے۔ ورکنگ کمیٹی میں عالمی مسائل کا تجزیہ فرماتے تو حیرت ہوتی کہ اس شخص کی نگاہ کتنی عمیق ہے۔ ملکی مسائل پر بات چیت کرتے تو ہم ششدر رہ جاتے کہ ان کا نقطہ نگاہ سب سے مختلف بھی ہے اور پر معنی بھی۔ اکثر نتائج انہی کے تجزیے اور نظریے کے مطابق ہوتے۔ کانگرس کی بہت سی قرار دادیں ان کے قلم سے نکلتیں۔ پنڈت جواہر لعل نہرو انگریزی میں ترجمہ کرتے۔ اگر قرار داد پنڈت جی کے قلم سے ہوتی تو مولانا اس کے بہت سے انگریزی الفاظ بدلوا ڈالتے اور ان کے متبادل الفاظ تجویز کرتے۔ ان کا دماغ قدرت کے عجائبات کا خزینہ تھا۔ وہ برعظیم کے مسلمانوں کی علمی وجاہتوں کی آخری ذہانت تھے۔ مسلمانوں نے ان سے جو سلوک کیا، وہ اس یقین کو راسخ کرتا تھا کہ اسلامی تاریخ انہی المیوں سے پُر ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ یا امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی تو ان ناموافق راہوں سے گزرے تھے۔ مسلمانوں کی تاریخ شہادت عمر رضی اللہ عنہ سے شروع ہو کر اس زمانے تک کچھ

ایسی ہی چلی آ رہی ہے کہ ان کے کسی بڑے کی عظمت کا اعتراف اس کی رحلت ہی سے شروع ہوتا ہے۔ (ابوالکلام آزاد ص ۴۸۹، ۴۹۰)

مولانا عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ:

مولانا عبدالماجد دریابادی مشہور ادیب، فلسفی، نقاد، مبصر، دانش ور، مصنف، صحافی، مترجم اور اُردو و انگریزی کے مفسر قرآن تھے۔ عصری تعلیم بی اے تھی۔ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی ان میں بہت زیادہ مہارت تھی۔ فلسفہ، نفسیات اور منطق پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اور ان علوم پر ان کے وسیع مطالعہ نے ان کو مذہب اسلام سے بہت دور کر دیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ مذہب سے بالکل برگشتہ ہو کر لادینیت اور عقلیت پسندی پر فخر کرنے لگے اور آخر بالکل لامذہب ہو گئے۔

۱۹۱۹ء میں ان کے خیالات میں انقلاب آیا۔ اور پھر مذہب کی طرف لوٹ آئے۔ اس کے بعد کئی ایک کتابیں انہوں نے مذہب اسلام پر لکھیں۔ قرآن مجید کی تفسیر بزبان اُردو اور انگریزی لکھی۔

مولانا عبدالماجد برصغیر کے بہت بڑے صحافی بھی تھے۔ برصغیر کے مشہور صحافیوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور صحافت میں ان کی خدمات قدر کے قابل ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں ظفر الملک علوی کی معیت میں ہفتہ وار ''سچ'' جاری کیا۔ ۱۹۳۳ء میں یہ بند ہو گیا۔ دو سال بعد انہوں نے بلا شرکت غیرے ''صدق'' نکالا۔ پہلے یہ اخبار ہفتہ میں دو بار چھپتا تھا لیکن بعد میں اس کی اشاعت ہفتہ وار ہو گئی، اور یہ اخبار ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ اور چند ماہ بعد مولانا دریابادی نے دوبارہ جاری کیا۔ لیکن اب ''صدق جدید'' کے نام سے جاری ہوا اور یہ اخبار ان کی زندگی تک جاری رہا۔

مولانا دریابادی شاعر بھی تھے۔ کچھ عرصہ اکبر الہ آبادی سے اصلاح لی۔ لیکن بہت جلد شاعری سے دستبردار ہو گئے۔ ان کا اصلی کارنامہ ''نثر نگاری'' ہے، وہ صاحب طرز نثر نگار تھے۔ ان کی سی شگفتہ اور برجستہ نثر بہت کم کسی نے لکھی ہے۔ مولانا دریابادی بنیادی طور پر ایک ادیب تھے اور ادیب بھی ایسے جن کا اپنا ایک منفرد اور ناقابل تقلید اسلوب تھا۔ انہوں

نے ہر جگہ اس اسلوب کا جادو جگایا ہے۔ مولانا دریابادی کی انشاء پردازی بھی مسلم تھی۔
مولانا سعید احمد اکبرآبادی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا دریابادی فطرتاً اُردو زبان کے نامور ادیب اور انشاپرداز ہیں۔ اپنے طرز خاص کے خود ہی موجد اور غالباً خاتم بھی ہیں۔ اس لیے عرصہ سے مذہبیات ایسے خشک اور بے مزہ موضوع میں مشغولیت کے باوجود اب بھی کسی تقریب سے مولانا کا قلم اس پرانے چمن کی طرف آنکلتا ہے تو، تو اسی طرح حسن بیان وادا کے پھول کھلاتا چلا جاتا ہے۔ اس نوع کے تمام مضامین ہماری زبان و ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ جنہیں محفوظ ہونا چاہیے۔ آئندہ نسلیں پڑھیں گی اور سردھنیں گی۔ مقالات تو مقالات ایک شذرہ یا نوٹ بھی قلم سے نکل جاتا ہے، تو وہ بھی شہ پارۂ ادب ہوتا ہے۔''

(ماہنامہ برہان دہلی، مارچ ۱۹۶۳ء ص ۱۹۲)

مولانا عبدالماجد کا عظیم ترین کارنامہ ان کی تفسیری خدمات ہیں۔
قرآن مجید کی آپ نے انگریزی اور اردو میں تفسیر لکھی۔ اس کے علاوہ قرآن مجید سے متعلق آپ نے جو کتابیں لکھیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔
ارض القرآن یا جغرافیہ قرآنی ......اعلام القرآن یا قرآنی شخصیات۔ الحیوانات فی القرآن، بشریت انبیاء، قصص الانبیاء، سیرت نبوی قرآنی، مسائل وقصص، مردوں کی مسیحائی، مشکلات القرآن یا قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں۔
مکتوب نگاری میں بھی مولانا عبدالماجد کا شمار صف اول کے ادباء وفضلاء میں ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے وسط سے اب تک جن ادباء، فضلاء، شعراء نے مکتوب نگاری میں نام پیدا کیا ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، اکبرالہ آبادی، علامہ اقبال، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی سرفہرست ہیں۔ مکاتیب کے جن مجموعوں نے بے مثال مقبولیت حاصل کی، ان میں مولانا آزاد کے کاروانِ خیال اور غبارِ خاطر اول نمبر پر ہیں۔
مولانا عبدالماجد کے مکاتیب کو اُردو ادب میں ایک اچھا خاصا مقام حاصل ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ان کے خطوط اُردو ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی مولانا دریابادی کے خطوط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''مولانا دریابادی کی حقیقت پسندی اور اجتہادی فکر کا اندازہ ان کی دیگر کئی علمی فتوحات سے بھی ہوتا ہے۔ لیکن ان کے خطوط کی خوبی یہ ہے کہ یہاں ان کا اندازِ فکر کچھ اور نکھر کر اور زیادہ آزاد فضا میں سامنے آتا ہے اور گویا ایک سطح پر ان کے علمی کارناموں کے مشمولات کی تصدیق کرتا ہے...... جہاں تک ان خطوط کے اسلوب بیان کا تعلق ہے۔ اس میں سادگی اور بے تکلفی کی فضا کم و بیش ہر جگہ برقرار ہے۔''

(عبدالماجد دریابادی، احوال وآثار ص ۴۵۷)

مولانا عبدالماجد دریابادی کی مولانا آزاد سے بھی خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا دریابادی کا مولانا آزاد سے ایک خاص تعلق تھا۔ مولانا آزاد کے انتقال کے بعد مولانا دریابادی نے کئی ایک مضامین مولانا آزاد سے متعلق اپنے اخبار ''صدق جدید'' میں لکھے۔ اور ریڈیو پر بھی تقاریر کیں۔ ذیل میں مولانا دریابادی کی ریڈیائی تقاریر اور مضامین کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا دریابادی لکھتے ہیں:

''ابوالکلام آزاد ایک سیاستدان ہی نہیں، ایک جماعتِ قومی کے صدر ہی نہیں، ایک عظیم قائد ہی نہیں، ایثار و قربانی کی ایک مجسم مثال ہی نہیں علم و ادب کا امام ہے۔ قرآن کے علوم و معارف کا راز دان ہے اسرار شریعت کا پردہ کشا ہے، ہندوستان میں تنہا اسی کی ذات ہے جس نے لوگوں کو قرآن کی طرف متوجہ کیا؛ مولانا محمد علی نے اگر یہ کہا تو بالکل صحیح کہا کہ اسلام میں نے دو بزرگوں سے سیکھا۔ ایک شکوہ جواب شکوہ کے مصنف اقبال سے اور دوسرے ''الہلال'' کے مدیر مسئول مولانا ابوالکلام آزاد سے، ہماری زبان کے مشہور روزگار شاعر

حسرت نے ایک زمانہ میں مولانا کی انشاء پردازی کے متعلق فرمایا تھا اور کیا خوب فرمایا تھا:

جب سے دیکھی ہے ابو الکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

(اکتوبر ۱۹۴۶ء بحوالہ امام الہند، ابوالکلام آزاد از ابوعلی اثری ص ۱۴۴)

تحریر و انشاء میں اپنے اسلوب کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی، ان کی ادبی شخصیت کی وسعت اور بلندی دونوں کا پوچھنا ہی کیا ہزار ہا صفحات پر ان کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

سیاست کے کوچہ میں قدم رکھا تو دیکھتے ہی دیکھتے صف اول کے لیڈروں میں شمار ہونے لگے۔ نوبت یہ پہنچی کہ سردار پٹیل سے اپنا لوہا منوایا۔ اور گاندھی جی اور جواہر لعل تو جیسے ان کا کلمہ ہی پڑھنے لگے۔ کلمہ ان کی پرجوش خطابت کا نہیں کلمہ ان کی فہم و فراست کا، دانش و بینش کا، دور بینی اور تدبر کا۔

(صدق جدید ۲۲، نومبر ۱۹۶۳ء)

مولانا نے علوم عربی اسلامی کی تحصیل و تکمیل باقاعدہ کی ہو یا نہ کی ہو، بہر حال ان کی نظر کہنا چاہیے کہ سارے ہی علوم دینی پر وسیع و محیط تھی اور دماغ مجتہدانہ لے کر آئے تھے۔ آخر عمر میں اخلاقی حیثیت سے بڑے پاکیزہ ہو گئے تھے۔ اور عمر میں پختگی اور سنجیدگی آ جانے سے شوخی و ظرافت پر قابو حاصل ہو گیا تھا۔ دوسرے کا کام نکال دینے میں ہر وقت مستعد و آمادہ رہتے تھے۔ بڑی بات یہ کہ ہندی سرکار اور ہندو اہل حکومت سے اتنا گہرا اور ہمہ وقتی تعلق رکھنے کے باوجود اکثریت سے مرعوب ذرا نہیں ہوئے۔ اور کسی موقع پر بھی اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے نہ شرمائے۔ لغزشیں اور کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔

(اُردو کا ادیب اعظم ص ۴۲)

مولانا آزاد کے انتقال پر مولانا دریابادی نے اپنے اخبار ''صدق جدید'' ۲۸ فروری ۱۹۵۸ء میں لکھا:

آہ ابوالکلام!

آج وہ اُٹھ گیا

(۱) جو اُردو ادب و انشاء میں ایک ممتاز ترین مقام رکھتا تھا جس کا اس میدان میں کوئی سہیم و شریک نہ تھا اور جس نے اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا۔

(۲) جو اُردو زبان کا ایک بہترین مقرر و خطیب تھا۔

(۳) جو مدتوں دین و قرآن کی خدمت بھی اپنی بصیرت و ادراک کے مطابق کرتا رہا۔

(۴) جو ملکی سیاسیات کی صف اول میں ۴۰-۴۵ سال سے رہا کیا تھا۔

(۵) جس نے اُردو صحافت میں ایک بالکل نیا اور شاندار باب کھول دیا۔

(۶) جو عظیم الشان تحریک خلافت کے اکابر کی کہنا چاہیے کہ اب آخری یادگار رہ گیا تھا۔

(۷) جو اب ایک پیکر خلافت بن گیا تھا اور ۱۹۴۷ء کے بعد خدا معلوم کتنے بے سہاروں کا سہارا بنا رہا۔

اللہ بال بال مغفرت فرمائے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

مولانا حسرت موہانی رحمہ اللہ:

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی جن کا لقب ''رئیس الاحرار'' تھا، تحریک آزادی کے نامور رہنما تھے۔ خود فرماتے ہیں:

عشق نے جب سے کہا حسرت مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں ''فضل الحسن''

۱۹۰۴ء میں کانگرس میں شامل ہوئے اور جب ۱۹۰۷ء میں کانگرس دو ٹکڑوں میں بٹ گئی تو انہوں نے بال گنگا دھر تلک کی رہنمائی میں اس سے وقتی طور پر علیحدگی اختیار کر لی اور سیاست اور سودیشی کے معاملہ میں آخر وقت تک ''تلک'' ہی کے مقلد رہے۔ مولانا حسرت کی ساری زندگی عبارت تھی ظلم و جہل، ناانصافی اور استبداد کے خلاف مسلسل جدو جہد سے، وہ پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل کو زینت بخشی اور اس کے بعد متعدد بار مولانا حسرت نے جیل کی سیر کی۔

مولانا حسرت نے ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی ۱۹۰۴ء میں اجلاس کانگرس منعقدہ بمبئی میں کانگرس کے اجلاس میں شرکت کی۔ اور اس کے بعد کانگرس میں شمولیت اختیار کرلی۔

مولانا حسرت موہانی ایک بلند پایہ شاعر اور ادیب تھے۔آپ نے ایک ماہنامہ رسالہ ''اُردوئے معلیٰ'' کے نام سے علی گڑھ سے جاری کیا۔ جس میں ادبی، شعری اور سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں اُردوئے معلیٰ میں ایک بے نام صاحب قلم کا ایک مضمون مصر کے نامور لیڈر مصطفیٰ کامل کی موت پر شائع ہوا۔جس میں مصر میں انگریزوں کی پالیسی پر بے لاگ تنقید تھی۔ حکومت نے اس مضمون کو قابل اعتراض سمجھا۔ مولانا کو گرفتار کرلیا گیا۔ دو سال قید کی سزا ہوئی۔ ان کا کتب خانہ اور پریس پولیس کے ظلم وستم کی نذر ہو گئے۔ اس کتب خانہ میں شعراء کے تذکرے اور دواوین کے نامور نسخے تھے اور حکومت نے سارا کتب خانہ ساٹھ روپے میں نیلام کردیا۔

پروفیسر ضیاءالدین احمد برنی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ (اُردوئے معلیٰ) میں مصر کے بارے میں برطانوی پالیسی پر کڑی تنقید کی تھی۔ یہ آرٹیکل جس کا عنوان تھا ''مصر میں انگریزی سیاست'' دراصل ترجمہ تھا کسی عربی مضمون کا اور مولانا نے سچے صحافی کی حیثیت سے لکھنے والے کا نام حکومت کو بتانے سے صاف انکار کردیا تھا۔ اس بنا پر ان کے خلاف ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے مقدمہ چلایا گیا، اور دو سال کی سزا دے دی گئی۔ اس زمانہ میں اے، بی، سی، کلاسیں نہیں بنی تھیں۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے معمولی قیدیوں کی طرح جیل کی سختیاں سہیں، ماریں کھائیں، لیکن اُف تک نہ کی اور کوئی کمزور طبیعت کا آدمی ہوتا، تو معافی مانگ کر جیل سے کبھی کا باہر نکل آتا۔ مگر مولانا جو پیکر ایثار وقربانی تھے، صبر وسکون سے غیر ملکی حکومت کے مظالم برداشت کرتے رہے۔ ذیل کے اشعار اسی دور کی یادگار ہیں:

ہے مشق سخن جاری ، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
کٹ گیا قید میں ماہ رمضان بھی حسرت
گرچہ ساماں سحر کا تھا نہ افطاری کا

(عظمت رفتہ ص ۱۸۷، ۱۸۸)

مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

''یہاں حسرت کے ایک کریکٹر کا ذکر کرنا ہے۔ مضمون مذکور حسرت کا نہ تھا مگر مقدمہ قائم ہونے پر حسرت نے اس کو خود اوڑھ لیا۔ اور باوجود اصرار کے اس کے لکھنے والے کا نام نہیں بتایا۔ جہاں تک کان میں پڑی ہوئی بات اس وقت یاد آتی ہے یا خیال آتا ہے، یہ مضمون اعظم گڑھ کے مشہور شاعر وکیل اقبال سہیل کا تھا۔ جو مولانا حسرت موہانی سے شعر و سخن اور سیاسی مذاق کا اتحاد رکھتے تھے۔''

(یاد رفتگان ص ۴۲۵)

حسرت بااصول آدمی تھے، پوری زندگی اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کیا اور شروع سے جو اصول قائم کیے تھے ان میں سرِ مُو فرق نہ آنے دیا۔

مولانا حسرت موہانی مکمل آزادی کے حامی تھے اور ملک کے دوسرے سیاسی لیڈروں کی طرح ڈومی نین اسٹیٹس (DOMINION STATUS) پر اکتفا کرنے والے نہ تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے کامل آزادی کی تجویز انڈین نیشنل کانگرس کے سامنے رکھی جسے اس نے خاص مصلحتوں کے تحت مسترد کر دیا۔ حسرت جس چیز کو اپنے ملک کے لیے اچھا سمجھتے تھے اس کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔ خواہ اس کے نتائج و عواقب کچھ ہی کیوں نہ نکلیں۔ وہ بڑی سے بڑی ہستی سے بھی کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ وہ حق بات کہنے میں بالکل نڈر اور بے باک تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ساری زندگی اس قسم کے جہاد میں گزری، ایسے مرد قلندر قرنوں میں دنیا میں آتے ہیں۔ (عظمت رفتہ ص ۱۸۹)

کانگریس کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے علیحدہ ہو گئے اور مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔لیکن یہاں بھی مولانا اپنے اصولوں سے نہیں ہٹے۔حسرت جیسا بے باک اور نڈر لیڈر، برصغیر میں پیدا نہیں ہوا۔ان کی جرأت اور دلیری کا ایک واقعہ پروفیسر ضیاء الدین احمد برنی نے نقل کیا ہے کہ:

''ایک ثقہ راوی کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب کہ دہلی میں چاروں طرف آگ ہی آگ لگی ہوئی تھی۔اور مسلمانوں پر زندگی حرام ہو رہی تھی۔مولانا دن کے وقت کسی نہ کسی حصہ میں کناٹ پیلس پہنچ جاتے تھے۔اور تن تنہا ادھر اُدھر گھومتے پھرتے تھے۔خدا جانے ان کے دل میں اس وقت کیا کیا خیالات موجزن رہتے ہوں گے۔دہلی کی حکومت نے خفیہ طریقہ سے سی۔آئی۔ڈی کے چند مسلح سپاہی ان کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کر دیے تھے۔جو ہر جگہ ان کی حفاظت کرتے رہے تھے۔کان پور میں ہندوستان کے فسادات کے زمانہ میں بھی وہ بے دھڑک ہندو محلوں میں جا کر روزانہ ترکاری خرید کر لایا کرتے تھے۔انہیں خطرہ میں رہ کر زندگی بسر کرنے میں لطف آتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ خطرات سے متاثر ہونے کے عادی نہ تھے۔''

(عظمت رفتہ ص ۱۹۲، ۱۹۳)

حسرت جیسی متضاد طبیعت کا انسان شاید ہی منصۂ شہود پر آیا ہو۔وہ سیاسیات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور شعر و سخن سے بھی اور یہ دونوں چیزیں حسرت کے مزاج میں جمع تھیں۔ اور خود حسرت کو بھی اس اجتماع ضدین پر تعجب تھا۔فرماتے ہیں:

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اِک طُرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

''سید فضل الحسن حسرت موہانی کی زندگی کے واقعات پر نظر کر کے ان کی شان حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ صحابی کی سی نظر آتی ہے۔جن کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: ''ابوذر رضی اللہ عنہ سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی۔''
سچ یہ ہے کہ اس عہد پر فریب میں حسرت سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی۔ اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے بعد یہ قول نبوی حقیقت میں ان پر صادق آتا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حق گوئی نے ان کو زندگی میں تنہا چھوڑ دیا۔ ان کا کوئی ساتھی نہیں رہا۔ اس لیے اس فقرہ کا مورد بھی حسرت کی ذات تھی۔ تنہا جیا اور ستودہ مرا۔''

(یادرفتگان ص ۴۴۰)

مولانا حسرت موہانی کے مولانا ابوالکلام آزاد سے دیرینہ تعلقات تھے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے علم و فضل، علمی و ادبی اور قومی و ملی اور سیاسی خدمات کے معترف تھے۔ مولانا حسرت موہانی نے مولانا آزاد کے علم و فضل اور ان کی ادبی و علمی خدمات سے متعلق اعتراف اپنے دو شعروں میں کر دیا ہے اور وہ دو شعر یہ ہیں:

جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا
سب ہو گئے خاموش ایک حسرت
گویا ہیں ابو الکلام آزاد

مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمہ اللہ:

مولانا سعید احمد اکبر آبادی برصغیر (پاک و ہند) کے نامور عالم دین، بلند پایہ مصنف، صحافی، خطیب، معلم اور دانشور تھے۔ ان کی عصری تعلیم ایم اے تھی۔ اور دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ تمام علوم اسلامیہ پر ان کو یکساں قدرت حاصل تھی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور اسماء الرجال پر ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ تدریس کا آغاز دارالعلوم ڈابھیل (سورت) سے کیا۔ اس کے بعد کچھ مدت تک سینٹ اسٹیفن کالج میں پروفیسر رہے۔ ۱۹۴۸ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ایماء پر مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا۔ اور ۱۹۵۹ء تک اس

مدرسہ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۹ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ سنی و دینیات کے صدر بنائے گئے۔ اور اس کے ساتھ فیکلٹی آف تھیالوجی کے ڈین مقرر ہوئے، علی گڑھ سے فارغ ہوئے تو ہمدرد دہلی کے ایک تحقیقی ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ اور چار سال تک اسی ادارہ میں مصروف عمل رہے۔

علی گڑھ کے قیام کے دوران ایک سال کینیڈا میں گزارا۔ وہاں آپ میکگل یونیورسٹی سے منسلک رہے۔ علی گڑھ سے ریٹائر منٹ کے بعد ایک سال کالی کٹ یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں بھی رہے۔ وہاں انہیں شیخ الہند اکیڈمی کا ڈائریکٹر بنایا گیا۔ اور اس کے ساتھ دارالعلوم میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی مشہور تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا درس بھی دیتے تھے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی بلند پایہ صحافی اور مصنف بھی تھے۔ مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی نے جب دہلی میں ندوۃ المصنفین قائم کیا اور اس کے ساتھ ایک ماہوار علمی رسالہ ''برہان'' جاری کیا تو آپ کو ''برہان'' کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ آپ تقریباً ۴۰ سال تک ''برہان'' کے ایڈیٹر رہے۔ ''برہان'' میں آپ ''نظرات'' کے عنوان سے کسی اہم قومی، ملی، علمی، تہذیبی، سیاسی یا کسی قومی حادثے یا کسی نامور شخصیت کے انتقال پر اظہار خیال کرتے تھے۔ اور اس کے ساتھ نئی کتابوں پر تبصرہ بھی کرتے تھے۔ ان کے نظرات ان کے علمی تبحر، ذوق مطالعہ اور وسعت معلومات کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ مولانا اکبر آبادی ایک کامیاب مصنف بھی تھے۔ آپ نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ ان کی تصانیف سے ان کے جامع الکمالات ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ آپ کی تصانیف میں فہم قرآن، وحی الٰہی، غلامان اسلام، اسلام میں غلامی کی حیثیت، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، اورعثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ بڑی اعلیٰ اور عمدہ تصانیف ہیں۔

مولانا سید احمد اکبر آبادی دیوبند نظام فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ سیاسیات میں دیوبند کی انقلابی جماعت کے ساتھ وابستہ تھے۔ سیرت واخلاق کے اعتبار سے بہت اعلیٰ وارفع تھے۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری لکھتے ہیں کہ:

''مولانا سعید احمد اکبر آبادی عظیم علمی شخصیت تھے۔ اعلیٰ درجے کے معلم تھے۔ ایک علمی خطیب تھے۔ ان کی نظر نہ صرف برصغیر کی علمی و ادبی، تعلیمی و تہذیبی تحریکوں پر بہت گہری تھی۔ وہ ایک بلند پایہ مبصر بھی تھے۔ ان کے علم کی گہرائی اور مطالعہ کی گہرائی بے پناہ تھی، وہ اُردو زبان کے بلند پایہ ادیب تھے۔ اور عربی، فارسی اور انگریزی زبان سے صرف واقفیت ہی نہ رکھتے تھے، بلکہ ان زبانوں کے ادب سے ذوق آشنا تھے۔ وہ ایک بلند پایہ عالم دین تھے اور مختلف اسلامی علوم وفنون خصوصاً تاریخ، فقہ، تفسیر، حدیث میں ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت ذہنی و دماغی صلاحیتوں، فکر ونظر کی دولتوں، اور اخلاق وسیرت کی رفعتوں سے نوازا تھا۔ وہ ایک کھلے ذہن و دماغ کے مالک اور فراخ حوصلہ انسان تھے۔''

مولانا سعید احمد اکبر آبادی بلند پایہ عالم دین، مفکر، ادیب، مصنف، محقق، مدرس اور علمی خطیب تھے۔ ان کے مطالعے کی طرح ان کا قلب بھی بہت وسیع تھا۔ وہ اخلاق وتواضع کا مجسمہ اور رواداری کی مثال تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم کے ساتھ عمل اور عمل میں اخلاص وتقویٰ کی خوبیوں سے نوازا تھا۔

پروفیسر حکیم عنایت اللہ سوہدروی مرحوم مشہور ادیب اور طبیب حاذق تھے۔ ان کی ملاقات کراچی میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی سے ہوئی اور دونوں کی اکٹھی تصویر بھی ہے۔ حکیم صاحب نے راقم سے فرمایا کہ:

''میری ملاقات مولانا سعید احمد اکبر آبادی سے، کراچی میں ہوئی۔ ملاقات تقریباً ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت جاری رہی۔ مختلف موضوعات زیر بحث آئے۔ میں نے اندازہ کیا کہ مولانا اکبر آبادی بڑے وسیع المطالعہ عالم دین ہیں۔ اور برصغیر کی تحریک آزادی کے متعلق ان کا دائرہ معلومات بڑا وسیع ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سلیمان ندوی اور مولانا ظفر علی خاں کے متعلق ان سے گفتگو ہوئی تو مولانا اکبر آبادی نے مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں

فرمایا: حکیم صاحب مولانا آزاد جیسی علمی شخصیت ہندوستان میں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ صحیح معنوں میں عبقری تھے۔ تمام علوم اسلامیہ میں ان کا علمی تبحر مسلم تھا۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی کے بارے میں فرمایا۔ سید صاحب جیسا مورخ اور محقق ہندوستان میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ عربی، فارسی اور اُردو کے بلند پایہ ادیب تھے۔ اور ان کی علمی و تاریخی تحقیقات کا مغربی سکالروں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کے کیا کہنے کہ ان جیسا فی البدیہہ شاعر، اور نڈر لیڈر ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ پنجاب کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے اقبال اور ظفر علی خاں جیسے بلند پایہ شاعر پیدا کیے۔ مولانا ظفر علی خاں نے یہ شعر مدتوں پہلے میں پڑھا تھا:

حاسدانِ تیرہ باطن کو جلانے کے لیے
اے پنجاب تجھ میں اقبال و ظفر پیدا ہوئے

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو مولانا آزاد سے بہت زیادہ عقیدت اور محبت تھی۔ اور ان کے علم و فضل اور ان کی دینی و علمی اور قومی و ملی اور سیاسی خدمات کے معترف تھے۔ مولانا اکبر آبادی نے مولانا آزاد کی کتابوں پر تبصرہ بہت محبت و عقیدت سے کیا ہے۔ ترجمان القرآن پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں کہ:

''ترجمان القرآن ''مولانا'' آزاد کی تصنیفات میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو علمی و مذہبی دنیا میں ان کے لیے بقائے دوام کی ضامن ہے۔

''یہ کتاب جس پایہ کی ہے، اس کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں کم از کم اُردو میں یہ پہلی تفسیر ہے جس میں قرآن کو اس کی اصل اسپرٹ میں کلامی، فقہی اور فنی مباحث سے بلند رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

(ماہنامہ برہان دہلی نومبر ۱۹۶۵ء)

''خطبات آزاد'' پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا اکبر آبادی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم انشاء اور خطابت دونوں کے بادشاہ تھے۔

خطابت کے لیے فنی طور پر جو ظاہری حسن و جمال اور صوری رعنائی و دلکشی درکار ہوتی ہے۔ قدرت نے انہیں ان سب سے بہ حصہ وافر نوازا تھا۔ ان کی خطابت جادو جگاتی اور طوفان اُٹھاتی تھی ۔ وہ کبھی رعد و برق کی گرج تھی ۔ اور کبھی نسیم سحر کی موجِ حیات آفریں۔ وہ صور اسرافیل بھی تھی اور زعفران زار کشمیر بھی ۔''

(ماہنامہ برہان دہلی، مارچ ۱۹۷۵ء)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ۱۹۸۴ء میں لاہور آئے ۔ آپ نے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور میں ''مولانا ابوالکلام آزاد سیرت و شخصیت اور علمی و عملی کارنامے'' کے عنوان سے ایک طویل مقالہ پڑھا۔ جس میں آپ نے مولانا آزاد کی علمی، دینی اور سیاسی خدمات کا تذکرہ کیا۔ یہ مقالہ ماہنامہ حکمت قرآن اگست ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس مقالہ میں جن عنوانات پر اظہار خیال کیا ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

مولانا آزاد کا خاندان اور تعلیم ...... مولانا کا ذوق علمی ، مولانا آزاد کا علمی مقام ، معمولات کی پابندی ، وجود باری تعالیٰ، مذہب کی ضرورت اور اسلام کی حقانیت ، مولانا آزاد کی دعوت ، مسجد کانپور کا حادثہ، حضرت شیخ الہند کی تحریک اور مولانا آزاد کا اس سے تعلق، ''الہلال'' کی دعوت جہاد و رجوع الی القرآن ، ایک بے مثال خطبہ، مولانا آزاد کا تبحر علمی، آزادی کی مشترکہ جدوجہد اور عالم اسلام، مولانا آزاد کا انقلابی تحریکات سے تعلق، مولانا آزاد اور پاکستان ، مسلمانوں کے دینی ، ثقافتی مسائل اور فرقہ وارانہ سیاست ، مولانا کے کریکٹر کی دو خوبیاں، مولانا کا اخلاق، آزادی کے بعد مولانا آزاد کی عظیم الشان خدمات، دائرۃ المعارف ، رضا لائبریری رام پور ، خدابخش لائبریری پٹنہ ، جامعہ ملیہ دہلی اور دیگر ادارے، عظیم ترین کارنامہ ترجمان القرآن، مولانا کا شاہکار تفسیر سورۃ فاتحہ ، چند تاریخی تحقیقات (ذوالقرنین کی شخصیت ، سورۃ کہف کا ایک مقام اور اس کی تحقیق) ترجمان القرآن تیسری جلد کا حادثہ، انسانی عظمت اور مخالفت کی کسوٹی ۔ ایک نکتہ حکمت، حرف آخر۔

ایک بے مثال خطبہ:

مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں کہ:

''جب تحریک خلافت شروع ہوئی تو مولانا نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس مسئلہ پر مولانا کی ملک کے مشہور شہروں میں سے اکثر میں نہایت زور دار اور ولولہ انگیز تقریریں ہوئیں۔ جو صرف خطابت ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ علمی اعتبار سے بھی معرکے کی تقاریر تھیں۔ آگرہ یعنی اکبر آباد میں خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ عام میں مولانا نے مسئلہ خلافت کے موضوع پر نہایت خطیبانہ اور عالمانہ تقریر کی۔ میں خود اس جلسہ میں نہیں تھا۔ لیکن مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم اور مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نیز دوسرے لوگوں سے جو اس جلسہ میں موجود تھے، میں نے سنا کہ مسئلہ خلافت جواب کتابی شکل میں طبع شدہ موجود ہے، یہ پورا خطبہ مولانا آزاد نے زبانی دیا تھا۔ اس میں بہ کثرت حوالہ جات تھے جو بالکل صحیح تھے جس سے مولانا آزاد کی ذہانت اور ان کے حافظہ کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے، ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس کتاب میں بعد میں بھی مولانا نے کوئی اضافہ اور ترمیم نہیں کی۔ بلکہ یہ کتاب جوں کی توں مولانا کی زبانی تقریر پر مشتمل ہے۔ مولانا آزاد نے اس نوع کی جگہ جگہ تقریریں کیں۔ اور لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ مولانا کا دماغ تو پورا ایک کتب خانہ معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ شاید ہی مولانا کی کوئی تقریر ایسی ہوتی ہو جس میں مولانا سلف کی کسی نہ کسی معروف علمی شخصیت کی تحریروں کا باقاعدہ حوالہ نہ دیتے ہوں۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ مولانا کا حافظہ اور ان کا مطالعہ کس قدر مضبوط اور وسیع تھا۔ (صفحہ ۴۳)

حرف آخر:

مولانا ابوالکلام آزاد ہماری ملت اسلامیہ کے بڑے قابل قدر اور نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی جو خدمات انجام دیں وہ پورے عالم اسلام کے لیے بھی قابل قدر ہیں۔ (صفحہ ۶۵)

مولانا آزاد کی وفات پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے ''برہان'' میں اپنے جو تاثرات قلمبند کیے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ لکھتے ہیں:

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سربگر بیاں کہ اسے کیا کہیے

عام پیرایہ میں لوگ کہتے ہیں کہ مولانا علوم جدیدہ کے مبصر تھے۔ سحر طراز انشاء پرداز، بلند پایہ ادیب، جادو بیان خطیب تھے۔ فہم و تدبر، ذہانت و فطانت، ان کے اوصاف و کمالات طبعی کا تکملہ زرّیں تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب عنوانات مولانا کی اصل شخصیت کی ترجمانی اور عکاسی سے قاصر ہیں۔ وہ بذات خود ایک تاریخ تھے اور تاریخ ساز بھی، وہ مستقل ایک عہد تھے اور عہد آفرین بھی۔ انہوں نے اپنے دماغ اور زبان و قلم سے ایک عہد پیدا کیا۔ جس کی ہمہ گیری اور وسعت کا یہ عالم تھا کہ اس سے مذہب بھی متاثر ہوا اور ادب بھی، سیاست بھی اُس سے اثر پذیر ہوئی، اور تہذیب و ثقافت بھی، ان کا قلم ابر بہاراں بھی تھا اور برق شرر فشاں بھی، علم و حکمت اور شعر و ادب کے میدان کی طرف نکل گیا تو فروغ نظر اور ایمان و یقین کے لالہ و گل کو پیغام نشو و نما دیتا گیا۔ اور چٹیل میدانوں کو گل و گلزار بنا گیا۔ اگر اس نے مذہب و سیاست کی طرف رُخ کیا تو فکر و نظر اور احساس و شعور کی دنیا میں طوفان برپا کر دیا۔ جو گوشہ نشین تھے وہ اس کی آواز سن کر گھروں سے نکل پڑے، جن پر غلامی کی غفلت و مدہوشی کا تسلط تھا، وہ جوش و ولولہ عمل سے سرشار ہو کر زندگی کا ایک نیا خون اپنی رگوں میں دوڑتا ہوا محسوس کرنے لگے۔ وہ ہر دم اور ہر محفل میں پہنچا؛ اور ہر جگہ صدر انجمن اور میر محفل ہو کر رہا، مذہب، سیاست، اور ادب، تہذیب اور معاشرت ان میں کوئی منزل ایسی نہیں ہے جس کی طرف اس نے رخ نہ کیا ہو اور اس میں اپنے اجتہاد و تحقیق، سنجیدہ فکر، اور نظر بلند کے لازوال نقوش نہ چھوڑ گیا ہو۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ مولانا اکابر و زعمائے امت کی پرانی نسل کی آخری یادگار تھے۔ اس لیے مولانا کی وفات ایک شخص اور ایک بڑے آدمی کی موت نہیں، بلکہ پورے ایک عہد، ایک دور، ایک قرن کی موت ہے۔ مسلمانان ہند کی تاریخ عہد حاضر کا ایک باب ختم ہو گیا۔ بس سدا رہے نام اللہ کا، کلی شئی ھالك الا وجھه۔ اس دنیا کی ریت یہی ہے۔ جو آیا ہے، اس کو جانا ضرور ہے۔ رحمه اللہ رحمة واسعة۔

(ماہنامہ برہان دہلی، مارچ ۱۹۵۸ء)

حبیب الرحمٰن خاں شروانی:

مولانا نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی ریاست بھیکم پور کے نواب محمد تقی خاں کے صاحبزادے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت بڑے اچھے ماحول میں ہوئی۔ ان کے والد نے ان کے نام پر حبیب گنج نامی ایک دیہات آباد کیا۔ اس کے اندر دلکش باغات، عالیشان مکان بنوائے، نواب محمد تقی خاں نے ۱۹۰۵ء میں وفات پائی تو ان کے بعد ریاست کا نظم ونسق ان کے بھائی نواب عبدالشکور خاں نے سنبھالا۔ نواب عبدالشکور خاں نے ۱۹۰۷ء میں سفر حج سے واپسی کے بعد جدہ میں انتقال کیا۔ اب ریاست کے انتظام کی ذمہ داری نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کندھوں پر آن پڑی۔ جنھوں نے یہ ذمہ داری اپنی خداداد فراست اور دوراندیشی سے ایسی عمدگی سے نبھائی کہ اس میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی تعلیم و تربیت جس نہج پر ہوئی تھی اس لیے بہت جلد ملک کے علمی حلقوں میں متعارف ہو گئے۔ انہوں نے زر کثیر صرف کر کے حبیب گنج میں ایسا نادر اور قیمتی کتاب خانہ منظّم کیا کہ اس کی شہرت ملک سے باہر اسلامی ممالک میں پہنچی۔

ان کے علم و فضل کو دیکھتے ہوئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انتظامیہ نے انہیں شعبہ دینیات کا صدر مقرر کیا۔ اور یہیں سے ان کی شہرت سارے ہندوستان میں ہوگئی۔ جب ان کے علم و فضل کی شہرت نظام دکن آصف جاہ ہفتم میر عثمان علی خاں نے سنی تو انہیں حیدر آباد طلب کیا۔ اور انہیں اپنی ریاست کے مذہبی امور کا صدر الصدور بنا دیا۔

۲۱ /اگست ۱۹۱۹ء کو عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور اسی سال اعلیٰ حضرت نظام دکن نے ''صدر یار جنگ'' کا خطاب عطا کیا۔ حیدر آباد میں ان کا قیام اپریل ۱۹۳۰ء تک رہا۔

علم و فضل کے اعتبار سے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جامع الکمالات تھے۔ اور اس کے ساتھ بہت بڑے ادیب، انشاء پرداز، نقاد، مبصر اور خطیب تھے۔ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی لکھتے ہیں کہ:

''زبان فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے۔ بڑے ماہر فارسی اور اُردو کے شاعروں

کے کلام اور ان کے ادب پر تنقید کرنے والے تھے۔ اور ایسے تاریخ دان تھے جن کی اطلاع وسیع تھی۔ اور مطالعہ بہت زیادہ تھا۔ اور لوگوں میں آگے بڑھ جانے والے مولف تھے۔ ان کی تحریروں میں مقبولیت کے آثار پائے جاتے ہیں۔'' (نزہۃ الخواطر ۱۰۴/۸)

مالک رام ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

مرحوم شاعر اور مصنف بھی تھے۔ حسرت تخلص تھا۔ اُردو میں منشی امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ فارسی کا کلام آغا سنجر ایرانی کو دکھاتے تھے۔ کچھ مشورہ خواجہ عزیز لکھنوی اور مولانا شبلی سے بھی رہا۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں دیوان مطبوعہ موجود ہیں۔ اُردو میں ''کاروان حسرت'' اور فارسی میں ''بوستان حسرت'' ان کی یادگار ہیں۔''

(غبارِ خاطر مطبوعہ دہلی ص ۱۲)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں علمائے سلف اور نابینا علماء، سیرۃ الصدیق، تذکرہ بابر، حالات حزیں ان کی مشہور تصانیف ہیں، اور ان کے علمی و ادبی، تنقیدی، تاریخی مقالات جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ ''مقالاتِ شروانی'' کے نام سے مطبوع ہیں۔ ان کا مشہور تنقیدی مقالہ ''تاریخ بغداد'' پر ہے جو معارف اعظم گڑھ کے کئی نمبروں میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ ۱۹۳۷ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

اگست ۱۹۰۴ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کا اجراء عمل میں آیا۔ تو اس کے دو ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ایک مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جو علی گڑھ میں تھے۔ اور دوسرے مولانا شبلی جن کا قیام ان دنوں حیدر آباد میں تھا۔

(حیات شبلی ص ۴۴۰)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے ۱۱، اگست ۱۹۵۰ء مطابق ذی قعدہ ۱۳۷۰ھ کو علی گڑھ میں ۸۶ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے ان کی وفات پر تفصیل سے لکھا ہے، ایک اقتباس ملاحظہ

فرمائیں:

''مرحوم کوملت اسلامیہ سے بڑی محبت تھی ۔اس کے اچھے واقعات اور مسرت بخش تذکروں سے خوش ہوتے تھے ۔اوراس کے نفاق واختلاف کی باتوں سے ہمیشہ کنارہ کش رہتے ......مرحوم اپنے دور کے خاتم تھے،اب اس جوہر شرافت کانمونہ کبھی دیکھنے میں نہ آئے گا۔''

(یادرفتگان ص ۴۱۹)

مولانا محمد حنیف ندوی جو اس وقت ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور کے ایڈیٹر تھے ۔ مولانا شروانی کی وفات پر تعزیتی شذرہ لکھا:

''مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے لازوال خطوط میں جن کو''صدیق مکرم'' سے یاد فرمایا ہے افسوس ہے ان کا انتقال ہوگیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون ۔مرحوم میں بڑی خوبیاں تھیں ۔ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے ایک اجلاس میں ان سے تعارف ہوا۔وضع داری اوراخلاص وسنجیدگی کا پیکر تھے ۔تاریخ اسلامی پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے ۔اور دین سے ان کا جو لگاؤ تھا وہ توبالکل والہانہ قسم کا تھا،یعنی اس میں عقیدت کی کوئی آلودگی نہ تھی،ان کا کتب خانہ نوادر کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، بڑے بڑے اہل علم کو تصنیفات کے سلسلے میں ان کے کتب خانے سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔''

(الاعتصام لاہور ۲۵،اگست ۱۹۵۰ء)

مولانا ابوالکلام آزاد اکتوبر ۱۹۰۵ء تا مارچ ۱۹۰۶ء ''الندوہ'' کے سب ایڈیٹر رہے اور اس دوران مولانا کی پہلی ملاقات لکھنو میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے ہوئی ۔اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا،ان تعلقات میں خلوص اور پختگی اور ایک دوسرے کی مقام شناسی کا جذبہ پیدا ہوتا گیا۔

مولانا آزاد نے غبارِ خاطر میں جو مکاتیب لکھے ہیں وہ سب کے سب مولانا شروانی کے نام ہیں۔اور مولانا نے اپنے خطوط میں ان کو''صدیق مکرم'' کے نام سے یاد فرمایا ہے۔

مولانا آزاد کو ان سے بہت زیادہ تعلق خاطر تھا۔ اور دونوں ایک دوسرے کے علم و فضل کے معترف تھے۔

مالک رام:

مالک رام کا تعلق ایک ہندو گھرانے سے تھا۔ پھالیہ ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ عصری تعلیم بی اے تھی۔ لیکن ابتدا ہی سے انہیں مذہب اسلام سے دلچسپی پیدا ہوئی اور انہوں نے بیشتر اسلامی کتب کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ عصری تعلیم مکمل ہونے پر فارن سروس حکومت ہند میں ملازم ہو گئے۔ اور ان کی ملازمت کا کافی عرصہ مصر میں گزرا۔ عربی، فارسی، پر بھی انہیں کافی عبور تھا۔ تہذیب اسلام کے متعلق کئی کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ قرآن مجید اور حدیث نبوی ﷺ پر بھی ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ آخر عمر میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ اور ان کا انتقال دین اسلام پر ہوا۔

مالک رام مولانا ابوالکلام آزاد کے عقیدت مندوں اور نیاز مندوں میں سے تھے۔ اور ان کا تعلق مولانا آزاد سے بہت رہا۔ مولانا آزاد سے تعلقات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> ''میں ۱۹۲۶ء میں لاہور آ گیا۔ یہاں میں نے بی اے میں داخلہ لے لیا۔ ''الہلال'' جاری ہوا تو میں نے ''الہلال'' کے پہلے شمارے ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۴ء)، ''البلاغ'' (۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۶ء) مطلوبہ رقم بھیج کر کلکتہ سے منگوا لیے۔ اور جون ۱۹۱۷ء میں تیسری بار ''الہلال'' جاری ہوا۔ مگر صرف ۶ ماہ جاری رہ سکا۔ اس دور کے شمارے میرے پاس موجود تھے، اور یوں میں نے ''الہلال'' کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔''

۱۹۳۱ء میں لاء کالج لاہور میں طالب علم تھا کہ اواخر ۱۹۳۱ء میں ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ میں نے اس کا مطالعہ کیا تو ترجمان القرآن کی دلنشیں تحریر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے قرآن مجید کے کم و بیش دس ترجمے دیکھے ہوں گے لیکن جو لطف ترجمان القرآن کے سادہ ترجمے میں آیا، وہ اور کہیں نہیں ملا۔

سورۃ فاتحہ کی تفسیر ایسی برجستہ اور مدلل و مفصل اور علوم جدیدہ پر حاوی ہے کہ باید و

شاید۔ سورۃ فاتحہ ام الکتاب کہلاتی ہے اور اس میں پورے قرآن مجید اور اسلام کی روح آگئی ہے۔

مولانا آزاد سے مالک رام کی پہلی ملاقات ۱۹۳۹ء میں کلکتہ میں ہوئی۔ جہاں وہ مصر جانے سے پہلے تین ماہ کی ٹریننگ کے سلسلہ میں گئے تھے۔ مالک رام کلکتہ میں اپریل، مئی، جون قیام پذیر رہے۔ ان تین ماہ کے دوران تقریباً ہر اتوار کو مولانا آزاد سے ملاقات کے لیے ان کی رہائش گاہ پر جاتے۔

مالک رام ان تین ماہ کی ملاقاتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں نے تین مہینوں میں کوئی اتوار ناغہ نہیں کیا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ مجھے اتوار کا انتظار رہنے لگا۔ ان ہفتہ واری ملاقاتوں میں مذہب، ادب، سیاست، غرض دنیا بھر کے گونا گوں موضوعات پر ان سے خوب خوب باتیں ہوئیں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس سے مجھے کتنا فائدہ ہوا۔ میں نے اپنی بساط بھر بہت پڑھا تھا۔ اُردو اور فارسی میں بہت کچھ میری نظر سے گزر چکا تھا۔ اور عربی میں بھی کچھ شد بد حاصل تھی۔ لیکن ان کے مطالعے کی وسعت اور بوقلمونی اور استحضار اور گل افشانی گفتار کا صحیح اندازہ اس وقت تک محال تھا۔ جب تک کوئی شخص ان کے پاس نہ بیٹھے۔ اور کسی موضوع پر ان سے گفتگو نہ کرے۔''

مالک رام لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد نے مجھے فرمایا، آپ مصر جا رہے ہیں۔ وہاں عربی سیکھیے اور اس کی تکمیل کیجیے۔ اس زبان میں بے انتہا قیمتی سرمایہ علم و ادب ہے اور اس کے ساتھ تین کتابوں (ادب الکاتب ابن قتیبہ، فقہ اللغۃ ثعالبی، اور کلیلہ ودمنہ کے مطالعہ کی تاکید کی۔

مالک رام ۲۲، جولائی ۱۹۳۹ء کو بمبئی سے بحری جہاز کے ذریعہ مصر کے لیے روانہ ہوئے۔ اور یکم اگست کو اسکندریہ پہنچے۔ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ مالک رام تین سال کے لیے مصر گئے تھے۔ لیکن جنگ کی وجہ سے انہیں سات سال تک مصر میں رہنا پڑا اور دسمبر ۱۹۴۶ء میں تین ماہ کی رخصت پر واپس ہندوستان آئے، ہفتہ بھر اپنے

گاؤں (پھالیہ) میں رہ کر ۱۹۴۷ء کے اوائل میں دہلی تشریف لے گئے۔

"مولانا ابوالکلام آزاد مرکزی حکومت میں وزیر تعلیم تھے۔ مالک رام لکھتے ہیں کہ:

"میں ملاقات کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مصافحہ کیا اور کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ دیر تک مصر، وہاں کی تعلیم، زبان، طریقہ تعلیم وغیرہ کے متعلق گفتگو رہی۔"

اس کے بعد مارچ ۱۹۴۷ء میں مالک رام مصر چلے گئے۔ اور ۱۹۵۲ء میں واپس ہندوستان آئے۔ اس اثناء کا اہم واقعہ یہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم ہو چکی تھی۔ اور پاکستان معرض وجود میں آچکا تھا۔ مالک رام جب ریٹائر ہو کر واپس ہندوستان تشریف لائے تو جب دہلی آتے مولانا سے کبھی کبھی ملنے کا اتفاق ہو جاتا تھا۔ مولانا سے ان کی آخری ملاقات ۷فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں ہوئی۔ اور پندرہ دن بعد ۲۲، فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا آزاد نے اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔

مالک رام بڑے اچھے ادیب، دانشور، سلجھے ہوئے مضمون نگار تھے اور انہوں نے مولانا آزاد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کئی ایک مضامین ومقالات لکھے ہیں۔ مالک رام بقول ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، مولانا ابوالکلام کے معتقد نہیں بلکہ ان کے محقق ہیں۔

مالک رام نے مولانا آزاد کی چار تصانیف پر حواشی تحریر کیے ہیں۔ اور یہ ان کا بہت بڑا علمی وتحقیقی کارنامہ ہے اور وہ کتابیں یہ ہیں:

(۱) ترجمان القرآن (۲) تذکرہ (۳) خطبات آزاد (۴) غبار خاطر۔

ترجمان القرآن:

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری لکھتے ہیں کہ:

"مولانا آزاد کے اشارات کی رہنمائی میں تحقیق و تدوین کے جدید اور سائنٹیفک اصول و معیار کے مطابق نئے دستیاب شدہ مواد اور حواشی کے اضافوں کے ساتھ ترتیب جدید کے مطابق چار جلدوں میں۔ یہ مولانا کی تصانیف کا پہلا حصہ ہے۔ لیکن اس کی ترتیب و تدوین میں جناب مالک رام کا

تعلق نہیں رہا۔''

تذکرہ:

تذکرہ مولانا آزاد کی مشہور تصنیف ہے۔اس کے بارے میں آپ باب نمبر دس (۱۰) میں تفصیل سے پڑھ آئے ہیں۔ جناب مالک رام نے تذکرہ کی تدوین کا کارنامہ انجام دے کر ایک عظیم علمی خدمت انجام دی ہے۔کتاب کے آخر میں مالک رام نے اعلام، بلاد و اماکن، کتب و رسائل، آیات قرآنی و احادیث نبوی واردہ متن کی فہرستیں بھی شامل کی ہیں اور ایک طویل فہرست ان عربی، فارسی، اُردو کتب و رسائل کی دی ہے جن سے حواشی کی تیاری میں مدد لی گئی ہے۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری لکھتے ہیں:

''جناب مالک رام نے اس ایڈیشن پر پیش لفظ تحریر فرمایا ہے۔جس میں تذکرہ کی تصنیف کی تاریخ، اس کے اسلوب نگارش کی دلآویزیوں، اس کے ادبی خصائص، علمی حیثیت، اس ایڈیشن کی تیاری کے اہتمام اور اس کی املائی خصوصیات پر بحث کی ہے۔اور مرزا فضل الدین احمد کے مقدمہ سے پیدا ہونے والی علامہ اقبال کے بارے میں غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کی مثنویاں اسرار خودی اور رموز بے خودی دراصل الہلال کی صدائے بازگشت ہیں۔''

آخر میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ:

''تذکرہ کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نام کے ساتھ جناب مالک رام کا نام بھی زندہ رہے گا۔

خطبات آزاد:

مولانا ابوالکلام آزاد بلند پایہ ادیب، صحافی، انشاء پرداز، خطیب و مقرر تھے۔ان کے خطبات اور تقریریں ان کے زور بیان اور شعلہ نوائی کی آئینہ دار ہیں۔مولانا آزاد کے خطبات اور تقاریر کے مجموعے کئی ناشروں نے ہندوستان اور پاکستان میں شائع کیے ہیں۔لیکن مالک

رام نے مولانا کے جو خطبات شائع کیے ہیں اس میں ۱۵ خطبات وتقریریں ہیں۔ اس میں مالک رام نے حواشی، فہارس، آیات قرآنی، احادیث نبوی، اعلام، بلاد واماکن، کتب و رسائل اور مآخذ وحواشی ترتیب دیے ہیں۔

مالک رام نے خطبات آزاد کے شروع میں ایک مقدمہ تحریر کیا ہے۔ اس مقدمہ کے کچھ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:

> ''مولانا ابوالکلام آزاد کو قدرت کی طرف سے وہ تمام صفات اور صلاحیتیں وافر مقدار میں ملی تھیں جو کامیاب خطیب بننے کے لیے درکار ہیں۔ عالی نسبی ایسی کہ صدیوں سے ان کا خاندان زُہد وورع اور رُشد وہدایت کا مرکز رہا تھا۔ ان کے والد مولانا خیر الدین ''مشائخ'' کے حلقوں میں معروف اور ممتاز تھے۔ مولانا آزاد خود ذاتی وجاہت اور مردانہ حسن کا نمونہ تھے۔ ان کے علم وفضل اور عربی و فارسی پر قدرت کے سب معترف ہیں۔ طلاقت زبان اور قوت بیان کے ساتھ انہیں بے مثال حافظے کی نعمت بھی حاصل تھی اور یہی چیزیں کامیاب اور موثر خطاب کے اجزائے ترکیبی ہیں۔''

مولانا کے خطبات اور نمائندہ تقریروں سے ان کے مطالعے اور نظر کی وسعت، اپنے مفہوم کو موزوں ترین الفاظ میں بیان کرنے کی قدرت، مفکرانہ طریقہ استدلال اور اپنے موقف کی صداقت اور صحت پر اعتمادِ کامل سطر سطر سے ظاہر ہوتا ہے۔

غبارِ خاطر:

غبار خاطر مولانا آزاد کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو آپ نے قلعہ احمد نگر جیل سے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے۔ یہ کتاب مولانا آزاد کی بہترین علمی اور فنی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ جناب مالک رام نے اس پر جامع اور تحقیقی حواشی لکھے ہیں۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری لکھتے ہیں:

> ''جناب مالک رام نے غبار خاطر کے حواشی لکھے ہیں۔ نادر الوجود اشعار کی طرح جو مولانا نے اس میں استعمال کیے ہیں سیکڑوں اشخاص وکتب تھیں جن

کے وجود و کمال پر کوئی روشنی نہ پڑتی تھی۔ اور بے شمار منقولات تھے جن کی صحت کا یقین تھا لیکن عین الیقین نہ تھا۔ فاضل مرتب کی تحقیق نے ہمیں ان کے وجود و کمال سے آشنا کیا ہے۔ اور منقولات کی صحت کو عین الیقین کے مقام پر پہنچا دیا ہے۔''

کتاب کے آخر میں مالک رام نے اعلام کتب و رسائل، بلاد و اماکن وغیرہ کی فہارس مرتب کر دی ہیں اور کتاب کی ترتیب اور حواشی کی تدوین میں مختلف زبانوں میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان کی فہرست بھی شامل ہے۔

مالک رام کا یہ عظیم ادبی کارنامہ ہے۔ جو شخص غبار خاطر کا مطالعہ کرے گا وہ مرتب کے حسن ذوق اور کمال سعی کی داد ضرور دے گا۔ مالک رام نے مولانا آزاد کی شخصیت اور خدمات کے تقریباً سبھی پہلوؤں پر قلم اُٹھایا ہے۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری مالک رام کے مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق مقالات و مضامین کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''جناب مالک رام نے مولانا آزاد کی شخصیت، سیرت، زبان، ادب، اور صحافت کے مختلف میدانوں میں مولانا کی خدمات کے تعارف اور مولانا کی ابتدائی تالیف و تحقیق کے بارے میں جو مقالات تحریر کیے ہیں۔ یہ مقالات نہ صرف ابوالکلام سے متعلق لٹریچر میں بہترین علمی و تحقیقی مواد کے لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں بلکہ یہ جناب مالک رام کے اسلوب کی دلربائی کے نقطہ نظر سے بھی اُردو ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔ جن کے مطالعے سے علم و ادب کے شائقین اور اصحاب ذوق لطف اندوز ہوں گے۔''

نوٹ! جناب مالک رام سے متعلق مضمون کے سلسلہ میں مالک رام کے ایک اپنے مضمون مندرجہ کتاب ''کچھ ابوالکلام کے بارے میں'' مطبوعہ مکتبہ قدوسیہ لاہور طبع ۱۹۹۲ء اور ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری کے مضمون ''مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک محقق۔ مالک رام سے استفادہ کیا گیا ہے۔ (عراقی)

مولانا غلام رسول مہر:

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری لکھتے ہیں کہ:

مولانا غلام رسول مہر کا نام زبان پر آتا ہے، تو فضائل علم وفکر اور محاسن سیرت کا ایک پُرنشاط باغ ذہن میں آراستہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس عہد کی ایک نادرۂ روزگار شخصیت تھے۔ اور علم ونظر میں، فکر وبصیرت میں، وسعت مطالعہ میں، نیز تاریخ، مذہب اور صحافت کے ذوق کی بنا پر پاکستان اور ہندوستان میں اگر کوئی شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کی جانشینی کی اہل ہو سکتی تھی تو وہ مولانا مہر مرحوم کی شخصیت تھی۔

(مولانا ابوالکلام آزاد، از مولانا مہر ص ۱۱۵)

مولانا غلام رسول مہر ۱۸۹۵ء میں ضلع جالندھر کے ایک گاؤں پھول پور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کا امتحان مشن ہائی سکول جالندھر سے پاس کیا۔ اور ۱۹۱۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کی سند لی۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں علم وادب کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور کالج کے زمانہ (۱۹۱۳ء) میں مولانا ابوالکلام آزاد سے متعارف ہو چکے تھے اور ۱۹۱۴ء میں مولانا آزاد کے سفر لاہور کے موقع پر ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور اس وقت سے سلسلہ مراسلت قائم ہو گیا تھا۔

۱۹۱۳ء میں مولانا آزاد نے ''حزب اللہ'' کے نام سے ایک جماعت کی تشکیل کی تھی جس کا مقصد مسلمانوں کو اسلام کی خدمت کرنے کے لیے تیار کرنا تھا۔ مولانا مہر اس کے رکن بن گئے۔ ۱۹۱۵ء کے آواخر میں جب مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' کی بندش کے بعد ''البلاغ'' جاری کیا تو اس کے ساتھ کلکتہ میں حزب اللہ کے اراکین کی تعلیم وتربیت کے لیے ''دارالارشاد'' قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ تو مولانا مہر نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کچھ دن مولانا کی خدمت میں گزاریں گے۔ لیکن ''دارالارشاد'' کو قائم ہوئے ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ حکومت بنگال نے ۳، مارچ ۱۹۱۶ء کو حدود بنگال سے نکل جانے کا حکم صادر کر دیا۔ چنانچہ مولانا رانچی (بہار) چلے گئے۔ یہاں بعد میں مرکزی حکومت نے انھیں چار سال کے لیے نظر بند کر دیا۔

مولانا مہر بی۔اے کی سند حاصل کرنے کے بعد حیدر آباد دکن چلے گئے اور وہاں ان کی تقرری بحیثیت انسپکٹر مدارس ہوگئی اور ۱۹۲۰ء تک آپ حیدر آباد میں قیام پذیر رہے۔اس کے بعد ملازمت سے استعفیٰ دے کر لاہور آگئے۔مولانا مہر کی ابتداء ہی سے یہ خواہش تھی کہ وہ صحافت کا پیشہ اختیار کریں گے۔ اور اس سلسلہ میں کچھ عرصہ مولانا آزاد کی خدمت میں گزاریں گے۔لیکن مولانا کے نظر بند ہوجانے کی وجہ سے وہ اپنی خواہش کی تکمیل نہ کر سکے۔

مولانا مہر جب لاہور تشریف لائے تو اس وقت ''زمیندار'' اخبار لاہور کا مشہور روزنامہ تھا۔اور سارے ہندوستان میں اس کی شہرت تھی۔مولانا ظفر علی خاں اس کے ایڈیٹر و مالک تھے۔ جو اس وقت جیل میں تھے۔اور مولانا عبدالمجید سالک جو ''زمیندار'' کے مدیر معاون تھے، وہ بھی مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ اسیر زنداں ہو گئے تھے۔زمیندار کے منیجر شفاعت اللہ خاں سے مولانا مہر کے دوستانہ تعلقات تھے۔وہ مولانا مہر کو زمیندار میں لے آئے۔اب زمیندار کے ایڈیٹر مولانا مہر مقرر ہوئے۔(نومبر ۱۹۲۱ء)

کچھ مدت بعد مولانا عبدالمجید سالک رہا کر دیے گئے۔اور اب زمیندار دونوں (مہر و سالک) کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔اور ترقی کے منازل طے کرنے لگا۔رفتہ رفتہ مہر و سالک کے تعلقات مولانا ظفر علی خاں اور ان کے صاحبزادے اختر علی خاں سے بگڑ گئے۔ اور مولانا مہر و سالک دونوں مارچ ۱۹۲۷ء میں ''زمیندار'' سے علیحدہ ہوگئے۔اور انہوں نے ۴ اپریل ۱۹۲۷ء کو اپنا اخبار روزنامہ ''انقلاب'' جاری کیا۔مولانا ظفر علی خاں نے ''انقلاب'' سے متعلق ایک شعر کہا ہے:

مہر و سالک کا انقلاب دیکھ
انقلابات ہیں زمانے کے

''انقلاب'' نے اُردو صحافت میں نمایاں خدمات انجام دیں لیکن پاکستان بن جانے کے بعد حکومت سے اختلاف پیدا ہوگئے تو مہر و سالک نے اخبار بند کر دیا۔اس کا آخری شمارہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۴۹ء کو شائع ہوا۔

اس کے بعد مولانا مہر نے اپنے آپ کو علم و ادب کی خدمت اور تصنیف و تالیف

کے لیے وقف کر دیا۔ اُنہوں نے کم وبیش ایک صد پچاس (۱۵۰) کے قریب چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔ ان میں تاریخ، ادب، مذہب اور بعض عربی و انگریزی کتابوں کے تراجم شامل ہیں۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری مولانا مہر کی سیرت اور علم وفضل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

مولانا مہر مرحوم اپنے علم وفضل اور ذہنی و دماغی صلاحیتوں کے لحاظ سے اس عہد کی ایک نادرۂ روزگار شخصیت تھے۔ سیرت کے بے شمار محاسن سے متصف تھے اور علم وفضل کے مختلف میدانوں میں انہوں نے عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ تاریخ و مذہب اور سیاست کے موضوعات سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ ان کے علمی کام زیادہ تر انہیں میدانوں میں ہیں۔ وہ اُردو کے صاحب اسلوب ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ اُردو اور فارسی ادبیات پر انہیں یکساں عبور تھا۔ وہ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ ایک زمانے تک ملک کے مقتدر ادبی رسائل میں ان کا اُردو کلام اور فارسی کلام بہ کثرت چھپتا رہا تھا لیکن آخری دور میں اُنہوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا تھا۔

فارسی اور اُردو شاعری کا بہترین حصہ ان کے حافظے میں موجود تھا۔ عُرفی، نظیری، غالب کے تو وہ گویا حافظ تھے۔ معاصر شخصیات میں علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد سے وہ بہت متاثر اور ان کے معتقد تھے۔ غالب کے بعد اُنہوں نے ان دو شخصیات پر سب سے زیادہ لکھا ہے۔ ان دونوں شخصیات پر وہ بعض اور کام کرنے کے آرزومند تھے لیکن موت نے انہیں اس کی مہلت نہ دی۔

(مولانا ابوالکلام آزاد از مہر، ص ۱۹-۲۲)

مولانا مہر نے مسلم ٹاؤن لاہور میں اپنی کوٹھی بنا لی تھی اور ان کا سارا وقت تصنیف و تالیف میں گزرتا تھا۔ ہفتہ کے روز وہ کوئی کام نہ کرتے تھے۔ اور یہ دن دوستوں سے ملنے کے لیے تھا۔ وہ شہر آتے۔ اور جن جن دوستوں سے ملنا ہوتا ان سے ملاقات کرتے تھے۔ ان کے خاص دوستوں میں شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی بھی تھے۔ راقم قرشی صاحب کے

ہاں ان کے قومی دواخانہ میں ملازم تھا۔ مولانا مہر مرحوم ہفتہ کے روز تقریباً دس گیارہ بجے کے قریب دواخانہ بیڈن روڈ لاہور تشریف لاتے تھے اور آدھ پون گھنٹہ دواخانہ میں ٹھہرتے۔ کبھی کبھی دوائی بھی لے جاتے تھے۔ اور آدھ پون گھنٹہ میں قریشی صاحب سے مختلف موضوعات پر مختصراً گفتگو ہوتی تھی۔

مولانا ابو الکلام آزاد سے مولانا غلام رسول مہر ۱۹۱۳ء میں متعارف ہوئے تھے۔ ۱۹۵۸ء مولانا ابو الکلام آزاد کی وفات تک تعلقات کا سلسلہ استوار رہا۔ مولانا مہر حقیقی معنوں میں مولانا آزاد کے صحیح جانشین تھے۔ بقول ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری فارسی شعر وادب میں دونوں کی پسند ایک تھی۔ دونوں کو یکساں طور پر عرفی، نظیری اور غالب پسند تھے۔ صحافت دونوں کا میدان رہا تھا۔ اور سیاست میں درمیان کے ایک ہیجانی دور کو چھوڑ کر دونوں کا مسلک ایک ہی تھا۔ مذھبیات کے دائرے میں قرآن وسیرت کے دونوں شیدائی تھے۔ اور تمام علوم وفنون اسلامی میں مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے لیے قرآن وسیرت کے مطالعے کو سب پر ترجیح دیتے تھے۔ حضرت امام مالک، امام بخاری رحمہ اللہ، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ، امام ابن قیم رحمہ اللہ، احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور تاریخ پاکستان و ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، اور حضرت مجدد، شہید شاہ اسماعیل ابن شاہ عبدالغنی کے مداح تھے۔ مولانا آزاد اور مولانا مہر دونوں مذہبی افکار کے ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

(مولانا ابو الکلام آزاد، از مہر ص ۱۵)

مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا مہر کے تعلقات اور ان دونوں کے اسلوب نگارش پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ:

''مہر صاحب کا انداز بیان بڑا پختہ ہے۔ اور وہ مولانا ابو الکلام کے مکتب نگارش کے بڑے کامیاب شاگردوں میں ہیں۔ بلکہ لفظ شاگرد لانا ان کے مرتبہ اُستادی کو مجروح کرتا ہے، وہ اپنا ایک مستقل اسلوب بیان رکھتے ہیں۔ اور فارسی اشعار کے برمحل تصرف میں تو کہنا چاہیے کہ خود مولانا ابو الکلام آزاد کی ٹکر کے ہیں۔ کتابیں تاریخی اعتبار سے جیسی بھی ہوں بہر حال ادب وانشاء

کے پہلو سے اپنا ایک خاص وزن اور مستقل مقام رکھتی ہیں۔"

(اُردو کا ادیب اعظم، ص ۹۶)

مولانا مہر مولانا ابو الکلام سے بیعت تھے۔ (۱۹۲۳ء) اور علم و فضل میں ان کے جانشین تھے۔ مولانا آزاد کے حالات زندگی، ان کے افکار و خیالات، اور ان کی دینی، علمی، قومی و ملی اور سیاسی خدمات پر بلند پایہ مقالات تحریر فرماتے اور اس کے ساتھ مولانا مہر نے یہ بھی خدمت انجام دی کہ جب کسی حلقے کی طرف سے مولانا آزاد پر بے جا تنقید کی گئی تو انہوں نے مولانا آزاد کے دفاع اور حقائق کے انکشاف کے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی۔ مولانا مہر کو مولانا آزاد سے بہت زیادہ محبت اور عقیدت تھی۔ اور مولانا سے محبت اَلْحُبُّ لِلّٰہِ کی مثال تھی، اور اسی محبت کی بدولت وہ مولانا ابو الکلام آزاد کے محبوب و ممدوح بن گئے تھے۔

مولانا مہر نے مولانا ابو الکلام آزاد کے آثار کی ترتیب، علوم و معارف کی تدوین، افکار آزاد کی ترجمانی، سوانح اور سیرت و خدمات کے تعارف میں جو علمی کام انجام دیے ان کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے:

نقش آزاد:

یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔

حصہ اول میں (صفحہ ایک سے ۵۶ تک) مہر صاحب کے نام خطوط ہیں۔ ان خطوط کی تعداد ۱۸۱ ہے۔ جن میں سے ۴۲ خطوط مولانا کے قلم سے ہیں۔ دو ان کی طرف تار ہیں اور باقی ۵۰ خطوط ان کے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خاں اور ۳ خطوط پرسنل سیکرٹری مسٹر ایم این مسعود کے قلم سے ہیں۔

دوسرے حصے میں مولانا آزاد کی وہ تحریریں ہیں جو انہوں نے مولانا مہر کی تالیف "غالب" کے سلسلے میں تحریر فرمائی تھیں۔

تیسرا حصہ ۱۴ خطوط، ایک پیام اور ایک اپیل پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط مولانا مہر کے نام

نہیں ہیں لیکن اس مجموعے میں محفوظ کردینا ضروری سمجھا گیا۔

شورش کاشمیری نقش آزاد کے خطوط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''نقش آزاد کے بعض خطوط آج کے حالات میں الہامی معلوم ہوتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مکتوب الیہ مہر تھے۔جن کا سیاسی راستہ روزنامہ انقلاب کی آخری ہچکی تک مولانا سے مختلف رہا۔ان مکاتیب میں بیشتر فقرے اس انداز کے ہیں کہ مہر صاحب اس سلسلہ میں راقم سے گفتگو کرتے وقت اشکبار ہوجاتے اور فرماتے کہ ان خطوط کو اب پڑھتا ہوں تو ہوک اُٹھتی ہے۔انقلاب کا سیاسی سفر مخصوص و مختلف تھا۔تب ہماری نگاہیں مستقبل سے ہٹی ہوئی تھیں، ہم ان فقروں کو الفاظ کی دلفریبی سمجھتے۔لیکن آج اندازہ ہوتا ہے کہ ان چند کلمات میں مستقبل کا حقیقی تجزیہ اپنے واضح نتائج کے ساتھ موجود تھا۔''

(ابوالکلام آزاد از شورش کاشمیری، ص ۳۶۴)

تبرکات آزاد:

اس کتاب میں ۹۸ مکاتیب و مقالات ہیں اور ابتداء میں ۶ صفحات کا دیباچہ ہے۔ بہ قول مولانا مہر خطوط کا یہ مجموعہ دینی و علمی اور تعلیمی واخلاقی مسائل سے متعلق مجتہدانہ بصیرت وموعظت کا ایک بہترین مرقع ہے۔

شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

''تبرکات آزاد میں درج مضامین کے مطالعہ سے مولانا کی ژرف نگاہی اور دقیقہ رَسی کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شخص نے اپنے فکر و عمل کے لیے پہلے دن جو راہ ٹھہرائی وہ اپنی رحلت تک اس پر قائم رہا۔اور نصف صدی کی گردش نے وہی نتائج پیدا کیے جو اس نے آغازِ سفر میں بیان کیے تھے۔''

(ابوالکلام آزاد ص ۳۶۵)

باقیات ترجمان القرآن:

مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کے دو جلدیں شائع ہوئیں جو سورۃ المومنون

تک ہیں۔ تیسری جلد مولانا لکھ نہ سکے۔ اس بارے میں اہل علم وقلم میں اختلاف چلا آ رہا ہے کہ مولانا نے تیسری جلد لکھی تھی یا نہیں لکھی تھی۔ اگر لکھی گئی تھی تو اس کا مسودہ کہاں غائب ہو گیا۔

مولانا غلام رسول مہر نے یہ عظیم کارنامہ انجام دیا کہ ترجمان القرآن کی دونوں جلدوں میں بعد کے پاروں کی آیات وسور کا جہاں کہیں ترجمہ وتشریح فرمائی تھی۔ ان سب کو نہایت احتیاط وصحت کے ساتھ مرتب کیا۔ اور ترجمان القرآن کے علاوہ الہلال اور البلاغ سے ان آیات وسور کو جمع کیا۔ اور اس کو باقیات ترجمان القرآن کے نام سے شائع کر دیا۔ شروع میں مولانا ابوالکلام کی خدمات قرآنی اور خصائص ترجمان القرآن پر ایک جامع مقدمہ تحریر فرمایا ہے:

''ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی باقیات ترجمان القرآن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک یہ مہر صاحب کی مولانا آزاد کے سلسلے میں ایسی خدمت تھی جیسی خدمت کسی اور نے انجام نہیں دی۔''

(نقوش ابوالکلام آزاد ص ۳۰)

رسول رحمت ﷺ:

مولانا آزاد نے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر مختلف اوقات میں بہت سے مقالے تحریر فرمائے تھے۔ مولانا مہر نے بڑی محنت سے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' سے یہ مقالے اکٹھے کر کے شائع کر دیے۔ اور بعض مقالوں پر بعض ضروری حواشی لکھے۔ اور بعض تمہیدی عبارتیں تحریر کیں۔

شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

مولانا نے رحمۃ للعالمین کے معانی ومطالب جس بلاغت سے بیان کیے ہیں؛ اس سے پہلے رحمۃ للعالمین کے یہ جامع ومانع معانی کسی نے بیان نہیں کیے۔

(ابوالکلام آزاد ص ۳۸۴)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری لکھتے ہیں کہ:

''مولانا آزاد نے ''تذکرہ'' میں اور دوسرے مقالات میں سیرت سے اپنی نہایت عقیدت وشیفتگی کا اظہار کیا ہے۔مہر صاحب اس ذوقی عقیدت سیرت میں مولانا کے شریک فکر وعقیدہ ہیں ، اُنہوں نے مولانا کے تمام مقالات سیرت کو مرتب کیا۔اور ایک جامع تالیف کے نقطہ نظر سے جو خلاء نظر آئے انہیں اپنی نگارشات سے پر کر دیا۔ یہ ایک نہایت مسعود اور اہم علمی کام تھا جو اُنہوں نے انجام دیا۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد از مہر ص ۲۴)

مولانا مہر اپنی اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر شیر بہادر پنی کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب محترم!

میری کتاب (رسول رحمت) چھپ گئی ہے۔اس خیال سے بھی کہ مرحوم مولانا آزاد نے سیرت پر جو کچھ تحریر فرمایا تھا وہ مرتب صورت میں محفوظ کر دیا جائے اور اس خیال سے بھی کہ اس عاجز نے سیرت کے ان حصوں پر جو مولانا کی تحریرات میں نہیں آئے تھے۔ جو کچھ لکھا ، وہ ملاحظہ گرامی سے گزر جائے۔ حضور ﷺ کی دعوت عالم انسانیت کے لیے تھی۔لیکن ہمارے سیرت نگار اب تک جو کچھ لکھتے رہے صرف عرب ہی تک محدود رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی یا عالمی نقطہ نگاہ کبھی ان کے سامنے نہ رہا۔پہلی مرتبہ کوشش کی گئی ہے کہ اسلام اپنے اصلی رنگ میں سامنے آئے۔ ساتھ ہی یہ معلوم ہو کہ حضور ﷺ کی ذات بابرکات کے ذریعے سے عالم انسانیت کی کتنی عظیم القدر خدمت انجام پائی جس کی نظیر کسی بھی دور میں پیش نہیں کی جاسکتی۔آٹھ سو صفحے کی کتاب ہے لیکن ہر صفحے پر رحمت کا پہلو نمایاں ہے۔'' (افادات مہر ص ۲۶۱)

انبیائے کرام:

مولانا ابوالکلام آزاد نے انبیائے کرام علیہم السلام کے حالات زندگی اور اُن کی دعوت وتبلیغ

کے سلسلہ میں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں مقالات تحریر فرمائے۔ مولانا مہر نے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' سے یہ تمام مضامین جمع کر کے شائع کر دیے۔ مولانا مہر نے شروع میں ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ اور یہ مقدمہ دو مقالوں پر مشتمل ہے۔ ایک میں سیر انبیاء کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے اور دوسرے میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں مخصوص دعوتوں پر کیوں اکتفا کیا گیا۔

مولانا مہر اپنی اسی کتاب (انبیائے کرام) کے بارے میں ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''انبیائے کرام پر خود بھی لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اوائل سال کی بیماریوں نے مجھ میں سکت نہ چھوڑی۔ لہٰذا صرف مولانا کے مقالات مرتب کر کے پریس کے حوالے کر دیے۔ وہ بڑے بیش قیمت ہیں۔ دراصل مولانا کا کوئی کام ایسا نہ تھا جو زیادہ سے زیادہ نفع بخش اور ایمان افروز نہ ہو۔ لیکن ''الہلال'' و ''البلاغ'' عوام کی دسترس سے باہر ہو گئے۔ اور ان کے افادات سے قوم کے لیے محرومی کا دور شروع ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ مختلف چیزیں مرتب کر دوں تاکہ محفوظ ہو جائیں لیکن اب عمر زیادہ محنت کے لیے مساعد نہیں۔''

(افادات مہر ص ۲۵۳)

مولانا مہر مولانا آزاد کی وفات پر ''رسول رحمت'' کے آغاز میں لکھتے ہیں کہ:

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور ۲۱، فروری ۱۹۵۸ء کو یکا یک بیمار ہوئے۔ ابتدائی خبروں سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ بیماری خطرناک ہے۔ میں دہلی پہنچنے کے متعلق سوچ رہا تھا کہ ۲۲، فروری کو یہ الم انگیز اطلاع مل گئی کہ مولانا اس عالم میں پہنچ گئے ہیں جہاں موت کے دروازے سے گزرے بغیر رسائی ممکن نہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ یوں وہ رشتہ عقیدت و نیاز جو کالج کی تعلیم کے زمانے میں استوار ہوا تھا مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا چالیس سال کے بعد دنیوی زندگی کی حد تک اختتام کو پہنچ گیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ عالم بقا میں ربط و تعلق کی شکل کیا ہو گی اور تعلق بھی پیدا ہو سکے گا یا نہیں؛ مولانا کا دامن حیات علم و عمل دونوں کے رنگا

رنگ جواہر پاروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس ایک زندگی میں کئی زندگیوں کی گرمجوشیوں اور ہنگامہ آفرینیوں کی بجلیاں کارفرما تھیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ کے فضل لایزال سے جو بلند مقام عطا ہوگا۔ وہاں تک مجھ عاصی پُر معاصی کا پہنچنا کیوں کر ممکن ہوگا جس کے پاس نہ علم کا کوئی قابل ذکر سرمایہ فراہم ہوسکا اور نہ عمل کی ایسی کوئی متاع میسر آسکی جسے قابل توجہ سمجھا جاسکے۔

مولانا مہر کے مقالات:

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی اور ان کی علمی دینی، قومی وملی اور سیاسی خدمات اور دوسرے مختلف پہلوؤں پر مولانا مہر نے سب سے زیادہ مقالات ومضامین تحریر کیے۔ مولانا مہر کے مقالات اپنے مطالب کی اہمیت کے لحاظ سے پوری پوری کتابوں پر حاوی ہیں۔ ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی لکھتے ہیں:

> ''مہر صاحب نے مولانا آزاد پر بہت کچھ لکھا ہے جس سے مولانا کے متعلق مہر صاحب کے جذبات عقیدت ومودت کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور مولانا کی زندگی اور کردار کے بعض گوشوں پر ایسی روشنی بھی پڑتی ہے جو بہت کم لوگوں کی تحریروں سے پڑسکتی تھی۔''

(نقوش ابوالکلام ص ۳۸)

مولانا ابوالکلام آزاد پر مہر صاحب کے جن مقالات کی تفصیل معلوم ہوسکی ہے وہ درج ذیل ہے:

1	ابوالکلام آزاد	دائرۃ المعارف اسلامیہ
2	مولانا آزاد کا حسب ونسب	چٹان لاہور ۲۸، مارچ ۱۹۵۴ء
3	مولانا ابوالکلام	نقوش لاہور (شخصیات نمبر)
4	مردِ حق	لیل ونہار لاہور ۲۲، مارچ ۱۹۵۸ء
5	مولانا آزاد (ایک نادر روزگار شخصیت)	آج کل دہلی (آزاد نمبر) اگست ۱۹۵۸ء
6	ابوالکلام آزاد کے بارے میں	آج کل دہلی نومبر ۱۹۶۰ء

7	مولانا ابوالکلام آزاد (ایک بے مثال شخصیت)	بیس بڑے مسلمان
8	شخصیت کی چند جھلکیاں	جامعہ دہلی آزاد نمبر مارچ ۱۹۶۳ء
9	مولانا غلام رسول مہر کا وضاحتی خط	چٹان لاہور ۴، جون ۱۹۶۲ء
10	مولانا آزاد کی آپ بیتی	لیل ونہار لاہور ۱۹، اپریل ۱۹۵۹ء
11	مولانا آزاد اور آزادی ہند کی کہانی (1)	صبح دہلی جنوری فروری ۱۹۶۷ء
12	مولانا آزاد اور آزادی ہند کی کہانی (۲)	صبح دہلی، مارچ ۱۹۶۷ء
13	مولانا آزاد کا تصور حدیث	الرحیم حیدرآباد، مارچ ۱۹۶۷ء
14	مولانا ابوالکلام آزاد اور اسلام	چٹان لاہور ۱۳، مئی ۱۹۶۳ء
15	اسلامی انقلاب برپا کرنے والے کردار کے آئینے میں	چٹان لاہور، جولائی ۱۹۶۳ء
16	زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم	الجمعیۃ دہلی ۴ دسمبر ۱۹۵۸ء
17	ترجمان القرآن ، فضائل و محاسن (ص ۴۴۷ تا ۵۲۰)	ابوالکلام آزاد مرتبہ افضل حق قرشی

ملک نصر اللہ خاں عزیز:

ملک نصر اللہ خاں عزیز نامور صحافی اور بلند پایہ شاعر تھے۔ عصری تعلیم بی اے تھی۔ ان کا ابتدا ہی سے رجحان صحافت کی طرف تھا۔ چنانچہ آپ نے ۱۹۲۸ء میں اپنی صحافت کا آغاز ''مدینہ بجنور'' سے کیا۔ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کی تحریک نمک سازی کی تائید میں اخبار ''مدینہ'' میں مضامین شائع کیے جو حکومت وقت کے نزدیک قابل اعتراض ٹھہرے۔ اور ملک صاحب پر مقدمہ چلایا گیا اور ایک سال کی قید سنائی گئی۔ اور جیل بھیج دیے گئے۔ ۱۹۳۶ء میں اخبار ''مدینہ'' سے علیحدگی اختیار کر کے لاہور آگئے تو مولانا ظفر علی خاں نے انہیں ''زمیندار'' کے ادارہ تحریر میں شامل کر لیا۔ لیکن ''زمیندار'' میں ایک سال رہ کر علیحدہ ہو گئے اور اپنا ذاتی ہفتہ وار اخبار ''پاسبان'' جاری کیا۔ لیکن مالی مشکلات آڑے آئیں اور

اخبار بند کر دیا۔ اس کے بعد ہفت روزہ ''زمزم'' کی ادارت سنبھالی اور دو سال تک آپ اس کے مدیر رہے۔ پھر اس کے بعد ہفت روزہ ''مسلمان'' اور کوثر جاری کیے لیکن کوئی پرچہ بھی زیادہ دیر تک چل نہ سکا۔

ملک صاحب نے زندگی کا طویل عرصہ کانگرس میں گزارا۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ اور مولانا کے گونڈہ جیل میں ساتھی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے اور جماعت اسلامی کے اخبار روزنامہ ''تسنیم'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ۱۹۵۵ء تک آپ اخبار تسنیم کے ایڈیٹر رہے۔

ملک نصر اللہ خاں عزیز بڑے اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہوئے۔ ایک کا نام ''تیر ونشتر'' تھا۔ اور دوسرے کا ''کاروانِ شوق''۔

مولانا آزاد کے بہت مداح اور عقیدت مند تھے۔ ان کی ایک نظم ہے ''امام الہند'' جس میں آپ نے مولانا سے اپنی عقیدت اور اُن کی خدمات جلیلہ کا اعتراف کیا ہے۔ نظم ملاحظہ فرمائیں:

اے امام محترم! اے رہبرِ عالی مقام
علم وتدبیر و سیاست ہیں تیرے دَر کے غلام
تیری تحریر و خطابت نازشِ اسلام ہے
تیرا ہر ایک لفظ گویا پارۂ الہام ہے
عزم تیرا کوہ پیکر ، حزم تیرا بے مثال
صدق تیرا بے عدیل اور عدل تیرا لازوال
تجھ پہ کھولے حق نے راز و معنی ام الکتاب
فیض ہے روح القدس کا جس سے تو ہے فیض یاب
تو علم بردار ہے اسلام کی توحید کا
تو امیں ہے اس صدی میں رتبۂ تجدید کا
تجھ سے زندہ ہیں مسلمانوں کی روایاتِ کہن

مستقیم و مخلص و بے خوف ہمدردِ وطن
تجھ سے قائم ہے وطن میں آبرو اسلام کی
تو لگاتا ہے لگن دل میں خدا کے نام کی
کوئی لالچ ہو تو اس لالچ میں آسکتا نہیں
آسمان بھی رفعتوں کو تیری پاسکتا نہیں
قلب مسلم میں جو نور حریت ہے موجزن
تیرے ہی قول و عمل کی شمع ہے وہ کرن
بے نیاز شہرت و عزت غنی مال و جاہ
اللہ اللہ کتنی اونچی ہے تیرے دل کی نگاہ
عزم و ہمت سے اگرچہ دل تیرا آسودہ ہے
فکر خدمت سے مگر تیری جبیں آلودہ ہے
استقامت میں نہ کوئی لا سکا تیری نظیر
وہ الہ آباد کا برنا ہویا وردھا کا پیر
کانگرس کو فخر تیری فہم کا ، اخلاص کا
رہنمائے محترم ہے عام کا ، خاص کا
غیر مسلم کو بھی تیرے عدل پر ہے اعتبار
ہے بھرم اسلام کا تیرے سبب سے برقرار
آہ وہ پنجاب جو مظلوم ہے مقہور ہے
جس میں باطل مقتدر ہے اور حق مجبور ہے
پانچ دریاؤں سے ریگستان تک سیراب ہے
کشت حریت مگر ویران ہے بے آب ہے
اس کے ایوانوں میں انسانوں کے بکتے ہیں ضمیر
کھول کر بیٹھے ہیں دکانیں شہ و میر و وزیر

جھوٹ کے صدقے میں ہوتے ہیں سروں کے سر بلند
اہل حق کے واسطے پاداش حق ہے قید و بند
فرقہ پرور اس طرح پھرتے ہیں اس میں آشکار
جس طرح تاریک جنگلی میں درندے نابکار
اس متاع ظلم کو شعلہ نوائی چاہیے
خطہ پنجاب کو بھی رہنمائی چاہیے
پھونک دے خاشاک ظلم و جبر کو تدبیر سے
آگ سی ہر سو لگا دے شعلہ تقریر سے
قافلہ ستا رہا ہے پھر اسے ہشیار کر
سو رہی ہے ملک کی تقدیر اسے بیدار کر
نام ہے آزاد تیرا ہند بھی آزاد ہو
یہ غلام آباد بھی آزاد ہو دِل شاد ہو

شورش کاشمیری رحمہ اللہ:

آغا شورش کاشمیری مرحوم بلند پایہ خطیب ومقرر، صحافی، قادر الکلام شاعر، ادیب اور مصنف تھے اور برصغیر کی تحریک آزادی میں ان کی خدمات قدر کے قابل ہیں۔

آغا شورش کا شمار مولانا آزاد کے عقیدت مندوں میں ہوتا ہے۔ آغا صاحب مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، علامہ اقبال، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا سید محمد داوٗد غزنوی سے بہت زیادہ متاثر تھے۔

مولانا آزاد سے ان کا ابتدائی تعارف شخصی نہیں تھا بلکہ کتابی تھا۔ اُنہوں نے مولانا کا عدالتی بیان ''قول فیصل'' پڑھا جس سے ان کے خیالات میں کافی تبدیلی آگئی اور اس کے بعد ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کا مطالعہ کیا تو ان کی دنیا بدل گئی اور وہ مولانا کے معتقد ہی نہیں شیدائی ہوتے چلے گئے۔

شورش کاشمیری پر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ دین اسلام سے برگشتہ نظر آنے لگے۔تو اس وقت علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب ''خطبات مدراس'' ان کے مطالعہ میں آئی۔تو شورش صاحب سنبھل گئے ۔ اور اس کے بعد آغا صاحب نے مولانا کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' کا مطالعہ کیا۔تو ایک طرف مولانا کے بہت زیادہ معتقد ہو گئے ۔اور دوسری طرف ان کا ذہن بالکل صاف ہو گیا۔

شورش کاشمیری کی فکر، ان کا قلم، ان کی شاعری، ان کی نثر، ان کی خطابت اور ان کی صحافت پر بھی مولانا ابوالکلام آزاد کے گہرے اثرات موجود ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ شورش کاشمیری اور مولانا آزاد کا تعلق قریب قریب ہر شعبہ زندگی میں مولانا آزاد سے مماثلت رکھتا ہے۔دونوں صحافی بھی تھے اور ادیب بھی، شاعر بھی تھے اور خطیب بھی، انشا پرداز بھی تھے اور نثر نگار بھی تھے ۔ نقاد بھی تھے اور مبصر بھی اور اس کے ساتھ سیاستدان بھی تھے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شورش صاحب عالم دین نہ تھے ۔ اور مولانا علوم اسلامیہ کا بحر زخار تھے۔ شورش کاشمیری میدان صحافت میں مولانا ابوالکلام کے وارث تھے۔

شورش کاشمیری سیاسی تحریکوں کے روح رواں تھے اور مولانا سیاسی تحریکوں کے مرتب، شورش کاروان سیاست کے حدی خواں اور مولانا کو میدان سیاست میں جرنیل کی حیثیت حاصل تھی ۔مولانا آزاد کی شخصیت تحمل، وقار، حلم اور استقامت کی آئینہ دار تھی جبکہ شورش صاحب کی شخصیت جذبات، شوخی اور ہنگامہ آرائی سے عبارت تھی ۔مولانا خاموش طبع تھے اور اس کے برعکس شورش حریف کے مدمقابل آنے پر اور زبان وقلم کے جوابی حملے سے اسے چاروں شانے چت گرانے کے عادی تھے۔

آغا شورش کاشیری جذباتی حد تک مولانا ابوالکلام کے مداح اور عقیدت مند تھے۔ جس کسی نے بھی مولانا آزاد پر تنقید کی یا ان کی مخالفت میں کوئی مضمون یا بیان جاری کیا شورش صاحب اس کا جواب دلائل سے دیتے تھے ۔ اور مولانا کا پورا دفاع کرتے تھے۔ ایک زمانہ میں پاکستان کے کچھ بریلوی مسلک کے علماء نے صاحبزادہ فیض الحسن کو ''ابوالکلام'' لکھنا شروع کر دیا۔شورش کاشمیری نے ان علماء کو متنبہ کیا کہ برصغیر پاک وہند

میں صرف ایک ''ابوالکلام'' پیدا ہوا ہے اور قیامت تک کوئی دوسرا ابوالکلام پیدا نہیں ہوگا۔ اس لیے اس حرکت سے باز آجاؤ اور صاجزادہ صاحب کو ''ابوالکلام'' کے لقب سے پکارا نہ جائے۔ لیکن بریلوی علماء کب باز آنے والے تھے۔ چنانچہ شورش صاحب نے اپنے رسالہ چٹان کے پہلے صفحہ پر صاجزادہ فیض الحسن کی تصویر شائع کی۔ اور اس کے نیچے یہ شعر لکھا:

اک وہ ابو الکلام تھا، اک یہ ابو الکلام ہے
وہ شاہسوار علم تھا، یہ خدنگ بدلگام ہے

اس کے بعد بریلوی علماء کو سانپ سونگھ گیا اور اُنہوں نے چپ سادھ لی۔ شورش صاحب مولانا کے بارے میں اپنی کتاب ''ابوالکلام آزاد'' میں لکھتے ہیں کہ:

''مولانا ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، علماء میں امام الہند، ادیبوں میں یگانہ روزگار، شاعروں میں نباض شخص، مدیروں میں سرخیل، مفکروں میں عبقری، راہنماؤں میں سب سے آگے اور سیاستدانوں میں منفرد، دوسری کوئی اتنی جامع شخصیت نہ تھی۔ بڑے بڑے انسان تھے۔ اور سب اپنے اپنے فن و فضا میں سربرآوردہ تھے۔ لیکن بیک وقت کسی شخصیت میں اتنی خوبیاں جمع نہ ہوئیں تھیں۔'' (ابوالکلام آزاد ص ۹۷)

شورش کاشمیری نے اپنے اشعار میں مولانا کی عظمت اور ان کے فکر و تدبر کی تعریف کی ہے اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

میں چمن میں یادگار ابوالکلام ہوں
بندگان سیم و زر مجھ کو جھکا سکتے نہیں

ملے ہیں اس کی بدولت معارف اسلام
کہاں تھے فکر و نظر ابو الکلام سے پہلے

اس ایک دور کی شمشیر بے نیام کے ساتھ
رہی ہے مجھ کو نسبت ابوالکلام کے ساتھ

دیا ہے فکر رسا ''الہلال'' نے مجھ کو
چلا ہوں اس کی روش پر اس اہتمام کے ساتھ
ہر ایک سانس میں تکبیر ذوالجلال کی
ہر ایک گام کی رفتار اختتام کے ساتھ
عشق میں رومی، فکر میں رازی، عزم کا منبع جہد کا حاصل
حسن عمل کا گوہر یکتا علم و نظر کا جلوہ کامل
اس کی روش سے گردش دوراں اپنے کیے پر آپ پشیماں
اس کی صدا سے سربگریباں شورش گیتی لشکر باطل
اس کے ادب میں بانگ رجز ہے بانگ رجز میں جوش جنوں ہے
جوش جنوں میں سوزِ دروں ہے سوز دروں میں جذب ہے شامل

شورش، کاشمیری مولانا کے جنازہ میں شریک ہوئے تھے۔ اور اُن کے مزار پر حاضر ہوئے تو ایک مرثیہ نما نظم کہی جس کے دو بند بطور نمونہ پیش خدمت ہیں:

کئی دماغوں کا ایک انساں میں سوچتا ہوں کہاں گیا ہے
قلم کی عظمت اُجڑ گئی ہے زباں سے زور بیاں گیا ہے
اُتر گئے منزلوں کے چہرے امیر کیا کارواں گیا ہے
مگر تیری مرگ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے
یہ کون اُٹھا کہ دیر و کعبہ شکستہ دل خستہ گام پہنچے
جھکا کے اپنے دلوں کے پرچم خواص پہنچے عوام پہنچے
تیری لحد پر خدا کی رحمت تیری لحد کو سلام پہنچے
مگر تیری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

کتابیات

۱	امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد	ابوعلی اثری اعظمی
۲	ابوالکلام آزاد (ادبی و شخصی مطالبہ)	افضل حق قرشی
۳	آثار ابوالکلام آزاد	قاضی عبدالغفار
۴	امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد	امداد صابری
۵	ابوالکلام آزاد	شورش کاشمیری
۶	افاداتِ آزاد	ابوسلمان شاہجہان پوری
۷	اعلام الموقعین (اُردو) ابن قیم	مترجم: محمد بن ابراہیم جوناگڑھی
۸	ابوالکلام آزاد (شخصیت، سیاست، پیغام)	رشیدالدین خاں
۹	آثار و نقوش	ابوسلمان شاہجہان پوری
۱۰	اُردو کا ادیب اعظم	عبدالماجد دریابادی
۱۱	آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی بہ روایت ملیح آبادی	ابوالکلام آزاد
۱۲	انبیائے کرام	ابوالکلام آزاد
۱۳	اقبال نامہ	شیخ عطاء اللہ
۱۴	اقبال کے ممدوح علماء	افضل حق قرشی
۱۵	افاداتِ مہر	شیر بہادر خاں پنی
۱۶	باقیات ترجمان القرآن	غلام رسول مہر
۱۷	باقیات ترجمان القرآن	سید اصغر بخاری
۱۸	بزم ارجمنداں	محمد اسحاق بھٹی

۱۹	بانگ درا	علامہ اقبال
۲۰	پس دیوار زنداں	شورش کاشمیری
۲۱	تبرکات آزاد	غلام رسول مہر
۲۲	ترجمان القرآن	ابوالکلام آزاد
۲۳	تفسیر سراج المنیر	محمد داؤد راغب رحمانی
۲۴	تذکرہ	ابوالکلام آزاد
۲۵	تراجم علمائے حدیث ہند	ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی
۲۶	تذکرہ علمائے اعظم گڑھ	حبیب الرحمٰن قاسمی
۲۷	جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات	محمد مستقیم سلفی بنارسی
۲۸	چودھویں صدی کے علمائے برصغیر	انوار الحق قاسمی
۲۹	چند رجال اہلحدیث	ابوعلی اثری اعظمی
۳۰	حیات عبدالحی	ابوالحسن علی ندوی
۳۱	حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندوی
۳۲	حیات شبلی	سید سلیمان ندوی
۳۳	خطبات آزاد	ابوالکلام آزاد
۳۴	خطوط ابوالکلام	مالک رام
۳۵	ذکر اقبال	عبدالمجید سالک
۳۶	رسول رحمت (مولانا ابوالکلام آزاد)	غلام رسول مہر
۳۷	سیرت آزاد	عبدالمجید سوہدروی
۳۸	سرگزشت مجاہدین	غلام رسول مہر
۳۹	سیرت محمد علی	رئیس احمد جعفری
۴۰	ظفر علی خاں اور ان کا عہد	عنایت اللہ نسیم سوہدروی

۴۱	ظفر علی خاں	شورش کاشمیری
۴۲	ظفر علی خاں (بحیثیت شاعر و ادیب)	غلام حسین ذوالفقار
۴۳	علامہ سید سلیمان ندوی (شخصیت و ادبی خدمات)	محمد نعیم صدیقی ندوی
۴۴	عظمت رفتہ	ضیاء الدین احمد برنی
۴۵	عبدالماجد دریا بادی (احوال و آثار)	ڈاکٹر تحسین فراقی
۴۶	غبار خاطر	ابوالکلام آزاد
۴۷	قول فیصل	ابوالکلام آزاد
۴۸	قصوری خاندان	محمد اسحاق بھٹی
۴۹	قید فرنگ	حسرت موہانی
۵۰	کچھ ابوالکلام کے بارے میں	مالک رام
۵۱	کاروانِ خیال	ابوالکلام آزاد
۵۲	کتاب الہدیٰ	سیٹھ شریف حسن
۵۳	لسان الصدق	ابوالکلام آزاد
۵۴	مولانا ابوالکلام آزاد (شخصیت اور کارنامے)	خلیق انجم
۵۵	مولانا ابوالکلام آزاد (ایک شخصیت ایک مطالعہ)	ابوسلمان شاہجہان پوری
۵۶	مولانا ابوالکلام آزاد (ایک نادر روزگار شخصیت)	غلام رسول مہر
۵۷	مولانا ابوالکلام آزاد	عابد رضا بیدار
۵۸	مکاتیب ابوالکلام	ابوسلیمان شاہجہان پوری
۵۹	مکاتیب ابوالکلام	مرتبہ: ادبستان لاہور
۶۰	ملفوظات آزاد	ابوسلمان شاہجہان پوری
۶۱	مولانا ابوالکلام آزاد (سیرت، شخصیت اور علمی کارنامے)	سعید احمد اکبر آبادی
۶۲	مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت	اخلاق حسین قاسمی

۶۳	مولانا ابوالکلام آزاد	ضیاء الحسن فاروقی
۶۴	میر کارواں مولانا ابوالکلام آزاد	ریاض الرحمٰن خاں شروانی
۶۵	مولانا ابوالکلام آزاد اور اُن کے چند بزرگ دوست	ابوسلمان شاہ جہان پوری
۶۶	مولانا ابوالکلام آزاد (فکر وفن)	ملک زادہ منظور احمد
۶۷	محشر خیال	سجاد انصاری
۶۸	مولانا ابوالکلام آزاد	عبداللہ بٹ
۶۹	مکاتیب شبلی	سیّد سلیمان ندوی
۷۰	مولانا ظفر علی خاں بحیثیت صحافی	نظیر حسنین زیدی
۷۱	مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی	سیّد ابوبکر غزنوی
۷۲	مولانا ابوالکلام آزاد	ابوسعید بزمی
۷۳	نزہۃ الخواطر جلد ہشتم	حکیم سیّد عبدالحی حسنی
۷۴	نقوش عظمت رفتہ	محمد اسحاق بھٹی
۷۵	نقش آزاد	غلام رسول مہر
۷۶	نوادر ابوالکلام	ظہیر احمد خاں ظہیر
۷۷	نقوش ابوالکلام آزاد	ریاض الرحمٰن خاں شروانی
۷۸	ہماری آزادی	ابوالکلام آزاد
۷۹	یاد رفتگان	سیّد سلیمان ندوی

رسائل

۱	آج کل دہلی آزاد نمبر	اگست ۱۹۵۸ء
۲	الہلال کلکتہ	۱۸ اگست ۱۹۱۲ء، ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء، ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء، ۴ فروری ۱۹۱۴ء، یکم جولائی ۱۹۱۴ء
۳	البلاغ کلکتہ	۱۷۔۴ دسمبر ۱۹۱۵ء

۴	الاعتصام لاہور	۲۵ اگست ۱۹۵۰ء
۵	برہان دہلی	مارچ ۱۹۵۸ء ، مئی ۱۹۶۰ء ، اگست ۱۹۶۰ء ، مارچ ۱۹۶۳ء ، نومبر ۱۹۶۵ء، مارچ ۱۹۷۵ء
۶	جامعہ۔ دہلی	اپریل ۱۹۷۹ء
۷	چٹان لاہور	۳/ مارچ ۱۹۵۸ء
۸	شاہراہِ دہلی	فروری ، مارچ ۱۹۵۸ء
۹	صبح دہلی	جنوری ،فروری ۱۹۶۷ء، مارچ ۱۹۶۷ء
۱۰	صدق جدید لکھنؤ	۲۸ فروری ۱۹۵۸ء، ۲۲ نومبر ۱۹۶۳ء
۱۱	نقوش لاہور	ستمبر ۱۹۶۵ء
۱۲	معارف اعظم گڑھ	اکتوبر ۱۹۳۲ء، اکتوبر ۱۹۴۷ء، جنوری ۱۹۵۴ء، مارچ ۱۹۵۸ء

مصنف کی دیگر تصانیف

مطبوعہ

۱	تذکرہ ابوالوفاء۔ ۱۹۸۴ء
۲	تذکرہ بزرگانِ علوی، سوہدرہ۔ ۱۹۸۷ء، طبع دوم ۲۰۰۳ء
۳	برصغیر پاک و ہند میں علمائے اہلحدیث کی تفسیری خدمات ۱۹۸۸ء، طبع دوم ۲۰۰۰ء
۴	برصغیر پاک و ہند میں علمائے اہل حدیث کی تفسیری و حدیثی خدمات طبع ۱۹۹۰ء
۵	سیرت ائمہ اربعہ۔ ۱۹۹۱ء
۶	مؤلفین صحاح ستہ اور اُن کے علمی کارنامے۔ ۱۹۹۳ء
۷	ادیانِ باطلہ کی تردید میں علمائے اہلحدیث کی علمی خدمات۔ ۱۹۹۸ء
۸	امام ابن تیمیہؒ۔ ۱۹۹۸ء
۹	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ ۱۹۹۹ء، طبع دوم ۲۰۰۱ء
۱۰	تذکرہ محدث روپڑی۔ ۲۰۰۰ء

ہماری دیگر کتب

سیرت رحمت عالم ﷺ	(ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری)
دروسِ سیرت	(ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی)
سیرت رسول ﷺ قرآن کے آئینے میں	(ڈاکٹر عبدالغفور راشد)
حیاتِ سرورِ کائنات	(ملا واحدی دہلوی)
بلغ العلی بکمالہ	(خورشید ناظر)
علوم الحدیث	(ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر)
عورت عہدِ رسالت میں	(عبدالحلیم ابوشقہ)
دنیائے اسلام میں سائنس وطب کا عروج	(ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی)
دخترانِ ہند	(پروفیسر علم الدین سالک)
قائداعظم، مسلم لیگ اور تحریک پاکستان	(محمد حنیف شاہد)
مولانا امین احسن اصلاحی (حیات وافکار)	(ڈاکٹر اختر حسین عزمی)
اقبال دشمنی۔ایک مطالعہ	(ڈاکٹر ایوب صابر)
داستانِ اقبال	(ڈاکٹر صابر کلوروی)
ابن بطوطہ ہوا کرے کوئی!	(ڈاکٹر صہیب حسن)
تاج محل کے دیس میں	(حکیم راحت نسیم سوہدروی)

ہماری دیگر کتابیں

سیرتِ رحمتِ عالم ﷺ	ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری
درُوسِ سیرت	ڈاکٹر سعید رمضان البوطی
حیاتِ سرورِ کائناتؐ	ملا واحدی دہلوی
بلغ العلیٰ بکمالہٖ منظوم سیرت النبیؐ	خورشید ناظر
سیرت رسولؐ قرآن کے آئینے میں	ڈاکٹر عبدالغفور راشد
علوم الحدیث فنی، فکری اور تاریخی مطالعہ	ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر
مولانا امین احسن اصلاحیؒ حیات وافکار	ڈاکٹر اختر حسین عزمی